بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ
لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ
عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار کر دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو، وہ اسی طرح بے ایمانوں پر ان کی کثافت کو مسلّط کر دیتا ہے اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے آیات کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵،۱۲۶)

راہ اسلام

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ: ۲۲۴/اپریل تا اگست ۲۰۱۳ء

خصوصی شمارہ

امام حسینؑ اور انقلاب

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون :- ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس :- ۲۳۳۸۷۵۴۷
http://newdelhi.icro.ir
ichdelhi@gmail.com

D:Rah.Imam Husain,-224,2013.

راہ اسلام

شمارہ: ۲۲۴/اپریل تا اگست ۲۰۱۳ء

چیف ایڈیٹر: علی فولادی

ایڈیٹر: پروفیسر سیّد اختر مہدی رضوی

مشاورین علمی

آقای احمد عالمی معاون رایزنی فرہنگی، حجۃ الاسلام والمسلمین آقای مہدی مہدوی پور

پروفیسر سیّد علی محمد نقوی

تزئین جلد : عائشہ فوزیہ

صفحہ آرائی وکمپوزنگ : قاری محمد یاسین

ناظر چاپ : حارث منصور

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مضمون کیلئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
راہِ اسلام مقالات ومضامین کے انتخاب و اصلاح و ایڈیٹنگ اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے۔
اور اس سلسلے میں ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ آخری ہوگا۔
اشاعت کی غرض سے ارسال شدہ مقالہ کا خوشخط ہونا لازمی ہے۔عبارت کاغذ کے ایک طرف ہی لکھی جائے
اور کاغذ A-4 سائز کا ہوتو بہتر ہے۔
صرف غیر مطبوعہ مقالات ہی ارسال کئے جائیں۔
تحقیقی مقالات کی آمادگی میں جن مآخذ و مدارک کا استعمال کیا گیا ہو۔ان کا ذکر لازمی ہے۔
مقالہ کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی ضرور ارسال کیا جائے۔
راہِ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ واقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے
بشرطیکہ مآخذ کا ذکر کردیا جائے۔

پریس : الفا آرٹ، نویڈا، یو۔پی

راہ امامؑ

فہرست

شمارہ: ۲۲۴/اپریل تا اگست ۲۰۱۳ئ

اداریہ	حجۃ الاسلام والمسلمین مہدی مہدوی پور	۷
ثقافت عزاداری،عوارضات وتحریفات	حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر غلام رضا مہدوی	۱۲
نہضت امام حسینؑ ۔، اہل سنت کی نظر میں	حجۃ الاسلام والمسلمین احمد عالمی	۲۰
سیرت ائمہ اطہار تحفظ عزاداری کی ضمانت	محمد سالار۔تہران۔ایران	۳۰
امام حسینؑ ،حق احتجاج وانقلاب	پروفیسر جعفر رضا بلگرامی	۴۰
انقلاب حسینیؑ،تطہیری واصلاحی عمل	مولانا ناظم خیر آبادی	۵۱
قیام امام حسینؑ سے متعلق چند سوالات اور اس کے جوابات۔۔۔	نعمت اللہ صفری فروشانی	۶۱
جہاد امام حسین علیہ السلام	سید طیب رضا نقوی	۸۲
حسینیؑ انقلاب میں عناصر بیداری۔۔۔۔	پروفیسر سید جعفر رضا	۹۶
کربلا اور اخلاقی اقدار۔۔۔	وسیم حیدر ہاشمی	۱۲۳
کربلا، احتجاج وانقلاب کی لافانی آواز	پروفیسر شاہ محمد وسیم	۱۳۶
اصحاب حسینیؑ کا ثبات قدم	ڈاکٹر ریحان حسن	۱۴۵
حسینیؑ انقلاب کا مقصد، اصلاح امت	حجۃ الاسلام مولانا قربان علی	۱۵۱
کربلا اور اخلاقی اقدار	ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی	۱۶۷
کربلا اور تحفظ اسلام	مختار علی عابدی	۱۹۲
حسینیؑ انقلاب کے اسباب وعوامل	مولانا سید کوثر مجتبیٰ نقوی	۲۰۳
مقصد پیغام کربلا	مولانا سید حمید الحسن زیدی	۲۱۱
کربلا اور اخلاقی اقدار	سید نامدار عباس رضوی	۲۲۷

میدان کربلا کا محرم عشق غیور	ڈاکٹر سید احسن الظفر	۲۳۵
واقعہ کربلا، جوش ملیح آبادی کا معرکتہ الآرا مرثیہ۔۔۔	ڈاکٹر سید حسن عباس	۲۴۱
انسانیت، حسینؑ کی سایۂ عاطفت میں۔۔۔	سید محمود حسن ضیاء بوترابی	۲۴۸
شہریار کی علامتی شاعری میں واقعۂ کربلا	ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق	۲۵۴

اداریہ:

عزاداری حسین مظلوم کی اہمیت وافادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران میں مورخہ ۲۹/اکتوبر ۲۰۱۳ءٔ کو علماء وذاکرین کی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا تاکہ ماہ محرم میں عزاداری کی عظمت کے پیش نظر تبادلہ خیال اور فکری یکسوئی کا اہتمام کیا جاسکے۔ ہندوستان میں مقیم معظم رہبری کے نمائندہ جناب حجۃ الاسلام والمسلمین مہدی مہدوی پور نے معزز علماء ومحترم ذاکرین سے اپنے خطاب کے دوران مختلف مفید وکارآمد باتوں کی طرف اشارہ کیا جس کی افادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اسے فصلنامہ راہ اسلام کے اداریہ کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس خطاب کے علاوہ بعض مقررین کے مقالات بھی اس شمارہ میں شامل ہیں۔(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ وَكَفَى بِاللّٰهِ حَسِيبًا" [1]

ترجمہ: وہ لوگ اللہ کے پیغام کو پہنچاتے ہیں اور دل میں اس کا خوف رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔

اپنی گفتگو کے آغاز میں آج کے اس گرانقدر وعظیم اجتماع میں جس میں، دانشور حضرات، معارف الٰہی کو بیان کرنے والے، مبلغین اور خطباء و ذاکرین موجود ہیں، اپنی بے انتہا مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مجمع جہانی اہلبیت اور اسلامی جمہوریہ ایران کے سفارتخانہ سے وابستہ کلچر ہاؤس کا شکریہ ادا کرتا ہوں نیز مہمانانِ گرامی قدر اور علمائے عالی قدر کی تشریف آوری کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔

آپ مبلغ حضرات کے امور، مقاصد اور حاصلہ نتائج بہت ہی مقدس ہیں۔ظاہر ہے دین کی تبلیغ، حصول روز گار ومعاش کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک شرعی فریضہ اور عبادت ہے یہ انبیاء واولیاء علیہم السلام کا کام رہا ہے، لوگوں کے لئے سب سے پہلے مبلغ انبیاء علیہم السلام ہی رہے ہیں اور آپ حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔

یہ آپ حضرات ہی ہیں جو لوگوں کو ان کے پروردگار، انبیاء، قرآن کے احکام وفرامین اور معاد وقیامت وغیرہ سے روشناس کراتے ہیں، یہ آپ ہی حضرات ہیں جو انہیں اہلبیت علیہم السلام کے فضائل ومناقب اور سیرت سے واقف کراتے ہیں، یہ آپ ہی حضرات ہیں جنہوں نے اہلبیت علیہم السلام کی یاد

اور ان کی مظلومیت کو دلوں سے محونہیں ہونے دیا ہے۔

آپ اپنی مجالس، تقاریراور بیانات، مرثیہ خوانی اور نوحہ وسینہ زنی کے ذریعہ اہلبیت علیہم السلام کی محبت کے جذبہ کو لوگوں کے دلوں میں قائم رکھتے ہیں ، یہی آنسو اور گریہ وبکائ، نوحہ جات ومراثی اور مجالس عزاء ہیں جنہوں نے مذہب اہلبیت علیہم السلام کو باقی رکھا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی النَّاسِ مَنْ یَفِدُ اِلَیْنَا وَیَمْدَحُنَا وَیَرْثِی لَنَا۔''۲۔

یعنی خداوند عالم کا شکر ہے کہ اس نے لوگوں کے درمیان ایسے افراد قرار دیئے ہیں جو ہمارے پاس آتے ہیں اور ہماری مدح وثنا یا نوحہ ومرثیہ خوانی کرتے ہیں۔

آپ جو اہلبیتؑ اور پیغمبر اسلامؐ کی مدحت کرتے ہیں یہ جان لیں کہ پیغمبر اسلامؐ اور اہلبیت علیہم السلام کی سب سے پہلے مدحت سرائی کرنے والا خداوند عالم ہے، اسی لئے پیغمبراسلامؐ نے عرش معلٰی پر مشاہدہ فرمایا کہ وہاں لکھا ہوا تھا:

''اِنَّ الْحُسَیْنَ مِصْبَاحُ الْهُدیٰ وَسَفِیْنَةُ النَّجَاةِ۔'' ۳۔

یعنی بے شک حسینؑ چراغ ہدایت اور کشتیٔ نجات ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ اپنے دین، اپنے اخلاق اور اپنے احکام وفرامین کی تعلیم آپ لوگوں سے لیتے ہیں اس لئے آپ حضرات کی ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔

آپ ایک فکری تحریک کو ایجاد کرسکتے ہیں اور ایک فکری کلچر ترتیب دے سکتے ہیں، آپ حضرات اخلاق اور آداب ورسوم قائم کرسکتے ہیں اور ساتھ ہی لوگوں کے اخلاق اور ان کے طرزعمل اور طریقہ زندگی کو تبدیل کرسکتے ہیں، چنانچہ معاشرے کی اصلاح اور اس کی تعمیر میں آپ کا کردار بہت اہم اور مقدر ساز ہے لہٰذا میں آپ حضرات سے خلاصہ کے طور پر کچھ باتوں پر توجہ اور خیال رکھنے کی گزارش کروں گا:

(۱) خدا کے فضل وکرم سے آج ہندوستان کے شیعہ معاشرے میں ذاکری وخطابت ہر دلعزیز اور عوام پسند ہے اور اس کا اپنا ایک منفرد مقام ومرتبہ ہے۔ اس قوم کے جوان بڑے ہی اہتمام ودلچسپی کے ساتھ اس سلسلہ میں کافی وقت صرف کرتے ہوئے مقررین وذاکرین حضرات کی تقریروں کو بڑے انہاک سے سنتے اور محظوظ ہوتے ہیں اور اس بابت کسی بھی تھکن اور

اکتاہٹ کا احساس نہیں کرتے ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتابوں سے زیادہ لوگوں کے درمیان ذاکری وخطابت اثر رکھتی ہے، چنانچہ اس موقع کا بطرز احسن استفادہ کرتے ہوئے حلال وحرام پر مبنی اسلامی تعلیمات کو بیان کیا جانا چاہئے تاکہ لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہو اور ان کے اخلاق میں تبدیلی آئے۔

(۲) شیعہ ثقافت میں تحریک حسینی اور مظلوم کربلا کی عزاداری کی جڑیں شیعہ ثقافت میں بہت گہری ہیں۔

انقلاب عاشورہ کے دو پہلو ہیں: ایک غم انگیز پہلو جو اہل بیت رسولؐ پر پڑے مصائب سے سے متعلق ہے جن میں سرفہرست امام برحق حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، جو انان بنی ہاشم اور آپؑ کے اصحاب باوفا کی شہادت شامل ہے کہ جن کے سبب بشریت قیامت تک سوگوار وعزادار رہے گی زمانہ قیامت تک ماتم دار رہے گا اور آنسو بہاتا رہے گا۔

انقلاب عاشورا کا دوسرا پہلو ایسی نصیحت وسبق پر مبنی ہے کہ جس سے ہمیں کچھ سیکھنے اور مقصد حسینیؑ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ امام علیہ السلام نے یہ انقلاب کیوں برپا کیا اور اس راہ میں کیوں شہادت سے ہم آغوش ہوئے؟ اور فرمایا کہ ''خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ'' [۴]۔

یعنی میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے نکلا ہوں۔

آپؑ نے دین کی بقاء اور امت کی اصلاح کے لئے انقلاب برپا کیا۔ لہٰذا لوگوں کے لئے عاشور کے سبق اور مقصد کو جو کہ عزت وسربلندی، حریت پسندی ووفاداری اور ایثار وشہادت طلبی کا درس ہے، ہمیں بیان کرنا چاہئے۔

(۳) مراسم عزاداری اور آداب مجلس وعزاء ایسے ہوں جو شیعہ چہرے کو داغدار نہ بنائیں تاہم ہمارے رسوم عزا ایسے ہوں کہ ہم دوسروں کی تکلیف وپریشانی کا سبب نہ بنیں۔ اس سلسلہ میں پڑوسیوں کا خیال رکھا جانا چاہئے، خاص کر یہ کہ آدھی رات تک لاؤڈ سپیکر کی آواز سے دیگر افراد، خاص کر غیر مسلموں کے لئے تکلیف وآزار کے اسباب فراہم نہ کئے جائیں۔

(۴) آج عالم اسلام میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم مسئلہ، اسلامی اخوت واتحاد کی تقویت واستحکام اور اس کی نگہداشت کا ہے۔ آج پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ اسلام دشمن عناصر فتنہ پھیلانے کے درپے ہیں، البتہ یہاں میرا مقصد، وہابیوں کے ساتھ اتحاد نہیں ہے کیونکہ وہی فتنہ وفساد

کے باعث وعامل ہیں،لیکن ہمیں اہل سنت حضرات کی اکثریت کے ساتھ جو کہ ہمارے دینی بھائی ہیں ، کوئی پریشانی نہیں ہے اور دشمن کا منصوبہ یہ ہے کہ لکھنؤ سمیت دیگر شہروں میں شیعہ سنی فساد کروایا جائے ، لہٰذا ہمیں ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے تا کہ دشمن کو کوئی بہانہ یا موقع نہ مل سکے۔

اگر کسی نے عزاداروں پر ایک پتھر پھینک دیا تو ایسا نہ ہو کہ شیعہ حضرات بھی حملہ کر دیں اور دکانوں اور گھروں کو نذر آتش کردیں کیونکہ دشمن تو چاہتے ہی ہیں کہ موقع سے فائدہ اٹھائیں اس کے بعد وہ جوابی کاروائی کرتے ہوئے شیعوں کے سیکڑوں گھروں کو آگ کے حوالے کردیں، اس سلسلے میں رہبران قوم کو ہوشیار رہنے اور لوگوں کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ انتہا پسند وہابی گروہ دنیا میں کیا کررہے ہیں، شام وعراق اور پاکستان وغیرہ میں وہ کیا کارنامے انجام دے رہے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ شیعہ حضرات اس طرح کی تشدد آمیز کاروائیوں اور جھگڑوں میں کبھی نہ ملوث رہے ہیں اور نہ ہی کبھی اس طرح کے کام انجام دیں گے۔

(۵) ایک اور موضوع خود شیعہ عوام اور علماء کا آپسی اختلاف سے دوری اختیار کرنے ہے، میں نے اس سے پہلے عرض کیا تھا کہ رہبر انقلاب اسلامی (حفظہ اللہ) کی نظر میں شیعہ علماء کے درمیان اتحاد ایک اہم ضرورت اور حتمی فریضہ ہے۔ اگر کوئی عالم یا مبلغ منبر پر عوام الناس کے درمیان اعلانیہ طور پر کسی دوسرے شیعہ عالم دین کی برائی کرے اور اس کی عزت پر کیچڑ اچھالے تو یہ کام شرعی طور پر حرام ہے، اگر کوئی اختلاف پایا جاتا ہے تو خصوصی نشست میں اس پر گفتگو ہونی چاہئے ، کیونکہ اگر ایک عالم کسی دوسرے عالم کے خلاف اور وہ دوسرا عالم بھی اس کے خلاف بذریعہ تقریر برائی کرے گا تو لوگ مولویت وروحانیت اور علماء سے بدظن ہوجائیں گے اوران سے دور ہوجائیں گے ، علاوہ ازیں ہمارے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے پھریں اور آپس میں برائی بیان کریں، بلکہ ہمیں ایک دوسرے کا حامی و مددگار ہونا چاہئے۔

(۶) جوان نسل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، آج ان کے ذہنوں میں بہت سارے سوالات اور مطالبات ہیں ، ان کے افکار ، بزرگوں اور سن رسیدہ (پرانے خیالات والے)افراد سے مختلف ہیں، ممکن ہے کہ ان کے ذہن میں شبہات موجزن ہوں لہٰذا تقاریر کے علاوہ ان کے لئے

درس کا اہتمام ہونا چاہئے۔ یہ کام دینی مکاتب ومدارس کے ذریعے بہتر طور پر انجام پاسکتا ہے اور اس کی اہمیت وضرورت کو شہری اور دیہی علاقوں میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ اصل دینی شناخت انہیں مکتبوں اور مدرسوں کے ذریعے ہی انجام پاتی ہے۔

(۷) دور دراز کے عقب ماندہ علاقوں میں تبلیغ کے مسئلہ کو بھی بھلانا نہیں چاہئے، کیونکہ ایسے سیکڑوں دیہی علاقے موجود ہیں کہ جن کے عوام میں مبلغ کو بلانے کی استطاعت نہیں پائی جاتی ہے اس لئے مبلغین کرام انہیں سہارا دیں،وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں ایتام آل محمدؐ میں شمار کیاجاناہیے۔ آپ کے کام (تبلیغ دین) کی برکت ان عقب ماندہ علاقوں میں تبلیغ کرنے میں مضمر ہے اور انشاء اللہ سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی نظرعنایت آپ حضرات کے شامل حال ہوگی۔

میں اپنے بیان کے اختتام پر بھی آپ سبھی حضرات کا شکریہ ادا کرتاہوں اور دعا کا طالب ہوں۔

مہدی مہدوی پور
۲۳/ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ

حوالے:

۱۔سورۂ احزاب، آیت ۳۹
۲۔وسائل الشیعہ، ج ۱۴،ص ۵۹۹
۳۔عیون اخبار الرضاؑ،ج ۲ ،ص ۶۲
۴۔مقتل خوارزمی، ج ۱،ص ۱۸۸

ثقافت عزاداری ،عوارضات وتحریفات

حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر غلام رضا مہدوی

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیعی تہذیب و ثقافت کے نقطہ نظر سے محرم، تحریک عاشورہ اور قیام امام حسینؑ کا تشیع کی شناخت سے ایک اٹوٹ تعلق ہے اور امام حسینؑ کی تحریک کو سمجھے بغیر تشیع کو نہیں سمجھا جاسکتا اور تاریخ تشیع کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے۔ امام خمینیؒ اسلام کی شناخت کو ماہ محرم و تحریک امام حسینؑ سے مرتبط جانتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ماہ محرم وصفر کی وجہ سے اسلام زندہ ہے۔ (صحیفہ نور، ج ۱۰)

یہاں پر ہم اہمیت عزاداری کے سلسلے میں امام خمینیؒ کے بیانات کو صحیفہ نور کی دسویں جلد سے پیش کرتے ہیں:

اسلام کو امام حسینؑ نے زندہ رکھا ہے۔ آنحضرت نے اپنا سب کچھ، اپنے جوانوں ... اپنے اصحاب کو، اللہ تعالی کی راہ میں اور اسلام کی تقویت کے لئے قربان کردیا۔ آپ نے اپنے مختصر اصحاب کے ساتھ ظالم حکومت کے خلاف قیام کیا اور شہید ہوکر سب پر غلبہ پالیا۔ ہم آپ کے پیروکار ہیں اور امام جعفر صادقؑ اور دیگر ائمہؑ کی تاکید اور حکم سے مجالس عزا برپا کرتے ہیں۔ ہمارے خطبا و ذاکرین نے تحریک کربلا کو زندہ رکھا ہے۔ شہید پر گریہ کرنا تحریک کو زندہ رکھنا ہے۔ روایت میں ہے کہ جو امام حسینؑ پر روئے یا رلائے یا رونے والے کی صورت بنائے اس پر جنت واجب ہے اور یہ بلاوجہ نہیں ہے بلکہ اس سے امامؑ کی تحریک کی حفاظت ہوتی ہے۔ ہماری قوم کو ان مجالس نے [illegible]ظ رکھا ہے۔ دشمن نے مختلف قوموں کے حالات کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جب تک شیعہ قوم میں یہ مجلسیں برپا ہوتی رہیں گی ظالم کے خلاف آواز اٹھتی رہے گی اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اب کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مجلسیں برپا نہ کرو، یہ لوگ نہیں جانتے کہ مجلس کیا چیز ہے، یہ لوگ مجلس کی عظمت وافادیت سے بےخبر ہیں، یہ لوگ نہیں جانتے کہ امام مظلومؑ پر گریہ وزاری کرنا اس مفہوم کو زندہ رکھنا ہے کہ مختصر سے افراد نے ایک بڑی سلطنت کے خلاف احتجاج کیا اور پوری طرح کامیاب رہے کیا۔ سب کے لئے ''کل یوم عاشورا و کل ارضٍ کربلا'' ایک حکم ہے کہ ہر روز اور ہر جگہ اس تحریک کو

زندہ رکھنا چاہئے۔حسین مظلوم نے ایک بڑی اور طاقتور حکومت کے خلاف قیام کیااور ظالم کی بیعت سے انکار کیا۔ اس انکار کو ہر جگہ اور ہر روز زندہ رکھناہوگا۔ ہمارے بچے اور جوان یہ نہ سمجھیں کہ ہم رونے والی قوم ہیں بلکہ یہ فکر دوسروں نے ایجاد کی ہے۔ دشمن اسی گریہ سے خائف ہے کیونکہ یہ گریہ مظلوم پر گریہ ہے، ظالم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ یہ جلوس عزا ، یہ عزاداری یہ سب دینی شعائر ہیں۔

امام خمینیؒ کے ان بیانات سے عزاداری کی اہمیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے اور اس شبہ کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے کہ امام خمینیؒ کے نجف سے ایران آنے اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد محرم، عاشورہ اور عزاداری کی اہمیت میں کمی آ گئی ہے اور ان امور کی طرف توجہ نہیں دی جارہی ہے۔

عزاداری امام حسینؑ کے عوارضات

امام حسینؑ کی عزاداری کے عوارضات کے سلسلہ میں کچھ کہنے سے قبل چند اہم نکات کی طرف اشارہ ضروری ہے:

۱۔ اصل عزاداری ایک عقلی مسئلہ ہے اور ہر معاشرہ میں رائج ہے۔
۲۔ اسلام میں اولیاء اللہ نے عزاداری پر تاکید کی ہے۔
۳۔ عزاداری سے انسانی جسم یا روح کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔
۴۔ عزاداری گناہ اور غیر شرعی باتوں کے ہمراہ نہ ہو۔
۵۔ عزاداری سے اسلام کی خفت وخواری نہیں ہونی چاہئے۔
۶۔ عزاداری میں واقعات اسی طرح بیان کئے جائیں جس طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں۔
۷۔ عزاداری کے ذریعہ امام حسینؑ کی تحریک کی تبلیغ ہونی چاہئے۔

عوارضات عزاداری امام حسینؑ کے وجوہات

۱۔واقعہ کربلا کے اصلی مآخذ اور منابع سے دوری اور غیر معتبر منابع پر بھروسہ کرنا:

زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم واقعہ کربلا کے اصلی مآخذ سے دور ہوتے گئے یہاں تک کہ ائمہؑ کے دور کی عزاداری اور بعد کے دور خاص کر گذشتہ پانچ صدیوں میں ہونے والی عزاداری میں واضح فرق محسوس ہونے لگا۔

۲۔ **عوام کے جذبات اور عقیدہ کا استحصال کرنا:** یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ہمیشہ اہم امور میں تحریف کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے عزاداری امام حسینؑ میں جس کی طرف شیعہ وغیر شیعہ دونوں توجہ دیتے ہیں،تحریف کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

۳۔معاشرہ میں شیعوں کا اقلیت میں ہونا بھی عزاداری میں تحریف کا ایک اہم سبب ہے۔

علم سماجیات کے نقطہ نظر سے ہر وہ تحریک جو معاشرہ کی اقلیت سے وابستہ ہو، اپنی شناخت قائم رکھنے میں اور فروغ کے لئے اکثریت میں رہنے والوں سے زیادہ کوشش کرے گی اور اپنی تحریک کے بعض نظریات کو بڑھا چڑھا کر پیش کریگی ۔مثال کے طور پر ایرانی، افغانی، پاکستانی اور ہندوستانی معاشرہ کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ان چاروں ممالک میں عزاداری امام حسینؑ کے مختلف انداز ملتے ہیں اور ایران میں ہونے والی عزاداری، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں مروجہ عزاداری سے مختلف ہے؟ اس کی دلیل یہی ہے کہ ایران میں شیعہ اکثریت میں ہے اور باقی ممالک میں اقلیت میں۔

۴۔شیعہ سنی فرقوں کا باہمی رقیبانہ رویہ بھی عزاداری میں تحریف کا سبب بنتا ہے۔

مرحوم کاشف الغطا، سید شرف الدین جبل عاملی، مرحوم آیت اللہ بروجردی، مرحوم شیخ شلتوت ، امام خمینیؒ اور آیت اللہ خامنہ ای کی تقریب بین مذاہب جیسی کوششوں کے باوجود، یہ مسئلہ اب بھی اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچانے والا اہم عنصر ہے۔

۵۔بدعتوں کی روک تھام کے سلسلہ میں ذمہ دار حضرات کی بے توجہی بھی عزاداری کو نقصان پہنچاتی ہے۔

کچھ لوگ تصور کرتے ہیں کہ اگر لوگ دینی مسائل میں افراط سے کام لیں گے تو انہیں زیادہ ثواب ملے گا لیکن وہ لوگ اس امر سے غافل ہیں کہ اس طرح کے تسامح سے دین میں تحریف کے راستے ہموار ہوجائیں گے۔

۶۔ **اسلام مخالف طاقتوں نے بھی عزاداری کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔**

جیسا کہ امام خمینیؒ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے ، دشمنان اسلام دو طریقے سے عزاداری

کو اپنی سازشوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ لوگ اصل عزاداری کو نشانہ بناتے ہیں اور اپنے پروپگنڈوں کے ذریعہ اسے بے اثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عزاداری کو نقصان پہنچانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دشمن مسلمانوں میں نفوذ کرکے یہ کوشش کرتا ہے کہ عزاداری و مجالس میں ایسے عناصر کا اضافہ کردے جس سے ہم اصل مقصد عزاداری سے دور ہوجائیں۔

۷۔عقلانیت سے دوری اور جذبات کی پیروی بھی عزاداری و مجالس کو نقصان پہنچانے والا عنصر ہے۔

عزاداری کے بعض عوارض پر ایک نظر

۱۔امام حسینؑ کی تحریک کے اہداف و مقاصد کو نظر انداز کرنا اور ان مسائل پر زور دینا جو تحریک عاشورہ میں زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے: امامؑ نے اپنے قیام کے اہداف و مقاصد کو اس طرح بیان فرمایاہے: **انّی لم اخرج اشرا ولابطرا ولا ظالماولامفسداولکن خرجت لان آمر بالمعروف وانھی عن المنکر واسیر بسیرۃ جدی وابی.** امامؑ کی تحریک کا اصل مقصد امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مجالس میں عام طور پر نہ صرف اس مقصد کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات نماز جیسے اہم واجبات کے سلسلے میں غلط باتیں بیان کی جاتی ہیں، محرم کی چندروزہ مجالس میں شرکت کو گناہوں کے معاف کئے جانے کے لئے کافی سمجھا جاتاہے، نماز نہیں پڑھتے اور اس کی توجیہ میں یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مجالس عزاداری میں شرکت کرلی ہے۔

ہم سبھی جانتے ہیں امامؑ نے بنی امیہ کے ظلم کے خلاف قیام کیا تھا۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مجلسوں میں اس مقصد کو بیان نہیں کیا جاتاہے بلکہ کچھ لوگ امام خمینیؒ جیسے مصلح پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے محرم و عاشورہ کو سیاسی رنگ دے دیا ہے۔کیا محرم و عاشورہ سیاسی نہیں ہے؟ مدینہ سے کربلا تک امام حسینؑ کے اقوال، سیاست اسلامی کا مظہر نہیں تھے؟ کیا یہ درست ہے کہ ہم اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے اور چند مریدوں کی خوشی کی خاطر دنیا ان چیزوں سے دل لگائے رہیں۔

۲۔مجالس عزاداری کے معیار بیانات کا تنزل و انحطاط

اگر بہت دور نہ جاتے ہوئے گذشتہ دہائیوں میں منعقد ہونے والی مجالس پر نظر ڈالیں تو ہم

دیکھیں گے کہ علماء و مجتہدین مجالس کو خطاب کرتے نظر آتے ہیں؛ صاحب مجالس چہاردہ گانہ شیخ جعفر شوشتری جیسے علماہمیں نظر آئیں گے جن کی مجالس میں شریک ہوکر لوگ نہ صرف گریہ کرتے تھے بلکہ حقیقی اسلامی تعلیمات سے بھی آشنا ہوتے تھے۔ البتہ آج پرنظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ مجالس کا کیا عالم ہے؛ اکثراً وہ لوگ خطیب مشہور ہیں جوعلم و استعداد کے لحاظ سے نہایت کمزور ہیں؛ انکی شخصیت سے کہیں علم دین نہیں جھلکتا اورحتی وہ عوام بھی جومجالس میں شریک ہوتے ہیں ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو یا توحسب عادت مجلس میں تشریف لاتے ہیں یا محض ثواب انکا مقصد ہوتا ہے؛ ظاہر ہے اسکا یہی ہے کہ اب مجالس سے علمی بیانات مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ صورت حال کسی ایک ملک سے مخصوص نہیں ہے بلکہ آج یہ عارضہ اکثر شیعہ معاشرہ کوخواہ وہ ایران ہو یا افغانستان، پاکستان ، ہندوستان اور عراق ہو،لاحق ہو چکا ہے۔

۳۔مراسم عزاداری ومجالس عزاء پر دیگر مذاہب کے اثرات

اس میں شک نہیں کہ آداب سوگواری کے بعض نمونے ، ہمارے مبانی دین سے ہماہنگ نہیں ہیں بلکہ دیگر ادیان کی اقدار کی آمیزش کا نتیجہ ہیں؛ بہ طور مثال یہاں مختلف قسم کے آلات موسیقی کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو مراسم عزاداری میں استعمال میں آتے ہیں اسکے علاوہ بعض ایسی چیزوں کا استعمال جوصلیبی شباہت کے حامل ہیں یا نوحوں وغیرہ میں اس قسم کی آوازوں کا استعمال جو مطرب ہیں یا حتی بعض مقامات پرمجلس شام غریباں کو پارٹی کے طرز پر منعقد کیا جانا جس میں مرد وعورت کا اختلاط نظر آتا ہے جو بہرحال دنیا کا عام چلن بن چکا ہے۔ دیگر ادیان کی مراسم عزاپرتاثیرگزاریوں کا کم از کم نقصان یہ ہوا کہ محرم وعاشورہ کی معنویت پرغیر اسلامی اقدار کے سائے منڈلانے لگے و اس کی روحانیت پرمنفی اثرات مرتب ہونے لگے۔

۴۔عزاداری کے وہ طریقے جودشمنوں کے ذریعے کیے جانے والے اسلام وتشیع مخالف پروپیگنڈوں کےتئیں مددگارثابت ہوتے ہیں۔

آج کی دنیا میں ہرآن تغیرات دکھائی دیتے رہتے ہیں،ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں نہ وقت ہمارے ہاتھ میں ہے نہ جگہ؛ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت دنیا کے کسی گوشہ میں کہیں کے بھی حالات پرنظر رکھ سکتا ہے، ان حالات دنیا میں ہر ایک کی ہر ایک پرنظر ہے، دنیا ہمارے آداب

و رسوم پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس پر اظہار خیال کرتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم اپنی بعض ایسی فعالیتوں کی منفی تاثیر گزاریوں سے جو بظاہر مذہبی ہیں درحالانکہ نہ اسکا وجوب ثابت ہے نہ استحباب، کیسے بچ سکتے ہیں۔ کیا ایسے چھوٹے بچوں کو خون آلود کرنا جنہیں خود اس عمل پر اختیار نہیں ہے معاشرہ کے دین مخالف دھڑے حتی بعض مسلمان طبقہ کے احساسات کو مہمیز کرنے کا باعث نہیں ہوگا؟ اور پھر اسے بہ نام امام حسین کیا جانا و اور انکی مقدس تحریک سے جوڑنا تبلیغ دین ہے؟ یادرہے امام حسین نے اپنی شہادت سے قبل اپنے اہل خانوادہ سے فرمایا تھا:''میرے بعد ہرگز ایسا کوئی اقدام نہ کرنا جس سے لوگ ہمیں ذلیل و رسوامشہور کریں''۔ہمیں اسیری و ذلت میں فرق جاننا چاہیئے،ممکن ہے کوئی اسیر ہومگر یہ ضروری نہیں کہ رسوائی بھی اسکا مقدر ہو لہٰذا ہر وہ قدم جو دین کیلئے باعث توہین ہو خواہ وہ کسی بھی مقصد کے تحت ہو اسلامی رو سے درست نہیں ہے۔

۵۔ذاکری ونوحہ خوانی کو اسلامی تعلیمات اور حسینی حقائق کے بیان پر ترجیح دینا

اس سے انکار نہیں ہے کہ آداب ورسوم عزاداری کیلئے بالخصوص امام صادق کی اس تاکید کے پیش نظر جو آپ نے معروف شاعرکمیت اسدی سے فرمائی تھی ،شعر،نوحہ ومرثیہ خوانی کو جملہ مراسم عزا میں خصوصی مقام حاصل ہے اور روایتیں اس کی تائید بھی کرتی ہیں تاہم مجالس عزاداری میں اس کا پایا جانا بالکل درست ہے مگر اس سلسلے میں افراط سے بچنا ہوگا، چونکہ اس سے نقصانات ہو سکتے ہیں جس میں سب سے اہم بات نوحوں کا مجلسوں کی جگہ لے لینا ہے، جسکے نتیجہ میں و معارف دین جو ممبروں سے بیان ہونا چاہیئے نہیں ہوسکیں گے۔ ایسی صورت میں وہ جو مجلس سے حاصل ہونا چاہئے وہ حاصل نہیں ہوگا۔

۶۔عوام میں مقبولیت کیلئے اسرائیلیات وعدم واقعیات کا پڑھا جانا۔

مجالس کو لاحق عوارضات میں ایک یہ عارضہ جس کی طرف کم توجہ ہے حتی اس عارضہ کے تحت مجالس میں گریہ کیلئے کذب وافترا تک کا سہارا لے لیا جاتا ہے اور واقعات کربلا و ما بعد عاشورہ سے متعلق ایسے مطالب کا ذکر کیا جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ مستند نہیں ہیں بلکہ خرافات و اسرائیلیات ہیں جسے شاید جاہل و غافل قسم کے لوگوں نے مجالس کے بیان کا جز قرار دے دیا ہے اور دشمنان اسلام نے تحریک عاشورہ کی منزلت کو کم کرنے کیلئے اسے کتابوں میں جگہ دے دی ہے۔ حالانکہ

ارشاد شیخ مفید، لہوف سید ابن طاوس اور مقتل ابومخنف کی صورت میں معتبر مآخذ موجود ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر ذاکرین ان اصل منابع کی طرف رجوع کرنے کی زحمت نہیں کرتے اور بہت ممکن ہے اپنے کمزور بیانات کی بنا پر جوانوں کے دین بیزاری کا سبب بنتے ہوں۔

امید کرتا ہوں خطبائ، ذاکرین و واعظین اس بات پر توجہ رکھیں گے کہ عزاداری سیدالشہداء عظیم عبادت ہے اور ہمیں اس عظیم عبادت الٰہیہ کو گناہوں اور غیر واقعی مسئلوں سے آلودہ اور اس کی روحانیت میں کمی نہیں آنے دینا چاہئے۔

منابع و تعلیقات:

۱۔ صحیفۂ نور، ج ۱۰، ۱، ۱۳۵۸

۲۔ راقم الحروف کم وبیش ۱۷ سال کی عمر سے منبر پر جا رہا ہے، مجھے محرم وصفر کے علاوہ بھی مجلسیں خطاب کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ مجھے دعای ''**اللّٰھم احینی حیات محمد وآلہ وامتنی ممات محمد والہ صلواتک علیھم اجمعین**'' بہت پسند ہے۔

۳۔ تحف العقول عن آل الرسول، ص ۱۷۴

۴۔ مقالہ کو طولانی ہونے سے بچانے کے لئے بعض چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور محترم قارئین کو شہید مطہری کی اہم کتاب حماسہ حسینی کے مطالعہ کی دعوت دی جاتی ہے۔

۵۔ نیوز ویب سائٹ، تحلیل فردا، بہ نقل از جام جم آن لائن، ۱۳۹۱/۶/۸

۶۔ ابن اسحاق نقل کرتے ہیں کہ جب رسول خدا جنگ احد سے واپسی میں، عبد الاشہل نامی شخص (جو انصار میں سے تھا) کے گھر کے قریب پہونچے تو آپ نے دیکھا کہ اس قبیلہ کی عورتیں جنگ احد کے شہداء کو رو رہی تھیں، حضور نے ان کے نالہ وشیون کو سنا اور ان کی آنکھیں بھی اشکبار ہوگئیں اور آپ نے فرمایا: کوئی ہے جو میرے چچا حمزہ کے لئے گریہ کرے'' سعد بن معاذ اور اسید بن حصیر اپنے گھروں کو گئے اور انہوں نے اپنی عورتوں سے پیغمبر کے اس کرب کو نقل کیا، چنانچہ ان کی عورتوں نے رسولؐ کے چچا حضرت حمزہ پر گریہ کیا۔ قال **ابن اسحاق و مر رسول اللّٰہؐ بدار من دور الانصار من بنی عبد الاشھل و ظفر، فسمع البکاء والنوائح علی قتلاھم فذرفت عینا رسول اللّٰہ فبکی ثم قال: لکھن حمزۃ لا بواکی لہ'' فلما رجع سعد بن معاذ و اسید بن خصیر الی دار بنی عبد الاشھل امر انسائھم ان یتحزمن ثم یذھبن فیبکین علی عم رسول اللّٰہؐ**، سیرہ ابن ہشام، ج ۳، ص ۹۱

اس کے علاوہ پیغمبر خداؐ، خلیفہ دوم کے ہمراہ کسی کے تشیع جنازہ میں تشریف لے گئے ، وہاں کسی عورت نے رونا شروع کردیا، عمر ابن خطاب نے اسے رونے سے منع کیا تو حضورؐ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو چونکہ یہ غمزدہ ہے ، تازہ غم رسیدہ ہے یہ اپنے عزیز سے جدا ہوئی ہے۔ **ان ابنی کان فی جنازہ فرای عمر امراۃ فصاح بھا، فقال النبی دلھا یا عمر فان العین دامعہ و انفس مصابہ و العھد القریب؛** (سنن ابن ماجہ؛ ج ۳، ص ۲۶۰، ۱۵۸۷

۷۔ رسول اکرمؐ نے اپنے بیٹے ابراہیم پر گریہ فرمایا، ابوبکر یا عمر میں کسی نے سوال کیا: آپ نے خود ہی صبر کا حکم دیا ہے پھر آپ کیوں ابراہیم پر رو رہے ہیں؟، حضورؐ نے فرمایا: آنکھیں اشکبار ہیں، دل رنجیدہ ہے مگر میں ایسی بات زباں پر نہیں لاسکتا جو غضب خدا کا باعث ہے، **کماتوفی ابن رسول اللہ ابراھیم، بکی رسول اللہ فقال لہ المعری اما ابوبکر و اما عمر انت احق من عظم اللہ حقہ، فقال رسول اللہ ترمع العین ویحزن القلب ولدیقول مایسخط الرب** (سنن ابن ماجہ)

۸۔ فلسفہ، عزاداری، محمد رضا کاشفی مرکز فرہنگی نہاد، ایڈیشن ۱، ۱۳۸۱، ص ۲۱، فرہنگ جامع سخنان امام حسین، ص ۴۵۵

۹۔ ایضاً

۱۰۔ لؤلؤ ومرجان، محمد محدث نوری، ص ۱۲۰

۱۱۔ مقتل الحسین، ص ۱۵۶

۱۲۔ المیز ان، ج ۵، ص ۱۰۲

۱۳۔ فرہنگ جامع سخنان امام حسین، ص ۴۷۵

]ــ[

نہضت امام حسینؑ ۔ اہل سنت کی نظر میں

حجۃ الاسلام والمسلمین احمد عالمی

تحریک عاشورہ کو اس کی وسیع اور ہمہ گیر جہتوں کے پیش نظر، تاریخ کے ایک ایسے تاثیر گزار ترین اور یادگار ترین سانحہ کی حیثیت حاصل ہے جو ملتوں اور فرقوں سے ماوراء سب کو متاثر کرتا نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ دینی، مذہبی و ملکی اور جغرافیائی حد بندیوں سے پرے جا کر دنیا بھر کے دانشوروں، علماء وسیاست دانوں کوبھی اپنی طرف جذب کرتا نظر آتا ہے۔ بعض نظریات کی رو سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ واقعہ کربلا کبھی بھی محض شیعہ معاشرہ تک محدود ومختص نہیں رہا۔اس واقعیت کے مدنظر کہ واقعہ کربلا کے اثرات صرف اسلامی سماج تک محدود نہیں ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عاشورہ اور شہادت سرکار سید الشہداءؑ کی اہمیت کو بین المذاہب گفتگو کی بنیاد اور معیار قرار دیا جانا چاہئے۔ اسے اہل تسنن اور اہل تشیع کے مابین مذاکرہ کی محوری حیثیت کا حامل ہونا چاہئے چونکہ برادران اہل تسنن کے حدیثی ، تاریخی ، روایتی ودرایتی مآخذ ومنابع بالخصوص صحیح بخاری میں جسے اہل تسنن کے یہاں غیر معمولی اعتبار حاصل ہے ، ایسی بے شمار احادیث وروایات موجود ہیں جوحضور اکرمؐ کی رو سے امام حسین کی شخصیت کی عظمت ومنزلت کی نشاندہی کرتی ہیں، علاوہ ازیں دیگر کتابوں میں بھی احادیث موجود ہیں جو برادران اسلامی کے مابین مذاکرہ کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔سر دست ہم نے یہ کوشش کی ہے امام حسین کی شخصیت اور آپ کے فضائل ومناقب کو اہل تسنن کے نقطہ نظر سے بیان کریں نیز آپ کی تحریک کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے برادران اسلام کے یہاں عزاداری کی روایت کا تذکرہ کریں ۔

امام حسینؑ ۔ اہل سنت کے معتبر حوالہ جات میں

(الف) امام حسین کے تئیں پیغمبرؐ کا والہانہ لگاؤ

۱۔ اہل سنت کے بزرگ عالم دین ،مؤلف تفسیر کشاف، علامہ زمخشری اپنی کتاب'' ربیع الابرار'' میں نقل کرتے ہیں :

حضرت فاطمہ (س) اپنے دونوں بیٹوں امام حسن اور امام حسین کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور فرمایا یا رسول اللہؐ ان بچوں کوکوئی تحفہ دیجئے؛ حضور نے فرمایا: تمہارا باپ تم پر قربان جائے، میرے پاس مال دنیا سے کچھ نہیں ہے جو میں ان بچوں کو ہدیہ کرسکوں، اس کے بعد آپ نے امام حسن کو اپنے سینے سے لگایا، بوسہ دیا اور اپنے داہنے زانو پر بٹھایا اور پھر فرمایا: میں اپنے اس نواسے کو اپنی ہیبت اور اخلاق ہدیہ کرتا ہوں اور پھر امام حسین کو سینے سے لگایا، بوسہ دیا اور بائیں زانو پر بٹھایا اور فرمایا: میں نے اپنی شجاعت کو اسے بخشا۔ ا؎

۲۔ ابوہریرہ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ رسولؐ خدا نے امام حسینؑ کو سینے سے لگایا اور پھر فرمایا: اے پروردگار! میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں توبھی اسے عزیز رکھ۔ ۲؎

۳۔قاضی نور اللہ شوشتری نے اپنی کتاب ''احقاق الاحق'' میں لکھا: ابو المویدموفق بن احمد نے ''مقتل الحسین''میں مختلف راویوں سے اور انہوں نے ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: حسن وحسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔ ۳؎

۴۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے''حلیۃ الاولیا''، ج ۴،ص ۱۳۹ پر نقل کیا ہے کہ مختلف سلسلۂ روایت کے علاوہ خلیفہ دوم سے روایت ہے پیغمبرؐ نے فرمایا: حسن وحسین، جوانان جنت کے سردار ہیں؛

۵۔احمد بن حنبل نے مسند میں متعدد راویوں سے نقل کیا ہے: رسولؐ حسن وحسین کو اپنے سینے سے لگا کر فرماتے ہیں: خدایا، میں ان دونوں کوعزیز رکھتا ہوں توبھی انہیں عزیز رکھ، تو ان سے محبت فرما: ۴؎

(ب) کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت اور سرکار رسالت مآبؐ

۶۔ زوجہ رسولؐ عائشہ سے منقول ہے: امام حسینؑ اس وقت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ پر وحی نازل ہورہی تھی، آپ نے خود کوحضور پر گرادیا اور پشت پر سوار ہوگئے، جبرئیل نے پوچھا: یارسولؐ اللہ کیا آپ انہیں عزیز رکھتے ہیں؟ حضور نے فرمایا: میں اپنے فرزند کوکیوں عزیز نہ رکھوں! جبرئیل نے کہا: آپ کی امت آپ کے بعد انہیں مارڈالے گی۔ جبرئیل نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا اور تھوڑی سی سفید مٹی اٹھا کر پیغمبرؐ کو دی اور کہا: اسی مٹی پر آپ کے نواسہ کوشہید کردیا جائے گا اور اس سرزمین کا ''طف'' ہے جیسے ہی جبرئیل، پیغمبرؐ کے پاس سے تشریف لے گئے، پیغمبر گھر سے باہر نکلے، آپ کے ہاتھ میں وہی مٹی تھی اور گریہ فرماتے جارہے تھے اور فرمایا: عائشہ! جبرئیل نے

مجھے خبر دی ہے کہ میری امت میرے بعد اپنا راستہ کھودے گی اور میرے فرزند حسینؑ کو قتل کردے گی اس کے بعد روتے ہوئے اپنے اصحاب ، جن میں حضرت علیؑ ، ابوبکر ، عمر، حدیفہ، عمار اور ابوذر شامل تھے، کے پاس گئے، انہوں نے عرض کی یارسول اللہ آپ نے کیوں گریہ فرمایا، حضورؐ نے فرمایا:جبرئیل نے مجھے خبر دی ہے کہ میرے فرزند حسینؑ کو میرے بعد سرزمین طف میں شہید کردیا جائے گا اور یہ میرے ہاتھوں میں اسی سرزمین کی مٹی ہے، اسے وہیں دفن بھی کردیا جائے گا۔۵؎

۷۔ ابن کثیر جو مسلک شافعی کے معروف عالم دین ہیں اپنی کتاب ''البدایۃ والنہایۃ'' میں امام حسینؑ کی منزلت سے متعلق تحریر فرماتے ہیں: پیغمبرؐ، امامین حسنین کو انتہائی عزیز رکھتے تھے اور ان سے بے پناہ محبت فرماتے تھے ۔امام حسینؑ ، اصحاب پیغمبرؐ میں بھی شمار ہوتے تھے، آپ رسول کے آخری وقت تک ان کے ساتھ ساتھ تھے، پیغمبر ان سے راضی تھے، باوجود اس کے امام حسینؑ کم سن تھے؛۶؎

۸۔ ابن کثیر لکھتے ہیں: بخاری نے ابونعیم سے نقل کیا ہے کہ میں نے عبد اللہ بن عمر سے سنا، جب وہ کسی آدمی کے اس سوال کا جواب دے رہے تھے کہ محرم میں مکھی مارنا کیسا ہے؟ تو انہوں نے کہا: لوگ مکھی کے مارے جانے کے بارے میں سوال کرتے ہیں جب کہ انہوں نے فرزند رسولؐ کو قتل کردیا ہے (مگر اس کے بارے میں نہیں پوچھتے ہیں) حالانکہ رسولؐ نے امامین حسنینؑ کے بارے میں فرمایا تھا: یہ دونوں دنیا میں میری خوشبو کے پھول ہیں؛۷؎

۹۔ مؤلف الحسین ابو الشہدا، عباس محمود عقاد (مصری کہتے ہیں: شجاعت امام حسینؑ ایسی صفت ہے جو کسی کے لئے باعث حیرت نہیں ہونا چاہئے ، آپ کی ذات والاصفات سے شجاعت کا ظہور ایسے ہی ہے جیسے معدن ومخزن سے سونا نکلنا، امام حسینؑ معدن شجاعت ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے جو انہیں موروثی طور پر ملی تھی اور ان سے انکی اولاد تک منتقل ہوئی البتہ ساری تاریخ بنی آدم میں کوئی شخص کربلا کے ان حالات کے پیش نظر، امام حسینؑ سے زیادہ شجاع نہیں نظر آتا شاید اسی لئے سیکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی وہ سید و سالار شہیدان کے عنوان سے جانے جاتے ہیں؛

(ج)۔تحریک امام حسین ، میزان عدالت میں

۱۔ اشاعرہ کے پیشوا ابو الحسن اشعری(متوفی ۳۲۴ھ) کہتے ہیں: جب یزید کا ظلم حد سے بڑھ گیا تو امام حسینؑ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور کربلا میں

شہید ہوئے ۔۸؎

۱۱۔عراق کے اہل تسنن کے مفتی و مرجع علامہ آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) ''تفسیر روح المعانی'' میں آیۂ'' **فھل عسیتم ان تولیتم ۔۔۔ ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم اولئک الذین لعنھم اللّٰہ**'' کے ذیل میں احمد بن حنبل سے نقل کرتے ہیں ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے بیٹے نے یزید پر لعنت بھیجنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: **کیف لا یلعن من لعنہ اللّٰہ فی کتابہ؛** اس پر کیسے لعنت نہ بھیجی جائے جس پر خدا نے اپنی کتاب میں لعنت بھیجی ہے، احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا: میں نے قرآن پڑھا ہے مگر کہیں یزید پر لعنت نظر نہیں آئی احمد بن حنبل نے اس کے جواب میں آیۂ **فھل عسیتم ۔۔۔** الخ کی تلاوت کی اور کہا! **ای فساد و قطیعۃ اشد مما فعلہ یزید،** کون سا ایسا مفسدہ اور قطع ورحم ہے کہ یزید جس کا مرتکب نہیں ہوا۔

۱۲۔ آلوسی کہتے ہیں: یزید پر لعنت قابل تامّل مسئلہ نہیں ہے کیونکہ وہ گناہان کبیرہ کا مرتکب اور اوصاف خبیثہ کا حامل تھا، اس نے مدینہ والوں پر ظلم وزیادتی کی اور امام حسینؑ کو شہید کیا نیز اہل بیتؑ کی توہین کی۔

۱۳۔ مولوی محمد شہداد حنفی نہضت امام حسینؑ سے متعلق تحریر فرماتے ہیں: امام حسینؑ نے حق کی راہ میں اپنا سر دیدیا مگر باطل کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کیا، باجود اس کے کہ ان کے ساتھیوں کی تعداد، وافر نہ تھی باطل کے مقابل پوری قوت اور استقلال کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور اس کے بعد شہادت عظمٰی پر فائز ہوئے۔

۱۴۔ ابن روز بہان لکھتے ہیں:

امام حسینؑ نے انتہائی مصیبت وکرب کے عالم میں جام شہادت نوش کیا اور کربلا میں دفن ہوگئے۔ تاریخ اسلام میں اس سے زیادہ غم انگیز اور دردناک واقعہ نہیں گزرا؛ خدا کے علم کے برابر لعنت ہو ہر اس شخص پر جو اس جنگ میں امام حسینؑ کے مقابل آیا اور اس جنگ میں شریک اور راضی رہا۔۹؎

۱۵۔ ابن خلدون کہتا ہے:

یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یزید نے امام حسینؑ کو قتل کرنے کے لئے اجتہاد کیا چنانچہ وہ بے گناہ ہے کیونکہ وہ اصحاب جنہوں نے امام حسینؑ کی ان کی تحریک میں ہمراہی نہیں کی، انہوں نے بھی

ان کے قتل کو جائز نہیں قرار دیا۔ یزید نے امام حسینؑ سے جنگ کی، یزید کا یہ عمل اس کے فاسق ہونے کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ امام حسینؑ اپنی شہادت کے سبب عند اللہ ماجور ہیں۔ یزید نے غیر عادلانہ کام کئے چنانچہ امام حسینؑ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔۱۰؎

۱۹۔ ڈاکٹر طہٰ حسین (متوفی ۱۹۷۳ء) کا خیال ہے:

اس بات کے پیش نظر کہ امام حسینؑ، دین کے محافظ اور اس کے سرخیل ہیں ہرگز یزید کی بیعت ان کے لئے قابل قبول امر نہیں تھا چنانچہ آپ نے اپنے مقصد کو بچانے کے لئے ایک جائز اور شرعی راستے کا انتخاب کیا اور مطالبہ بیعت سے دوری اختیار کرتے ہوئے کوفہ کا رخ کیا اور شہادت کو یزید کی بیعت پر ترجیح دی چونکہ یزید کی بیعت اس کے مظالم کی تائید قرار پاتی۔۱۱؎

د: امام حسینؑ، مسلمانوں اور آزادی خواہوں کے لئے نمونہ عمل

ایسے حالات میں جب معاشرہ میں ایک انصاف ورقیادت پائی جائے اور اس کا مقصد شریعت اور قوانین الٰہیہ کا پاس ولحاظ اور اس کا اجرا ہو مگر اس کے مقابل ایک ظالم حکومت آجائے جو دامن عدالت کو تارتار کرنے والی ہو، تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس عادل حکومت کا ساتھ دیں اس کی حمایت کریں۔ امام حسینؑ کا انقلاب اسی زمرہ میں آتا ہے چونکہ آپ ایک ظالم حکومت کے مقابل اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۱۲؎

ہ: عزائے امام حسینؑ سے متعلق اہل تسنن کے اشعار

اہل سنت کے مسالک میں سے ایک مسلک کے پیشوا امام شافعی، اہل بیتؑ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے، انہوں نے عاشورہ سے متعلق بہت اہم اشعار کہے ہیں، ان میں سے بعض کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

''یہ وہ سانحہ ہے جس سے میری نیند اڑ گئی، میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔
میرے دیدہ ودل کو اس نے اپنے گرفت میں لے لیا ہے اور مجھے غمگین کر رہا ہے، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور میری نیند اڑ چکی ہے۔
دنیا، خاندان رسالت میں ہوئے اس سانحہ سے دم بخود ہے، پہاڑ پگھل رہے ہیں۔
کوئی ہے جو میرا پیغام حسینؑ تک پہونچادے باوجود اس کے کہ سب کے دل غمگین ہیں۔
امام حسینؑ بے خطا مارے گئے، ان کا پیراہن ان کے خون سے رنگین کردیا گیا۔

ہم لوگ بڑے عجیب ہیں ایک طرف آل رسولؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور دوسری طرف ان کی اولاد کو قتل کرتے ہیں اور انہیں تکلیف پہونچاتے ہیں۔

اگر اہل بیتؑ سے محبت گناہ ہے تو میں اس گناہ پر ہرگز توبہ نہیں کروں گا۔

اہل بیت رسولؐ روز قیامت میری شفاعت کرنے والے ہوں گے، اگر میں ان کے لئے دل میں حسد رکھوں گا تو میرا یہ گناہ کبھی بخشا نہیں جائیگا‘‘۔ ۱۳؎

۲۰۔علاّمہ اقبال امام حسینؑ اور فلسفہ تحریک عاشورہ سے متعلق فرماتے ہیں!

آن امام عاشقان، پور بتول
سرو آزادی زبستان رسولؐ
اللهؑ اللهؑ بای بسم اللهؑ، پدر
معنی ذبح عظیم، آمد پسر
چون خلافت رشته از قرآن گسیخت
حریت را زهر اندر کام ریخت
خون آن سر، جلوه خیر الامم
چون سحاب قبله باران در قدم
برزمین کربلا بارید ورفت
لاله در ویرانه ها کارید ورفت
تاقیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد
بهر حق در خاک وخون گردیده است
پس بنای ''لااله'' گردیده است
مدعایش سلطنت بودی اگر
خود نکردی با چنین سامان سفر
دشمنان چون ریگ صحرا، لاتعد
دوستان او به یزدان هم عدد

سر ابراهیم واسماعیل بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود
عزم او چون کوهساران استوار
پایدار وتند سیر وکامکار
تیغ بهر عزت دین است وبس
مقصد او حفظ آیین است وبس
خون او تفسیر این اسرار کرد
ملّت خوابیده را بیدار کرد
تیغ "لا" چون از میان برون کشید
از رگ ارباب باطل ، خون کشید
نقش "الا اللّٰہ" بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات مانوشت
رمز قرآن از حسین آموختیم
زآتش او شعله ها افروختیم
شوکت نام و فربغداد رفت
سطوت غرناطه هم از یاد رفت
تار ما از زخمه اش لرزان هنوز
تازه از تکبیر او ایمان هنوز
ای صبا! ای پیک دور افتاد گان !
اشک ما برخاک پاک او رسان

عاشورہ کے روز اہل تسنن کے مراسم عزاداری

سوگواری اور مرثیہ گوئی، صدر اسلام سے رائج رہی ہے، ہر گروہ ہر قبیلہ نے اپنی تہذیب کے مطابق البتہ جہاں تک شریعت نے اجازت دی، مراسم عزا بر پا کی ہیں۔ برادران اہل سنت نے

نہ صرف یہ کہ اہل بیت رسولؐ کے لئے مرثیے کہے ہیں بلکہ عاشورہ کی مناسبت سے مجالس سوگواری اور بزم غم کا انعقاد کیا ہے۔

عبد الجلیل رازی نے اپنی اہم تالیف کتاب ''النقض''(اشاعت ۵۶۰ھ) میں ایسے افراد کا تذکرہ کیا ہے جو اہل تسنن کے معروف واعظ تھے انہوں نے شہدائے کربلا کے لئے مجالس برپا کیں، ان پر روئے۔ ان کے رشحات قلم سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ معدودے چند متعصب قسم کے افراد کے علاوہ، رسولؐ وآل رسولؐ پر ہوئے ظلم پر سارے مسلمان بلا تفریق مذہب وملت ومسلک، غم مناتے ہیں اور اس رنج کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

اس زمانے میں اس قسم کی سرگزشت کی تاریخ نگاری کو مقتل نویسی کہتے ہیں جس میں ان مصائب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اہل بیت رسولؐ پر پڑے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری میں ''مقتل الحسین'' نامی ایک اہم کتاب اس موضوع پر لکھی گئی جس کے مؤلف خوارزمی ہیں۔ انہوں نے ایسے موضوعات جس کا تعلق، فضائل ومصائب امام حسینؑ سے ہے، اس کتاب میں جمع کیا ہے۔

عبد الجلیل رازی لکھتے ہیں:

> ''شیعہ ہی اس نالہ وشیون سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام ان شہروں میں جہاں جناب شافعی یا ابوحنیفہ کے ماننے والے ہیں جن میں چند علامحمد منصور، امیر عبادی، خواجہ علی غزنوی، صدر خجندی، ابومنصور ماشادہ، مجد ہمدانی، خواجہ شیخ بوالفضائل مشاط، خواجہ ابوالمعالی جو بنی مزاری کے نام معروف ہیں، نے بھی موسم عزا میں عاشورہ کی مناسبت سے مجالس گریہ وزاری منعقد کی ہیں اور شہدائے کربلا کو روئے ہیں اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔''

ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں: سب واقف ہیں کہ طرفین کے معتبر ائمہ اور اصحاب ابوحنیفہ اور امام شافعی نیز اس سے قبل کے دیگر علماء نے اس روایت کی رعایت کی ہے اور شہدائے کربلا کے لئے مرثیہ کہے ہیں اور امام حسین کی شہادت پر حکم خداوندی (**قل لا أسئلکم علیه أجراً الاّ المودّة فی القُربیٰ** اور حدیث رسول **من یکیٰ علی الحسین او ابکیٰ او تباکی وجبت له الجنّه**) کے مطابق اظہار تعزیت کیا ہے تاکہ اس ذکر کو سنانے اور سننے والا رحمات الٰہی کا مورد قرار پائے۔ النقض، عبد الجلیل رازی، ص ۲۷۳۔۲۷۳) اس کے علاوہ امام رضی بخاری فرماتے ہیں: اے دوستو! کربلا کی

خاک وہ خاک ہے جس میں شہادتوں کی تخم ریزی ہوتی ہے اسے چاہنے والوں کے آنسوؤں سے آبیاری کی ضرورت ہے پس ہر وہ شخص جس کی آنکھ سے آنسو نکل کے کربلا کی سرزمین شہادت کی آبیاری کا باعث بنے، **الدنیامزرعۃالآخرہ** کے پیش نظر اس کے نتیجہ کو بہشت میں پائے گا چونکہ خود حضورؐ نے **وجبت لہ الجنہ** کہہ کے ضمانت لی ہے۔۱۴؎

مذکورہ بالا اقتباسات اس حقیقت کے عکاس ہیں کہ اہل تسنن ، اہل بیت رسول کے سوگ میں باقاعدہ اظہارغم کرتے ہیں اور عاشورہ کے دن مجالس برپا کرتے ہیں۔

اہل تسنن کی آبادی والے ممالک وعلاقوں میں مراسم عزا کا رواج دیکھا جاسکتا ہے جس میں ہندوستان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔برصغیر میں اکثر اہل تسنن ، محرم وصفر میں مراسم عزاء برپا کرتے ہیں ،اطعام مومنین کرتے ہیں اور یہ بہت قدیمی سلسلہ ہے۔شاہ عبد العزیز دہلوی بھی محرم میں عزاداری کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے فتاویٰ میں یوں تحریر فرمایا ہے:

> ''پورے سال میں دو مجلس حقیر کے گھر منعقد ہوتی ہیں ایک وفات پیغمبرؐ کی مجلس دوسرے شہادت امام حسینؑ کی مجلس ۔تقریباً پانچ سو سے ہزار لوگ آتے ہیں ، ناچیز بھی ہوتا ہے ۔ امام حسینؑ کے وہ فضائل جو احادیث میں بیان ہوئے ہیں اسے بیان کیا جاتا ہے اور آپ کی شہادت سے متعلق روایات ذکر کی جاتی ہیں''۔

علاوہ ازیں ،بعض مراثی جو حضرت امّ سلمہ اور دیگر صحابہ سے منقول ہیں ، سنائے جاتے ہیں۔ اس درمیان اگر کوئی خوش لحن آدمی سلام یا مرثیہ پڑھتا ہے تو اکثر حاضرین مجلس بہ شمول ناچیز کے گریہ کناں ہوجاتے ہیں۔۱۵؎

یہ عبد العزیز دہلوی کے رشحات قلم تھے جو بعض ایسی کتابوں کے مصنف ہیں جنہیں شیعی نقطہ نظر کے خلاف ماناجاتا ہے لیکن وہ بھی امام حسینؑ سے متعلق ان خیالات کا اظہار کررہے ہیں اور عزادری امام حسینؑ کو خود بھی برپا کرتے ہیں ۔

لہٰذا راقم الحروف کی پیشکش یہ ہے کہ خطباء وذاکرین کو چاہئے کہ جس علاقہ میں بھی مجالس خطاب کریں، علماء اہل تسنن کو بھی دعوت دیں تاکہ ہم اپنے ماسلف کی روایات کو زندہ رکھ سکیں اورروز عاشورہ اس عظیم شخصیت کی یاد میں جمع ہوسکیں اور ان کے جد کی عنایات ہم سب کے شامل حال

ہوسکیں۔

حوالے:

۱۔ربیع الابرار،ص ۵۱۳؛نقل از احقاق الحق قاضی نور اللہ شوشتری
۲۔ مستدرک الصحیحین، ج ۳ص ۱۷۷
۳۔ احقاق الحق ، ج ۱۰،ص۷۰۸
۴۔مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۳۲۶
۵۔مجمع الزوائد، ج ۹،ص ۱۸۷
۶۔ البدایۃ والنہایۃ ، ج ۴، جز ۸،ص ۱۴۲
۷۔البدایۃ والنہایۃ ، ج ۴، جز ۸، ۱۹۳
۸۔مقالات الاسلامیین واختلاف المصلحین ،ص ۴۵
۹۔وسیلہ الخادم الی المخدوم،ص ۱۶۱
۱۰۔مقدمہ ابن خلدون ،ص ۴۱۵
۱۱۔علی وفرزندانش ،ترجمہ محمد علی شیرازی ،ص ۴۵۶
۱۲۔تفسیر المنار، ج ۱ ص ۲۶۷
۱۳۔نامہ دانشوران ناصری، ج ۱،ص ۲۹۸
۱۴۔نقل از روضہ الشہداء،ص ۱۲
۱۵۔نقل از انوار الاولیاء فی طریق الاصفیاص ۱۶۸۔نقل ازفتاویٰ عزیزیہ

]ب[

سیرت ائمہ اطہار

تحفظ عزاداری کی ضمانت

محمد سالار۔تہران۔ایران

عاشورکا خونچکاں سانحہ دنیاکے تمام انسانوں، حق پرستوں، انصاف پسندوں، آزادمنشوں اورمکتب اسلام نیز اس کی خونین ثقافت شہادت کے دلدادوں کے لئےعظیم درس ہے۔

عاشورہ کوئی تاریخی پڑاؤ نہیں بلکہ ایک مکمل تاریخ ہے۔کل یوم عاشورہ و کل ارض کربلا ایک ایسا بحر بیکراں ہے جو پوری دنیا کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔تاریخ عاشورہ امام مظلوم اور ان کے بچوں نیز ان کے وفادار ساتھیوں کی قربانیوں کے ساتھ تمام تو ہوگئی لیکن جب بھی جوانمردی، فداکاری، ایثار وشہادت کی گفتگو ہوگی سرفہرست انکا تذکرہ آئے گا۔ہندوستان کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی نے کہاتھا: میں نے امام حسینؑ کی تاریخ زندگی کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور کربلا کو بہت دھیان سے پڑھا ہے اور مجھ پر یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اگر ہندوستان ایک کامیاب ملک بننا چاہتا ہےتوہمیں امام حسینؑ کا اتباع کرنا پڑے گا۔

امام حسینؑ کی عزاداری سےمنسوب یہ زوال ناپذیر ایام،حق وباطل کے درمیان ہمیشہ کے لئے پائے جانے والے حد فاصل کی نشاندہی کرتے ہیں۔حق وباطل کے درمیان ہمیشہ مقابلہ رہا ہے اورآزادی پسند افراد نے ہمیشہ حق کی پاسداری کو اپنا فریضہ سمجھا ہے تاہم حق وباطل کے بارمیان نبرد آمازمائی کے دوران، خاموش بیٹھنے اور الگ تھلگ رہنے کو لادینیت سےتعبیر کیا گیا ہے۔

پس کربلا والوں کی یاد کو زندہ رکھنا اورتمدن عاشورہ کے احیاء کو ائمہ معصومین نے خصوصی اہمیت کا حامل موضوع جانا ہے۔

عباسی دورحکومت کی ظالمانہ دھمکیوں اور سیاسی سازشوں اورموجودہ سامراجی ہتھکنڈوں کے باوجودآزادی وبشریت دوستی کی علمبردارتحریک کربلا آج بھی پوری طرح زندہ اورتابندہ ہے۔

مرحوم شہیدمطہری، ائمہ معصومین کی سیرت میں امام حسین کے مراسم عزاء وسوگواری فرماتے

ہیں:

''ائمہ نے چاہا ہے کہ نہضت حسینی ایک مکتب فکر اور مشعل راہ کی حیثیت سے باقی رہے۔در حقیقت یہ حسینی تحریک حق ،حق پرستی اورحق طلبی کا ایک روشن چراغ ہے۔ یہ ایک حق پسندی، حریت وآزادی اورظلم کے مقابل ہمیشہ باقی رہنے والی آواز ہے۔ ائمہ معصومین کی تاکیدکی روشنی میں اس بات کا سبب بنیں کہ انقلاب حسینی زندہ وجاوید رہے۔ امام حسینؑ کا نام ،ظلم کے خلاف ایک مستقل نظریہ کا حامل ہوگیا۔مفکرین اورشعرا میں سے بعض ایسے نامور افراد ہیں جن میں کیفیت اسدی، دعبل خزاعی وسیدا جمیری کے اسماء قابل ذکر ہیں۔کمیت اسدی ان شعراء میں ہیں جنہوں نے لشکرکشی سے زیادہ ، بنی امیہ کو نقصان پہونچایا ہے۔ا۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پیغامات کربلا کو دنیا میں عام کرنے کی ذمہ داری حضرت زین العابدین اورحضرت زینب کبریٰ نے سنبھالی چنانچہ انہوں نے مختلف موقعوں پر مصائب کربلا اور اہل بیت اطہار پر مصائب کا تذکرہ کرکے عاشورہ کے جانسوز اور روح فرسا واقعات کی یاد کو زندہ رکھا۔

امام سجاد نے بیس سال اپنے بابا کی مظلومیت پر گریہ فرمایا اور جب آپ کے سامنے کھانا یا پانی آتا تھا تو آپ گریہ فرماتے تھے یہاں تک کہ ایک روز آپ کے غلام نے کہا: اب وقت آچکا ہے کہ آپ کاغم برطرف ہوجانا چاہئے ! امام نے فرمایا: وای ہو تجھ پر حضرت یعقوب کے ۱۲ بیٹے تھے۔ خداوند عالم نے ان کے ایک بیٹے کوایک مختصر سی مدت کے لئے ان سے روپوش رکھا، حضرت یعقوب اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں کثرت گریہ سے سفید ہوگئیں نیز وفورغم سے ان کے سر کے بال سفید ہوگئے درحالیکہ ان کے بیٹے حضرت یوسف دنیا میں زندہ وسلامت موجود تھے ! میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے خانوادہ کے بنی ہاشم کے علاوہ اپنے بابا، بھائی اور چچا کوشہید ہوتے ہوئے دیکھا ہے اس طرح سے کہ ان کی لاش زمین کربلا پر پڑی ہوئی تھی۔۲۔

علاوہ ازیں شام میں اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:'' **انا بن من بکت علیه ملائکة السماء انا بن من ناحت علیه الجن فی الارض و الطیر فی الهواء** ۳۔

یعنی میں اس کا بیٹاہوں جس پر فرشتوں نے گریہ کیا، میں اس کا بیٹاہوں جس پر جنوں نے زمین پراور پرندوں نے ہواؤں میں نوحہ کیا۔

ہمارے دینی پیشواؤں کی زندگی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی نظر میں عاشورہ یعنی ۱۰ رمحرم الحرام خصوصی اہمیت کادن ہے، انہوں نے ہمیشہ اس دن کو خاندان رسالت مآب کے لئے حزن وملال کے دن کے طور پر پیش کیا ہے جس کا ایک مقصد اہل بیت رسول کے دشمنوں سے اظہار برأت ہے جو اس دن مسرت وشادمانی کا اظہار کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم زیارت عاشورہ میں پڑھتے ہیں: **وهذايوم فرحت به آل زياد وآل مروان بقتلهم الحسين صلوات الله عليه**، یہی وہ دن ہے جس دن ابن زیاد کے خاندان والوں نے خوشی منائی کیونکہ انہوں نے اس دن امام حسین کو شہید کیا تھا۔

اس کے علاوہ مصائب کربلا، مجاہدتوں وفدکاریوں کی یاد اور اس کا ذکر دلوں میں جوش وولوہ پیدا کرتا ہے اور تقرب الٰہی کا سبب بنتا ہے۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں: **كان ابى اذا دخل شهر المحرم لايرى ضاحكا۔۔۔ فاذا كان العاشر كان ذلك اليوم يوم مصيبته وحزنه وبكائه ويقول:**

''**هو اليوم الذى قتل فيه الحسين**''۴ جیسے ماہ محرم شروع ہوتا تھا، میرے بابا ہنسنا چھوڑ دیتے تھے اور عاشورہ، آتا تھا تو وہ دن ہمارے بابا کے لئے اہم سوگواری کا دن ہوتا تھا، آپ بہت گریہ فرماتے تھے اور کہتے تھے: یہی دن تھا جب امام حسین کو شہید کیا گیا''

اس کے علاوہ ایک اور مقام پر امام رضا نے سوگواری سید الشہداء کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: **من ترك السعى فى حوائجه يوم عاشوراء قضى الله حوائج الدنيا والآخره۔۵ ومن كان يوم عاشوراء يوم مصيبته وحزنه وبكائه، يجعل الله يوم القيامه يوم فرحه وسروره۔۶**

یعنی ہر وہ شخص جو روز عاشورہ کسب معاش یا دنیاوی مصروفیتوں سے خود کو دور رکھے خداوند متعال اس کی تمام حاجات دنیوی واخروی پوری کرے گا اور ہر وہ شخص جو عاشورہ کو روز مصائب شمار کرتے ہوئے گریہ وزاری کرے خداوند اس کو قیامت کے روز مسرور محشور کریگا۔

ائمہ طاہرین مراسم عزا کو برپا کرنے اور امام حسین کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے مختلف طریقہ ہائے عمل اختیار کرتے تھے، ان مجالس کا برپا کرنا اس بات کا باعث ہوا کہ کربلا والوں کا جذبہ ایثار وفداکاری اور ان کی شہادتیں تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہوگئیں اور دنیا بھر کے انسانوں کے لئے نمونۂ عمل قرار پائیں۔ معروف مداح اور شاعر اہل بیتؑ جناب دعبل خزاعی نقل کرتے ہیں کہ ایک

روز اپنے آقا امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ، آپ اپنے چند اصحاب کے ہمراہ رنجیدہ اور غمگین بیٹھے ہی تھے جیسے حضرت نے مجھے دیکھا تو فرمایا مرحبا ! دعبل تم نے زبان وقلم سے ہماری مدد کی۔ حضرت نے مجھے اپنے پہلو میں جگہ عنایت کی اور فرمایا کچھ شعر سناؤ اس لئے کہ یہ دن اہلبیتؑ رسول پرغم کے دن ہیں اور ہمارے دشمنوں بالخصوص بنی امیہ کے لئے خوشی وشادمانی کے دن ہیں۔

اے دعبل ! ہر وہ شخص جو میرے جد حسینؑ کی یاد میں گریہ کرے ، خداوند متعال اس کے گناہوں کو معاف کریگا۔ پھر حضرت نے حکم دیا کہ ہمارے اور اس کے اہل خانہ کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا جائے ،عورتیں اس پردہ کے پیچھے بیٹھ جائیں اور سب مل کر کربلا والوں کو یاد کرکے نالہ وشیون کریں، نیز امام نے مجھے حکم دیا: اے دعبل ! امام حسین کے لئے مرثیہ پڑھواور جب تک تم زندہ ہو ہماری مدد کرو اور جہاں سے ہوسکے اس سے گریز مت کرو، اس وقت مجھ پر گریہ طاری ہوگیا اورمیں نے چند شعر اہل بیتؑ رسالت پر بیتے مصائب اور عاشورہ کی سرگزشت کے بارے میں سنائے۔

دعبل نے اپنے اشعار کو بآواز بلند پڑھا۔ امام رضاؑ کی صدای گریہ بلند ہوگئی یہاں تک کہ یہ شعر پڑھا گیا:

اری فیئهم فی غیر متقسما
و ایدیهم من فیئهم صفرات

میں دیکھ رہاہوں کہ اہل بیت کا اثاثہ تاراج اور ایسے لوگوں میں تقسیم ہوگیا جو نا اہل تھے اور ایسے تھے کہ خود وہ اپنا حق بھی نہیں حاصل کرتے تھے۔

امام رضا اس مقام شدت سے گریہ فرمایا اور کہا: خزاعی تم نے سچ کہا۔

دعبل نے اپنے اشعار جاری رکھے یہاں تک کہ انہوں نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا:

افاطم قومی یابنۂ الخیر
فاندبی نجوم سماوات بارض فلات
قبر بکوفان واخری بطیبه
واخری بفخ نالها صلوات۔۔۔ ۷ ۔

پیغمبرؐ کے خاندان والوں کے سر، بریدہ وخون آلود ہیں اور آل زیاد کے حیوان سکون سے چر

رہے ہیں۔

حرم پیغمبرؐ کی حرمت ضائع ہوئی اور ان کا خاندان قیدی ہے اور آل زیاد اپنے اپنے گھروں میں محوخواب ہیں۔

یہ رنج ومصائب اور درد وفغاں کا لمحہ ہے کہ بنی ہاشم کا خون ناحق بہادیا گیا۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنا حق نہیں لے سکتے۔

اس وقت امام رضاؑ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

دعبل نے پھر یہ شعر پڑھا:

اے اشکبار آنکھیں! ان عزیزوں کے غم میں آنسو بہاؤ اور اب وہ وقت بھی آ گیا کہ اس مصیبت میں سیلاب اشک جاری کیا جائے۔

زندگی بھر دشمنان اہل بیتؑ کے خوف سے مجھے چین نہیں ملا لیکن امید ہے کہ مرنے کے بعد شفاعت اہلبیتؑ کے سہارے عذاب سے امان حاصل ہوجائے گی۔

اس وقت امام رضاؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جزع اکبر (قیامت) سے امان میں رکھے۔

امام رضاؑ نے دعبل کو اس شعر کے عوض اپنا ایک پیراہن عطا فرمایا:

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

میرے والد امام محمد باقرؑ نے مجھ سے فرمایا: **یا جعفر! وقف لی من مالی کذا و کذا، النوا دب تندبنی عشر سنین بمنی ایام منی** ۸؎

اے جعفر! میرے مال کے کچھ حصے کو اس بات کے لئے وقف کردو کہ رونے والے ایام حج میں سرزمین منی پر دس سال تک مجھ پر گریہ وماتم کریں۔

امام حسینؑ پر گریہ ائمہ اطہار کی نظر میں

حسینی تہذیب وثقافت میں گریہ دشمنان عزاداری کے لئے ایک تیز دھار ہتھیار اور سید الشہداءؑ واہل بیت عصمت وطہارت سے قلبی لگاؤ کی دلیل ہے۔ اشک دل کو سیراب کرتا ہے اور انسانی روح کی پیاس کو بجھاتا ہے۔ اسلامی ثقافت میں ہمیشہ ائمہ طاہرینؑ کے ساتھ روحی ومعنوی اعتبار سے ہمدلی و ہمراہی پر تاکید کی گئی ہے: **یفرحون بفرحنا و یحزنون لحزننا** ۹؎ ہمارے شیعہ اور

ہمارے چاہنے والے ہماری خوشی میں خوش اور ہمارے غم میں غمگین ہوتے ہیں۔

شہدائے کربلا کے غم میں معرفت کے ساتھ گریہ کرنا، عاشورہ وتہذیب شہادت کے ساتھ تجدید بیعت اور روحی وفکری تغذیہ کا باعث ہے۔گریہ کرنا ایک طرح سے سید الشہداء سے مودت کے عہد نامہ پر دستخط ہے۔امامؑ نے بھی اس نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

اناقتیل العبرہ لایذکرنی مومن الااستعبر۱۰؎

مجھے رلالاکر مارا گیا، مؤمن جب بھی یادکرے گا اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہوجائے گا۔

اشک امام حسینؑ سے محبت وعشق کا سرچشمہ ہے۔پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

ان القتل الحسین حرارۃفی قلوب المومنین لاتبردابدا۱۱؎

حسین کی شہادت نے مومنوں کے دل میں ایسی حرارت پیدا کردی ہے جو ہرگز ٹھنڈی نہ ہوگی۔

ثقافت عاشورہ میں گریہ کرنا خون شہید کی حفاظت اور اسے زندہ رکھنے کے مترادف ہے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

شہید پر گریہ کرنا،حسینی تحریک کو زندہ رکھنا ہے۔ ۱۲؎ امام حسینؑ پر گریہ کرنااس تحریک کو اور اس مفہوم کو زندہ رکھنا ہے کہ مختصر سے افراد نے ایک بڑی سلطنت کے خلاف قدعلم کیا دشمن اسی گریہ سے خائف ہے کیونکہ یہ گریہ مظلوم پر گریہ ہے ، ظالم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ ہر وہ تحریک جس میں کوئی سروسینہ پیٹنے والا نہ ہو، جس میں کوئی گریہ کرنے والا نہ ہو[illegible]ط نہیں رہتی ہے۔ ۱۳؎

ائمہ معصومینؑ نے اہلبیتؑ کی مظلومیت پر گریہ وزاری اورعزائے امام حسینؑ برپا کرنے کی تاکید کی ہے اور اس کے لئے بہت اجر وثواب ذکر کیا ہے۔امام رضاؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

ان بکیت علی الحسین حتی تصیر وموعک علی خدیک غفر اللّٰہ لک کل ذنب اذنبتہ۱۴؎

اگر حسینؑ پر اس طرح گریہ کرو کہ تمہارے آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب سے جاری ہوجائے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سارے گناہ معاف کردے گا۔

D:Rah.Imam Husain,-224,2013.

پیغمبر اسلامؐ اپنی بیٹی جناب فاطمہ زہرا (س) سے فرماتے ہیں:

یا فاطمہ! کل عین باکیہ یوم القیامہ الاعین بکت علی مصائب الحسین ۱۵؎

اے پارۂ جگر! قیامت کے روز ہر آنکھ گریہ کناں ہوگی سوائے اس آنکھ کے جس نے امام حسینؑ کی مصیبت پر آنسو بہائے ہیں۔

بارہویں امامؑ زیارت ناحیہ مین اپنے جد بزرگوار کی مظلومیت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

لاندبنک صباحاو مساءو لابکین علیک بدل الدموع دما ۱۶؎

میں ہر صبح وشام آپ پر گریہ وزاری کرتا ہوں اور آپ کی مصیبت پر خون کے آنسو بہاتا ہوں۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آل عباؑ کی مظلومیت پر معرفت کے ساتھ گریہ اور ابا عبد اللہ الحسینؑ کی حقانیت کی شناخت کے ذریعہ حسینی تہذیب وثقافت کی ترویج ائمہ معصومینؑ کی سیرت رہی ہے۔

زیارت امام حسینؑ

امام حسینؑ کی زیارت کے سلسلہ میں ائمہ معصومینؑ نے بہت تاکید کی ہے۔ امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں:

لو یعلم الناس مافی زیارۃ قبر الحسین من الفضل لماتو شوقا ۱۷؎

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ قبر امام حسینؑ کی زیارت میں کتنی فضیلت ہے تو وہ اس کے شوق میں مرجاتے امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں:

لاتدع زیارۃ الحسین بن علی یمد اللہ فی عمرک ویزید فی رزقک ویحییک اللہ سعیداًو لاتموت الا شهیداً ۱۸؎

زیارت قبر امام حسینؑ میں کوتاہی نہ کرو، تاکہ خدا تمہاری عمر لمبی اور تمہارے رزق میں اضافہ کرے اورآخرکار باعزت زندگی وشہادت والی موت عطا کرے۔

تربت حسینیؑ

ائمہ معصومینؑ کی جانب سے امام حسینؑ کی تربت کے سلسلہ میں سفارش وتاکید کی گئی ہے جو

اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ عاشورہ کے خونچکاں واقعہ کو زندہ وجاوید رکھنے کے لئے کتنا اہتمام کرتے تھے ۔ تربت حسینی درحقیقت حسینؑ اور اس کے اصحاب باوفا کی بہادری ، ایثار وقربانی اور اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت وخلوص کی علامت ہے جس کی راہ میں انہوں نے اپنی جانیں قربان کیں اور ان کے خون پاک سے خاک کربلا رنگین ہوگئی۔

تربت حسینی کا پاس واحترام درحقیقت شہید کے اعلیٰ رتبہ اور اللہ تعالیٰ کے پاس واحترام کے مترادف ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے انسان کے قلبی لگاؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ ارشادفرماتے ہیں:

الاوان الاجابۃتحت قبتہ والشفاءفی تربتہ۱۹؎

یہ جان لو کہ اجابت دعا حرم حسین کے گنبد کے نیچے اور شفا ان کی تربت میں ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

حنکوا ولادکم بتربۃالحسین فانھاامان۲۰؎

اسلامی تعلیمات اور فقہ شیعی کے مطابق مٹی کھانا حرام ہے سوائے تربت حسینی کے جس میں ہر درد کی دوا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

فی طین قبر الحسین الشفاءمن کل داءوھو الدواءالاکبر

ہر درد کی دوا تربت حسین میں ہے اور یہ سب سے بڑی دوا ہے۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے امام حسینؑ پر گریہ اور عزاداری برپا کرنے پر بہت تاکید کی ہے اور گریہ امام حسینؑ سے قلبی لگاؤ کی علامت ہے ۔ اسی طرح ائمہؑ نے زیارت قبر امام حسینؑ کی بہت تاکید کی ہے اور تربیت حسینی امام حسینؑ اور تہذیب عاشورہ سے تجدید بیعت کے مترادف ہے۔

اس عظیم واقعہ کو رونما ہوئے صدیاں چکی ہیں لیکن یہ تحریک آج بھی زندہ پایندہ ہے ۔ ہم سب کا خاص کر علماء وذاکرین کا یہ فریضہ ہے کہ اس اسلامی انسانی تحریک کے پیغام کو عدالت وآزادی کے خواہاں تمام افراد تک پہچائیں اور عاشورہ کی خونیں تحریک کو دلوں میں زندہ رکھیں۔

اس عظیم رسالت کو انجام دینے کے لئے چند اہم نکات کی طرف توجہ بہت ضروری ہے۔

ا۔تحریک کربلا کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مراسم عزا میں کوئی بھی ایسی بات پیش نہ کی جائے جو حسینی فکر اور منطق دین وفطرت کے خلاف ہو۔امام حسینؑ کے ذاکر کو چاہئے کہ غیر مستند اور بے بنیاد باتوں سے پرہیز کرے۔

۲۔ اسلامی بالخصوص شیعی تہذیب وثقافت کے زندہ باقی رہنے میں کربلا کا بہت اہم کردار رہا ہے۔لہٰذا علمائے دین اور ذاکرین کا یہ فریضہ ہے کہ تحریک کربلا کی تاریخ اور مصائب امام حسینؑ کو مخلصانہ انداز میں اور صحیح طریقہ سے لوگوں تک پہنچائیں ۔ جیسا کہ مقام معظم رہبری ، حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

محترم واعظین وذاکرین اور تمام سوگواران! امام مظلوم کربلا جیسی اس عظیم شخصیت کی الشان ومنزلت کو برقرار رکھیں اور خدانخواستہ بعض غیر معقول امور سے عزاداری کے ضائع ہونے کا سبب نہ بنیں ۔ ۲۱؎

۳۔ امام حسینؑ کے قیام اور کربلا کے عظیم انقلاب کا اصل فلسفہ شعائر اللہ کا احیاء اور ظلم وبے عدالتی کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنا ہے۔ امام حسینؑ نے اسلامی قدروں کے احیاء اختلاف وتفرقہ کی جڑوں کو ختم کرنے اور معاشرہ میں اسلامی اخوت قائم کرنے کی غرض سے قیام کیا تھا۔لہٰذا آج کے دور میں جب دشمنان اسلام مسلمانوں میں اختلاف وتفرقہ پیدا کرنے کے درپے ہیں تو ہمارا فریضہ ہے کہ قرآن وسنت سے تمسک کرتے ہوئے اسلامی وحدت کی حفاظت اور دشمنان اسلام ولباس اسلام پہنے ہوئے کچھ فریب خوردہ افراد کی سازشوں کا شکار نہ ہوں بلکہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

حوالے:

ا۔دہ گفتار،شہید مرتضیٰ مطہری،ص ۲۵۱

۲۔منتہی الامال ، جلد دوم ص ٦ ، امالی شیخ صدوق ص ۱۴۰

۳۔بحارالانوار جلد ۴۵ ص ۱۷۴

۴۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۰ ص ۵۰۵ ، الامالی ،صدوق ص ۱۲۸

۵۔علل الشرائع ص ۲۲۷

٦۔ میزان الحکمہ حدیث ۱۳۰۱۱

۷۔ بحار الانوار جلد ۴۹ ص ۲۴۵
۸۔ بحار الانوار جلد ۴۶ ص ۲۲۰
۹۔ میزان الحکمہ جلد ۵ ص ۲۳۳
۱۰۔ بحار الانوار جلد ۴۴ ص ۲۸۴
۱۱۔ مستدرک الوسائل جلد ۱۰ ص ۳۱۸
۱۲۔ صحیفہ نور جلد ۱۰ ص ۳۱
۱۳۔ صحیفۂ نور جلد ۱۰ ص ۳۱
۱۴۔ صحیفۂ نور جلد ۸ ص ۷۰
۱۵۔ صحیفۂ نور جلد ۴۴ ص ۲۸۴
۱۶۔ بحار الانوار جلد ۴۴ ص ۲۹۳
۱۷۔ بحار الانوار جلد ۱۰۱ ص ۲۳۸
۱۸۔ بحار الانوار جلد ۱۰۱ ص ۱۸
۱۹۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۴۳۱
۲۰۔ مستدرک الوسائل جلد ۱۰ ص ۳۳۵
۲۱۔ وسائل الشیعہ جدل ۱۴ ص ۵۲۴
۲۲۔ کامل الزیارات ص ۴۶۲
۲۳۔ بیانات مقام معظم رہبری مورخ ۱۷/۱۰/۱۳۸۶

امام حسینؑ، حق احتجاج و انقلاب

پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی

انسان کی فطرت شاید باغی واقع ہوئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حیات سے ممات تک سماج فرد کو اطاعت کا سبق سکھاتا رہتا ہے کہ وہ منضبط رہے اسی وجہ سے وہ سماجی ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔ انفرادیت پسندی کو خود رائی کا نام دیا جاتا ہے۔ سماجی ماحول میں ڈھل جانے کو تہذیبی اقدار کا پیرو سمجھا جاتا ہے۔ اسکول میں یہی درس طالب علموں کو دیا جاتا ہے اور جو اس پر پورے اترتے ہیں انہیں کو ہونہار سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ ہر مذہب کی بنیاد انقلاب ہوتا ہے لیکن جب مذہب کی عملی کارکردگی شروع ہوتی ہے تو اسی اطاعت گزاری کو ذریعہ نجات بتایا جاتا ہے۔ ہمارے مذہبی پیشوا کبھی جنت کی لالچ، کبھی دوزخ کا خوف، کبھی بیماری، غربت، جنگ، تشدد اور قحط کو عذاب الٰہی بتا کر انسان کی باغیانہ فطرت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی میدان میں بھی اسی اطاعت کا نعرہ ہر سیاسی پارٹی کے جھنڈے پر آویزاں نظر آتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ برسر اقتدار آنے سے پہلے انفرادی آزادی کی بات کی جاتی ہے، لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد آزادی کا نعرہ ڈسپلن میں بدل جاتا ہے، قواعد وضوابط کی بات کی جانے لگتی ہے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو غدار کہا جاتا ہے۔ سائنس کے میدان میں بھی انسان کو مطیع بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذہنی انتشار کو بغاوت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے اس کو ایک بیماری سمجھ کر اس کا نفسیاتی علاج کیا جاتا ہے۔ دوائیں دی جاتی ہیں تاکہ انسانی ذہن میں انتشار کی جگہ سکون پیدا ہو اور بغاوت کو فروغ نہ مل سکے۔ پھر بھی اگر انسانی ذہن میں باغیانہ انتشار باقی رہتا ہے تو بجلی کا شاک دے کر اس کو پُرسکون بنا دیا جاتا ہے۔

سماج کی ان تمام کوششوں کے باوجود انسان مطیع وفرمانبردارانہ ہو سکا۔ شاید خمیر آدم میں جذبۂ بغاوت کی اہمیت مضمر ہے بے جا نہ ہوگا کہ اگر اس جذبہ کی کرشمہ سازیوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ فرد کا یہی جذبۂ بغاوت ہے جو اس کو سرزمین پر اپنا وجود برقرار رکھنے میں مددگار ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو اس کو بے چین، غیر مطمئن اور تحقیق پسند بناتا ہے۔ یہی جذبۂ بغاوت ہے جس کی وجہ

سے انسان اپنے جسم کی قید میں مقید نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو وسعت دے لی۔ آج اس کی انگلیاں فضا کو ٹٹولتی ہیں، اس کی آنکھیں ذرے کے حجم کو بڑھا کر دیکھتی ہیں، اس کے کان سمندر کے تحت الثریٰ کی سرگوشیاں سن لیتے ہیں۔ اسی جذبۂ بغاوت کی وجہ سے انسان اپنے ذہن کی سرحدوں میں مقید نہ رہ سکا۔ اس نے فطرت کی تسخیر کی، کائنات کی تحقیق کی اور عمل پیدائش کے راز افشا کئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کی حد بندیوں میں بھی نہ رہ سکا۔ وہ موت سے لڑا، اس نے زندگی کی سرحدوں کو بڑھایا۔

ایک طرف سماج کی تمام تر کوششیں کہ فرد مطیع وفرمانبردار بن جائے۔ دوسری طرف فرد کی جدوجہد کہ اس کی باغیانہ صفت بحال رہے۔ ایک طرف سماج کو اندیشہ کہ اگر فرد کی باغیانہ فطرت بحال رہی تو یہ سماجی امن وامان کے لئے خطرہ کا باعث ہوگی اور نظم وضبط درہم وبرہم ہوجائے گا۔ دوسری طرف فرد کو خدشہ کہ اگر سماجی کوششیں کامیاب ہوجائیں اور اس طرح باغیانہ فطرت پر کنٹرول حاصل ہوگیا تو انفرادی آزادی ختم ہوجائے گی، اور فرد سماج کا ایک حقیر ذرہ بن کر رہ جائے گا۔ اس طرح ازل سے سماج کی اطاعت اور فرد کی بغاوت کے درمیان ایک جنگ جاری ہے۔ لیکن انداز جنگ یہ ہے کہ سماج کی کوششیں منظم ومسلسل ہیں جبکہ فرد کی کوششیں کچھ ایسی رہی ہیں، جیسے کہ کبھی کبھی کوئی شعلہ بھڑک جائے۔

سماج کی مسلسل ومتواتر کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ سماج کا تہذیب یافتہ طبقہ بغاوت کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی بن چکا ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک بغاوت ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ یہ ایک غیر تربیت یافتہ گروہ کی تخریبی کاروائی ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک بغاوت اپنی اصل کے اعتبار سے ناجائز اور اپنی صلاحیت کے اعتبار سے مخرب اخلاق ہے۔ لیکن بغاوت کے سلسلے میں یہ غلط فہمی سماج کی پیدا کردہ ہے جس نے کہ بغاوت کا اصل مفہوم ہی مسخ کردیا ہے۔

در اصل کسی مستحکم ومضبوط طاقت پر یہ دباؤ ڈالنا اور یہ باور کرانا بغاوت ہے کہ وہ طاقت اپنے وجود وبقا اور جائز استعمال کے لئے قانون فطرت اور سماجی اقدار کے مطابق رہے۔ کسی طاقت کو قانون فطرت سے ہم آہنگ رہنے پر مجبور کرنا بغاوت ہے اور آج کے انسانی ذہن کا ایک انقلابی وتہذیبی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ سماجی قانون جائز سمجھے جائیں گے جو قانون فطرت کے مطابق ہوں اور اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاکم کو نہیں بلکہ افراد کو حاصل ہے۔ ہر جائز قانون اقتدار

پسند حاکم کی من مانی طبیعت نہیں ہوا کرتا۔ ان کی جڑیں افراد کے ضمیر میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس لئے فرد یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق قوانین کو قانون فطرت کے مطابق پاکر سر تسلیم خم کردے یا ان کو قانون فطرت کے خلاف سمجھ کر بغاوت کردے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی قانون صرف اس وجہ سے جائز نہیں ہوجاتا کہ اس کا مخرج حکمراں ہے بلکہ اس وجہ سے جائز قرار پاتا ہے کہ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تسلیم شدہ قانون جائز ہی ہو کیونکہ قانون کی اطاعت جبر و دباؤ سے بھی تو کرائی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے قانون کے تین مزاج ہوئے۔ ایک قانون ساز کا مزاج جو قوانین وضع کرتا ہے۔ دوسرا حاکم کا مزاج جو آبادی پر قوانین نافذ کرتا ہے اور تیسرا افراد کا اخلاقی مزاج جس کی بنیاد پر وہ قوانین کی اطاعت کو دل سے قبول کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قانون ساز کا وضع کردہ قانون یا حاکم کا عاید کردہ قانون افراد کے اخلاقی مزاج سے ہم آہنگ ہوجائے۔ ہٹلر کے قانون اس وجہ سے قانون تھے کہ اپنے زمانہ میں وہ موثر طور پر آبادی پر عاید کئے گئے تھے۔ لیکن وہ تمام افراد جو آزادانہ طور پر قوانین کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان قوانین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ طاقت چاہے جتنی وسیع و مستحکم کیوں نہ ہو بجائے خود جائز قانون کا جواز نہیں بن سکتی۔ قانون کی سند قبولیت نہ ہو وہ مخرج ہوسکتا ہے جہاں کہ وہ قانون وضع کئے جاتے ہیں اور نہ ہی وہ سیاسی طاقت ہوسکتی ہے جس کے بل بوتے پر قانون آبادی پر نافذ کئے جاتے ہیں بلکہ صرف اخلاقی اقدار ہیں جن کی بنیاد پر قانون جائز قرار پاسکتا ہے۔ ہم قانون کو اپنے ضمیر کی حمایت فراہم کرکے اسکو ''Legal''(قانونی) یعنی جائز و شرعی بناتے ہیں۔ اور یہیں سے فرد کے حق بغاوت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

یوں تو حکمرانوں سے بڑی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور بڑے تکلیف دہ قانون بنتے ہیں جن کو لوگ بغیر کسی بغاوت کے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی فرد واحد یا گروہ پر یہ انکشاف ہوجائے کہ خرابیوں ، ابہام اور چالبازیوں کا ایک سلسلہ لامتناہی ہے جو کہ عمداً اختیار کیا گیا ہے جس سے حکمراں کی بدنیتی کا صاف پتہ چلتا ہے تو وہ فرد یا گروہ خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ انسان کی تہذیبی اقدار کی بقا کے لئے بغاوت کرنا لازمی ہے۔ جن مذہبی اقدار نے انسان کو ایک تہذیبی رشتہ میں منسلک کیا ہے۔ اگر کسی حکمراں کا طرز حکمرانی ان اقدار ہی کو ختم کررہا ہو تو ایسے حکمراں کے خلاف

اعلان بغاوت غداری نہیں، عین تہذیبی حق ہے۔

بغاوت پر کئی طرح سے اعتراض کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض یہ ہے کہ بغاوت امن و امان اور استحکام کو درہم برہم کردیتی ہے اس لئے جو بھی اس کا مرتکب ہوگا، وہ غدار ہوگا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی حکمراں قانون فطرت کو مسخ کررہاہو، سماجی تہذیب کے اقدار کو لوٹ رہا ہوتو کیا ایسے حکمراں کے خلاف بھی اعلان احتجاج بغاوت غداری سمجھی جائے گی؟ اگر یہ غداری ہے تو کسی رہزن و ڈاکو کو کیوں چیلنج کیاجائے کیونکہ اس سے بھی امن وامان کو خطرہ لاحق ہوگا اور بلاوجہ کی خونریزی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ غداری کے الزام سے بچنے کے لئے اورمحض امن وامان ، وہ چاہے جیسا بھی ہو، باقی رکھنے کی خاطر ، اگر ہم خاموشی اختیار کرلیں اور اس طرح اپنے حق احتجاج و بغاوت سے دستبردار ہوجائیں تو پھر ایسے استحکام اور امن وامان کا مقصد ہی کیا رہ جائے گا۔ یہ امن تو ہوگا مگر دراصل تشدد پسندوں اور جارحانہ عمل کے مرتکب لوگوں کےحق میں۔ بغاوت کے سلسلے میں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگرفرد کا حق بغاوت تسلیم کرلیاجائے ،تووہ بغاوت کے نام پر اپنے ہرتشدد کو جائز قرار دے لیگا۔ اور اس طرح گویا اس کوسماج کے امن وامان کے برباد کرنے کا حق حاصل ہوجائے گا۔لیکن فرد کےحق بغاوت کو اس بنیاد پر برا سمجھنے والے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ بغاوت بری سہی لیکن اتنی بری نہیں جتنی کہ وہ حالات جو بغاوت کے بیج بوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ جب تک کوئی فرد انتہائی شدت کے ساتھ اپنے مقصد بغاوت کی حقانیت کومحسوس نہ کرے، وہ خون بہانے اورقربانی پیش کرنے پر رضا مند نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ ہرشخص کا کام نہیں ہے کہ وہ بغاوت کی آڑلے کر تشدد کو جائز قرار دے لے۔ اس کے علاوہ انقلاب کے لئے بغاوت کبھی بے ساختہ اور اچانک نہیں ہوتی۔ عام طورپر ہر انقلاب سے پہلے عوام ایک عرصہ تک فلاح واصلاح کا صبر سے انتظار کرتے ہیں۔ بغاوت اس وقت شروع ہوتی ہے جبکہ صورت حال یہ واضح کردیتی ہے کہ اب حکمراں کی اصل حقیقت پر اعتماد نہیں کیاجاسکتا ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ بغاوت کے لئے اکثریت کا حامی ہوناضروری ہے،اسی بنیاد پر اقلیت یا فرد واحد کی بغاوت کو غداری کہاجاتاہے۔لیکن عوام نہ تو نظام کی خامیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے تحت جو عادت مستحکم ہوچکی ہے اس کو چھوڑ کر بغاوت کے حامی بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرکسی نظام میں وقت کے ہاتھوں یا کسی بدچلنی یا بداطواری کی وجہ سے کوئی خلقی

خرابی پیدا ہوگئی ہے تو اس کی صحت اتنی آسان نہیں ہے چاہے ساری دنیا دیکھتی اور سمجھتی رہے کہ اصلاح کا یہی موقع ہے۔عوام کو اس اصلاح کے احساس اور اس کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے اس لئے بغاوت کا عمل کبھی بھی اکثریت کا حامل نہیں ہوتا۔احتجاج و بغاوت ہمیشہ چند شخصیتیں ہی کرتی ہیں اور وہ بھی اس مفروضہ پر کہ ان کی قربانی آئندہ نسلوں کے ضمیر کو بیدار کرتی رہے گی اور اس کی حقانیت پر ان کو قائل کرتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر باغی کی شکست وقتی ہوتی ہے لیکن نسل وزمانہ کے اعتبار سے اس کی فرح ابدی ہوجاتی ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ حکومت کی طاقت بے پناہ مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرد واحد کی طاقت حقیر ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی اگر کوئی فرد حکومت سے ٹکر لیتا ہے تو گویا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ اس کے دو جواب ہیں:

پہلا یہ کہ اگر ہر فرد اپنی طاقت کو حکومت کے مقابلے میں حقیر سمجھ کر خاموشی اختیار کرے تو پھر انصاف طاقتور کی مرضی بن جائے گا۔لیکن یہ وہ نظریہ ہے جس کے خلاف پوری عالم انسانیت ہمیشہ احتجاج کرتی رہی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ فرد واحد کی طاقت کو اس وقت حقیر سمجھا جائے گا جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت دوسروں میں پیدا نہ کرسکے اور یہ حمایت پیدا نہ کرسکنے میں کوئی زمانہ کی قید نہیں ہے۔ باغی یہ جانتا ہے کہ چاہے وقتی طور پر یہ حمایت پیدا نہ ہوسکے لیکن حالات وزمانہ کی کروٹ لوگوں کو اس کا نظریہ تسلیم کرنے پر مجبور کردے گی۔حسینؑ اپنے زمانہ میں چاہے ۷۲ افراد ہی کو اپنا ہمنوا بناسکے ہوں لیکن آج ہر قوم وملت مقصد حسینی کی حقانیت کی گواہ بن چکی ہے۔ زمانہ سے ماورا ہوکر حسینؑ کی طاقت کا جائزہ لیجئے تو یزید ہی کی حکومت حقیر نظر آئے گی۔ اس لیے یہ کہنا بے بنیاد ہے کہ فرد واحد کی طاقت حقیر ہوتی ہے۔

بغاوت کی اس وضاحت میں اگر حسینؑ کے عمل کا جائزہ لیاجائے اور ان کے ارد گرد کی سیاسی فضا کا تجزیہ کیاجائے تو اس نتیجہ پر پہونچاجاسکتا ہے کہ یزیدی راہ وروش کے خلاف حسینؑ کا احتجاج واعلان بغاوت اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والا عظیم انقلاب،حق بجانب تھا۔حسینؑ ایک مضبوط و مستحکم طاقت کو قانون فطرت کے مطابق لانا چاہتے تھے۔حسینؑ جب فرعون صفت یزید کو اقدار اسلامی سے خارج کر رہے تھے اور اس کے خلافت اپنی بغاوت کو قانون فطرت کا حامی قرار دے رہے تھے تو وہ قانون وبغاوت کے الفاظ کو نئے معنی پہنا رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ سماج

کے مروجہ قوانین کی اطاعت اس وقت بلند ترین تمدنی خصوصیت سمجھی جائے گی جب وہ قانون فطرت کے مطابق ہوں۔ یزید قانون فطرت کو مسخ کر رہا تھا، اقدار اسلامی کو پامال کر رہا تھا پس اس کے خلاف حسینؑ کے اعلان احتجاج وبغاوت کو غداری نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ عین تہذیبی حق تھا اسی طرح حسینؑ کی بغاوت اور ان کا انقلاب بے ساختہ نہیں تھا۔ انہوں نے امام حسنؑ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک حالات کا صبر سے انتظار کیا۔اعلان بغاوت تو اس وقت ہوا جبکہ خود یزید، اپنی احساس کمتری کے نتیجہ میں،حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہوا۔حسینؑ کی بغاوت ایسے وقت میں برپا ہوئی تھی جبکہ اسلامی نظام میں حکمراں کی بدچلنی وبداطواری کی وجہ سے، اخلاقی خرابی پیدا ہوچکی تھی حسینؑ کا نظریہ اپنے زمانہ میں اگرچہ ایک اقلیت کا نظریہ تھا لیکن زمانہ کی مجموعی حمایت کے مقابلہ میں مزید استحکام آج ایک حقیر تنکا نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حسینؑ کی طاقت جو بظاہر بے اثر معلوم ہوتی تھی اس قدر جلد مؤثر ثابت ہوئی کہ یزید کو اپنے ہی دور حکومت میں اپنا تخت وتاج متزلزل ہوتا دکھائی دیا۔

ہر صحت مند اور برحق احتجاج وبغاوت ایک کامیاب انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے جو اس عنوان کا دوسرا جزو ہے۔ بغیر انقلاب کے بغاوت یقینا غداری ہے۔ بغیراحتجاج و بغاوت کے انقلاب یقینا محض جنون ہے۔ انقلاب بغاوت کی حقانیت کا ضامن بنتا ہے اور بغاوت انقلاب کی امانتدار بنتی ہے، بغاوت ایک ذریعہ ہے، انقلاب کی کئی منزلیں ہوتی ہیں، ایک باعمل انقلاب ہوتا ہے۔ ایک خاموش و بے مزاحمت انقلاب ہوتا ہے، ایک نفسیاتی انقلاب ہوتا ہے اور ایک جوابی انقلاب ہوتا ہے۔ جو انقلاب اپنی ان چاروں منزلوں کو پارکرلیتا ہے وہی مکمل انقلاب کہلاتا ہے۔ ورنہ اکثر انقلاب ، اپنی منزلیں پوری نہ کرسکنے کے باعث نامکمل وادھورے رہ جاتے ہیں۔حسینؑ کے انقلاب نے اپنی تھوڑی ہی مدت میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب کی چاروں منزلوں کو مکمل کیا اس کی مثال دنیا میں کم نظر آتی ہے۔

حسینؑ کے انقلاب کا پہلا درجہ باعمل انقلاب کا ہے۔ انقلاب کی یہ منزل فجر سے عصر تک کی ہے۔ یہ قربانیوں کا انقلاب ہے۔ یہ کشت وخون کا انقلاب ہے۔ یہ انقلاب کی وہ منزل ہے جہاں حسینؑ اپنے اصحاب واقربا کو سپرد خاک کررہے ہیں۔ ایک انقلابی کے سامنے مقصد اہم ہوتا ہے، زندگی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی اگر حسینؑ بشری تقاضوں کو سامنے رکھتے تو یقینا مقصد حسینی کمزور پڑجاتا۔حسینؑ کو اپنے مقصد کی اہمیت کا کچھ ایسی ہی شدت سے احساس تھا کہ انہوں نے علی اکبرؑ کو

میدان جنگ میں بلاتامل بھیج دیا، سینے سے تیر کھینچ لیا، خود بیٹے کی لاش اٹھالی۔ بھائی، بھتیجوں اور بھانجوں کو قربان کردیا، جیسے کہ یہ متاع مقصد کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ حسینؑ کے اس استحکام میں مقصد کی عظمت مضمر ہے۔ یہ قربانیوں کا وہ باعمل انقلاب تھا جس کی عظمت مضمر ہے۔

یہ قربانیوں کا وہ باعمل انقلاب تھا جس کو عونؑ ومحمدؑ کی جرأت، عباسؑ کی شجاعت، اکبرؑ کی جوانی، قاسمؑ کی کمسنی، حبیبؑ کی پیری، عوسجہؑ وزہیر ابن قین کی للکار، ششما ہے کہ معصومیت اور خود حسینؑ کی سالمیت نصیب ہوئی تھی۔ فجر سے عصر تک جتنی قربانیاں حسینؑ نے پیش کی تھیں وہ سب کی سب شخصیت میں مضمر تھیں۔ صرف علی اصغرؑ کی شہادت وہ واحد قربانی تھی جو آفاقی تھی کیونکہ ابھی شخصیت میں اسیر نہیں ہوئی تھی۔ اسی قربانی نے ہر ارض و ہر شخص نے قربانی کو معصوم بنادیا تھا۔ یہ تھیں حسینؑ کی عظیم ترین قربانیاں جن کو حسینؑ نے اپنے عظیم اور باعمل انقلاب کی راہ میں پیش کیا۔

اس منزل کا اختتام بھی عجیب انداز سے ہوتا ہے۔ دن ڈھل چکا ہے، لاشے تو میدان میں پڑے رہ گئے لیکن سرتن سے جدا کر کے نوک نیزہ پر بلند کردئے گئے۔ ایک طرف تھا خاندان رسالت کا لٹا ہوا قافلہ، دوسری طرف نیزوں پر بلند سروں کا کاررواں۔ سروں کا یہ کاررواں رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں گامزن ہے۔ رعونیت حکومت مطمئن کہ باغیوں کا سر کچل دیا، سروں کو تنوں سے جدا کردیا۔ تشہیر کردی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے عوام نے حکومت کے اس طرز عمل سے کہاں تک عبرت حاصل کی۔ لیکن آج یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں نوک نیزہ پر بلند ان سروں کے قافلے کا تصور جس حساس دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

''ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے''

یوں حسینؑ کے انقلاب کی پہلی منزل تمام ہوئی اور بلافصل دوسری منزل کا آغاز ہوا۔ یہ بے مزاحمت کی منزل ہے۔ اس منزل میں ظلم کا جواب خاموشی سے دیا جاتا ہے تاکہ ظلم کی شدت کا احساس گہرا ہوجائے اور اسی اعتبار سے معصومیت و بے گناہی نکھر جائے۔ جس طرح انقلاب کی پہلی منزل میدان کربلا اور مرکزی کردار حسینؑ تھے اسی طرح انقلاب کی دوسری منزل شام کا بازار اور مرکزی کردار سید سجادؑ تھے۔ ایک طرف شام کا بازار سجا ہوا دوسری طرف سید سجادؑ طوق وزنجیر میں

گرفتار خاموشی کے ساتھ تماشائیوں کے ہجوم کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت سید سجادؑ کی شخصیت دوعوامل پر مشتمل ہے۔ ایک خاموشی ، دوسرے زنجیر کی جھنکار۔ پہلے خاموشی کو لے لیجئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جب انسان پر مصائب حد سے زیادہ گزر جاتے ہیں تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ لیکن نفسیات کے ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ جب انسان خاموش ہوجاتا ہے تومجسم زبان بن جاتا ہے۔ امام سید سجادؑ علاّمہ اقبال کے اس مصرعہ کے مصداق تھے:

''خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری''

لیکن حکومت وقت کی اس کم مائیگی کو کیا کہئے جو سید سجادؑ کی خاموشی کو شکست خوردگی کی علامت سمجھ رہی ہے۔ میں کہتاہوں کہ اگر یہ شکست خوردگی میر کاررواں میں پیداہوچکی تھی تو اس کا تاثر واضمحلال پورے کارواں میں پایا جانا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے تو منظر کچھ دوسرا ہی نظر آ رہا ہے۔ علیؑ کی بیٹی اپنے باپ کے لب و لہجے میں مجمع کو بے باکانہ مخاطب کررہی ہے، اپنا تعارف کرارہی ہے، اپنی داستان غم سنارہی ہے جس کو سن کرعوام کی ذہنیتیں پلٹ رہی ہیں، لوگ بے چین ہورہے ہیں۔ سینوں میں آگ بھڑکنا شروع ہوگئی ہے۔ میں اس وقت کی حکومت سے غائبانہ طور پر مخاطب ہوکر کہنا چاہتا ہوں کہ سید سجادؑ کی خاموشی کو شکست خوردگی سمجھنے والو،عوام کی بےچینی کو بھی تو دیکھ لو:

''دلوں کی آگ زباں پا گئی تو کیا ہوگا''

سید سجادؑ کی شخصیت کا دوسرا جز زنجیر کی جھنکار ہے۔ حکومت وقت ایک بار پھر ٹھوکر کھاتی ہے۔ وہ زنجیر وطوق کو ایک قیدی کی علامت سمجھ رہی ہے اور اس سے بے خبر ہے کہ زمانہ کے نشیب وفراز سے جب انسانی شعور نکھرے گا تو پھر اس کے نزدیک یہ زنجیر وطوق قیدی کی نہیں بلکہ ''انقلاب'' کی علامت بن جائیں گے۔ سید سجادؑ کی شخصیت کے ان دونوں اجزاء کو اب ملا دیجئے۔ سید سجادؑ خاموش ہیں۔ صرف زنجیر کی جھنکار سنائی دے رہی ہے۔ حکومت وقت آسودہ کہ اس نے خانوادۂ رسولؐ کے ہرفرد کو خاموش کردیا، طوق وزنجیر میں اسیر کردیا، قیدی بنالیا۔ لیکن حکومت کی کم نگاہی یہ محسوس کرنے سے قاصر ہے کہ زنجیر کی جھنکار چودہ سو برس تک انسانی ذہن کو جھنجوڑتی رہے گی اور جب انسانی ذہن اپنی ارتقا کی منزل میں پہونچے گا تو وہ سید سجادؑ کے خاموش مقصد کا زنجیر کی جھنکار کے لہجہ میں اس طرح اظہار کرے گا:

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

یوں انقلاب کی دوسری منزل تمام ہوئی۔ اب نفسیاتی انقلاب کی منزل ہے ۔ یہ منزل خود یزید کا دربار ہے اور اس کا مرکزی کردار جناب زینب(س) ہیں۔ خاندان رسالت کی عزت مآب خواتین دربار یزید میں بصورت قیدی کھڑی ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑی رسوائی ہے نہ کہ اس پر یزید کا تمسخر وطنز۔ در اصل یزید سے اس کے علاوہ اور کوئی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔کل جب وہ حسینؑ سے بیعت کا طلب گار ہوا تھا تو یہ میرے نزدیک اس کی احساس کمتری تھی اور آج ان خواتین کے ساتھ جو یہ ہتک آمیز رویہ اختیار کررہا ہے تو یہ میرے نزدیک اس کی کم ظرفی ہے۔ یزید، ان افراد سے نسبی حیثیت سے تو واقف تھا لیکن ان افراد کے بلندیٔ کردار سے واقف ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یزید، خلیفۂ وقت تھا، ممکن ہے کہ اس نے سن لیا ہو کہ جناب ہاجرہ اس تصور سے عمر بھر روتی رہیں کہ ''اگر میرا بیٹا اسماعیل ذبح ہوجاتا'' لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی یہ ام لیلیٰ(س)، کربلا کی وہ ہاجرہ تھیں جن کے سامنے واقعتا ان کا بیٹا ذبح کردیا گیا۔ یزید نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی یہ یہ ام رباب(س) وہ ہیں جنہوں نے علی اصغرؑ کی معصومیت کے پیمانہ سے انسان کی درندگی ناپی تھی۔ یزید نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی جناب زینب(س) صبر کا کتنا بڑا کوہ گراں ہیں۔ بن بھائی بن اولاد، بن اعزاء واقرباء ، غریب الوطنی ، بدنصیبی، بے ردائی، اسیری اور اب دربار یزید میں بے حرمتی نہ معلوم کتنے غبار اس آئینہ کو دھند لانے کی ناکام کوشش کرتے رہے لیکن اس کی جلا ماند نہ پڑی۔ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔لیکن جناب زینب(س) کو جس ہتک آمیز رویہ کا سامنا تھا، اگر کہیں جناب عباسؑ یہاں تک پہونچ گئے ہوتے تو یزید کی دھجیاں اڑگئی ہوتیں۔ مناسب مقام پر اس کی تشریح کروں گا یہ بتانے کے لئے کہ میری یہ بات جذبات پر نہیں ،حقیقت پر مبنی ہے۔

دربار یزید، رسولؐ کے پیش کردہ اسلام کی برعکس تصویر ۔یہ ناممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر جناب زینب(س) کو اپنے نانا رسولؐ نہ یاد آ گئے ہوں۔یہ میرا عقلی اندازہ (Reasanable conjecture) نہیں ہے میرے پاس اس کی ایک نفسیاتی توجیہ ہے وقت اذان مؤذن کو اذان دینے کا حکم ہوا، اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی، جناب زینب خاموش ہیں، اَشْهَدُ اَنْ لآ اِلٰـهَ اِلاَّ اللهُ کی منزل آئی ، جناب زینب خاموش

ہیں۔ لیکن جیسے ہی مؤذن نے اشھد انّ مُحمّدًا رّسولُ اللّٰہ کہا جناب زینب تڑپ کے آگے بڑھیں اور یزید سے پوچھتی ہیں کہ اے یزید! بتا محمدؐ میرے کون تھے۔ یاد رکھیئے کہ جب انسان کے ذہن میں کسی شخص کا تصور پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے تو اس کا ذکر ہونے پر اس کا نام بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔ اَشْھَدُ انّ مُحَمّدًا رّسُوْلُ اللّٰہ کا فقرہ سنتے ہی جناب زینب(س) کا یزید سے بے ساختہ سوال کرنا کہ بتا محمدؐ میرے جد کا نام ہے یا تیرے جد کا۔ اگر تو کہتا ہے کہ وہ تیرے جد تھے تو تو جھوٹ بولتا ہے۔ محمدؐ تو میرے جد کا نام ہے اور تو نے انہیں کے نواسہ حسینؑ کا سر کاٹا ہے۔ اس موقع پر حضرت زینب(س) کی زبان سے ان کلمات کا نکلنا یہ بتاتا ہے کہ جناب زینب(س) کے ذہن میں رسولؐ پہلے ہی سے موجود تھے۔ یہ سوال یزید کے لئے اتنا بڑا تازیانہ تھا کہ اس کے بے باکانہ اور توہین آمیز رویہ پر اوس پڑگئی، سرندامت سے جھک گیا، اب تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا فرمانروا بےچین، اور یہ قیدی مطمئن چشم زدن میں پورا دربار یزید واقف ہوگیا کہ یہ قیدی کون ہیں۔ ان کی چہ می گوئیوں نے یزید کو برہنہ کردیا، یہ تھا نفسیاتی انقلاب۔

ابھی تھوڑی دیر قبل جناب عباسؑ کے سلسلے میں جو میں نے جملہ کہا تھا، یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی تشریح مناسب ہے، اس وضاحت کے لئے کہ میرا یہ جملہ محض جذباتی نہیں تھا۔ دربار یزید میں غیر ملکی سفیر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یاد رکھیئے سفرا جس ملک میں تعینات ہوتے ہیں، وہاں وہ اپنے ملک کے لئے فائدہ حاصل کرنے کا مقصد سامنے رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ان کو جو ڈپلومیسی کا پہلا سبق سکھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جس ملک میں وہ تعینات ہوئے ہیں، اس ملک کی حکومت کو ہاتھ میں لئے رہیں، بگاڑ پیدا نہ کریں، اختلاف نہ کریں، اپنے ملک کے خلاف کسی طرز عمل کو نظر انداز کرجائیں، غصہ پی جائیں، مختصر یہ کہ ڈپلومیسی کا پہلا سبق ضبط نفس ہے۔ اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ جیسے ہی جناب زینب(س) نے سوال کیا کہ بتاؤ محمدؐ میرے کون تھے اور اس طرح بھرے دربار میں ان قیدیوں کے خاندانی رشتہ کا انکشاف ہوا تو ایک سفیر نے اپنی ڈپلومیسی کے اس بنیادی سبق کو بالائے طاق رکھ کر یزید سے کہا کہ ''اگر میرے ملک میں بانی مذہب کے خاندان کے افراد کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تو حکومت وقت کی دھجیاں اڑادی جاتیں۔'' ذرا غور کیجئے کہ جب ایک غیر ملکی سفیر، ڈپلومیسی کے بنیادی اصول ضبط نفس کو نظر انداز کرکے یہ کہہ سکتا ہے تو اگر جناب عباسؑ دربار یزید میں ہوتے تو کیا واقعتا ایسا نہ ہوگیا ہوتا۔ سفیر کا یہ ردّعمل اس نفسیاتی انقلاب کا ایک

گرانقدر ستون ہے۔ یہ نفسیاتی انقلاب اپنی انتہا کو اس وقت پہونچا جب ایک ظالم کے گھر میں مظلوم کا ماتم برپا ہوا۔

یہ انقلاب کی تیسری منزل کا اختتام تھا اور یہیں سے چوتھی منزل کا آغاز ہوا۔ جس کو جوابی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ انقلاب دشمن عناصر کو فنا کرنے کے لئے جوابی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دشمن عناصر انقلاب کے نتیجوں کو نقصان نہ پہونچاسکیں۔ اس انقلاب کا سہرا مختار کے سر ہے، مختار نے ان عناصر کو ختم کرکے انقلاب کے نتیجوں کو مستحکم کردیا، خود انقلاب کو متحرک کردیا۔ اس کو رفتار زمانہ بخش دی تاکہ اس انقلاب کا دل ہر زمانہ میں ڈھڑکتا رہے تاکہ لوگ غداری اور حق بغاوت میں فرق سمجھ لیں اور ان دونوں لفظوں کو کسی ایک شخص سے وابستہ کرکے گمراہ نہ کرسکیں۔ اس انقلاب کے تکمیل کا یہ آخری فریضہ تھا جس کو مختار نے پورا کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حسینؑ کے انقلاب کی یہ چاروں منزلیں انتہائی سرعت کے ساتھ مکمل ہوگئیں حسینؑ کا انقلاب ایک تہہ دار انقلاب تھا، انقلاب در انقلاب تھا۔ ایسے انقلاب کے لئے کتنے ثبات قدم اور کتنے بڑے عزم کی ضرورت تھی۔ آج چودہ سو برس گزرجانے کے بعد جب انسانی ذہن اس انقلاب در انقلاب کی بازگشت کے مجموعی تاثر کو سمجھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

حسینؑ کوہ ثبات و قرار زندہ باد
حسینؑ صبر و رضا کا وقار زندہ باد
ہر انقلاب ترا عزم چوم کر اٹھا
حسینؑ عزم کے پروردگار زندہ باد

]ب[

انقلاب حسینی۔ تطہیری واصلاحی عمل

مولانا ناظم علی خیرآبادی

اسلام نے طہارت ونظافت کی اہمیت، عظمت اور مرتبہ کو واضح کرتے ہوئے اسے جزوایمان قرار دیا ہے نیز طہارت کومستقل کتاب وعنوان قرار دیتے ہوئے روحانی اور جسمانی طہارت کے ذریعہ تکامل وارتقاء حیات مادی اور استحکام و استواری حیات اخروی کے اسباب ووسائل کوتفصیلی طور پر بیان کیا ہے ،طہارت ونظافت کے مقابلے میں نجاست اور کثافت ہے جس سے اجتناب کے لئے مسائل ورسائل کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے ،طہارت ونجاست ،نظافت وکثافت کاتعلق فرد واجتماع دونوں سے ہوسکتا ہے۔ انفرادی نجاست وکثافت جسمانی اور روحانی آلودگی کوختم کرنے اور اس سے محفوظ رہنے کے لئے کون ساطریقۂ کار اور روش عمل اختیار کرنا ہوگا پھر سماج ومعاشرہ کو پاک وصاف صالح اور مفید بنانے کے لئے کیسے انداز حیات کی پابندی کرنا ہوگی؟

اسلام نے نجاست وکثافت کی تحدید، تعیین وتبیین کی اور اس سے تحفیظ ،تبعید اور تنزیہ کے معقول وکارآمد ذرائع بھی فراہم کئے۔ بدنی نجاست کی توضیح وتشریح کرکے تحفظ کے لئے مطہرات کو بیان کیا اور روحانی کثافتوں کا تذکرہ کرکے محاسن اخلاق اور مکارم اعمال کو پیش کیا ، عام زبان میں طہارت، لغوی معنی کے لحاظ سے صرف پاکیزگی اور صاف ہونے کے مفہوم اداکرتی ہے لیکن شرعی اصطلاح میں طہارت یاتو وضوغسل اور تیمم کانام ہے یاطہور کا استعمال نیت کی شرط کے ساتھ ہے۔ دونوں میں فرق نیت کے وجود اورعدم کاہے کہ لغوی طہارت میں قصد ونیت کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن شرعی اور اصطلاحی طہارت میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں نیت کے بغیرطہارت کا تصورممکن نہیں ہے۔

اسلام خودمطہرات میں سے ہے کہ اگرمنکر خدا اسلام قبول کرلےتو وہ پاک ہوجاتاہے اسی طرح انقلاب بھی مطہرات میں سے ہے جس میں شئی کا اپنا نجس وجود اولیٰ خودکسی ذریعہ سے تبدیل ہوکر پاک وجود اختیار کرلیتا ہے جیسے شراب، سرکہ میں بدل جائے یا نجس لکڑی جل کر راکھ ہوجائے۔ اسی انداز پر اگر انگور یا کھجور وغیرہ کارس جوش کھا کر نشہ آور بن جائے تو وہ نجس ہوجاتاہے۔ اسے پاک کرنے کے لئے فقہائے اسلام نے حکم دیا ہے کہ جب اسے دو تہائی جلا دیا جائے یا خود جل کر

دوتہائی ختم ہوجائے تو وہ پاک ہوجائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انقلاب وہ چیز ہے جس کے ذریعہ نجاست ، کثافت اور آلودگی کو دور کیا جاتا ہے اور طہارت ونظافت کو حاصل کیا جاتا ہے ،نجاست وکثافت اگر فرد تک محدود ہوتو محض تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کا عمل مفید ہوگا لیکن اگر اس کے مضر اثرات سے سماج اور معاشرہ فساد اور خرابی کی زد میں آ گیا ہوتو دوسرے اصلاحی اسلحوں کا استعمال کرنا ضروری ہوجاتا ہے اگرچہ یہ طے ہے کہ فرد کی خرابی کو دور نہ کیا گیا تو یہ متعدی مرض کی طرح پھیل کر سماج اور معاشرہ کے رخسار کو داغدار اور ظاہر وباطن کو مدقوق بنادیتا ہے۔ ایسے میں فساد وانگیز، ضرررساں اور مخرب معاشرہ چیز کو دور کرنا اس کے خلاف آواز بلند کرنا ،انقلاب کے تیشہ فرہادی سے اصلاح کی جوئے شیر نکال کر فطری اور جبلی لذت سے کام ودہن کو آشنا کرنا ہرصاحب عقل وہوش حسب قدرت وامکان اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

محققین مفکرین اور میدان دانش وبینش میں اشہب قلم کو رواں دواں رکھنے والوں نے انقلاب کو اعتبارات وعبارات کے حدود میں رکھتے ہوئے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں بعض انقلاب میں نظام حکومت وافراد میں تبدیلی مقصود ہوتی ہے اور بعض میں نظام کے ساتھ مقاصد حکومت میں بھی تبدیلی کا عنصر شامل ہوتا ہے ، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انقلاب کسی ایک طرز حکومت کے تسلیم کرنے والوں میں نا اہل کوتخت سے اتار کر دوسرے کو اس کی جگہ پر بٹھا دینا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب کا مطلب ہے نیا نظام حکومت نافذ کرنا، ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایک ہی طرح کے انسانوں کومختلف ناموں سے حاکم بنادیا جائے۔ جیسے شہنشاہ یا صدر جمہوریہ وغیرہ اسے انقلاب کہاجاتا ہے۔ بعض لوگ فوجی انقلاب یا فوجی وسیاسی دونوں طرح کے انقلاب کے قائل ہیں لیکن اصلی اور واقعی انقلاب اسلامی دینی اور مذہبی ہوتا ہے مگر ویسا مذہبی نہیں جس کا عام طور پر دنیا میں تصور ہے بلکہ اسلامی انقلاب یہ ہے کہ نا اہل حکمرانوں کے ہاتھوں سے اقتدار لے لیا جائے اور اسلام کی صحیح معرفت رکھنے والوں کے دست قدرت میں حکومت کی باگ ڈور دے دی جائے۔

اسلام اسی نوعیت کے انقلاب کو پسند کرتا ہے جیسا کہ سرکار ختمی مرتبت پیغمبرؐ اسلام نے پیش کیا تھا وہ قانون الٰہی کے دائرہ میں رہتے ہوئے سماج اور معاشرہ کے تمام شعبہ ہائے حیات میں انقلاب کی دعوت یوں دیتا ہے کہ جہاں انقلاب آئے تو وہاں کے عقائد وافکار میں تبدیلی آئے، تہذیب وتمدن میں قرآنی احکام کی عکاسی ہو، حیات کی قدروں میں دینی انداز ہو، قول وفعل اورعمل

میں ہمہ گیر تبدیلی پیدا ہو اور ہمہ جہت انقلاب کی نمود ہو۔

اس آئینہ میں غور وفکر کرنے حالات ماضی کا مطالعہ کرتے وقت آواز انقلاب کے ماحول، حاکم رعایا وغیرہ کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجائے کہ حضرت امام حسینؑ نے جو انقلاب پیدا کیا وہ کس سبب کی بنا پر اور کس ضرورت کے پیش نظر کیا اور اس میں کس حد تک امامؑ کامیاب رہے۔ اس سلسلے میں حاکم وقت اور اس کے پیدا کردہ ماحول وحالات کا پہچاننا بھی ضروری ہے نیز امامؑ کی انقلابی حکمت عملی کی معرفت بھی لازم ہے۔

حاکم وقت یزید:

یعنی اسلاف کی انسانیت سوز حرکتوں، اخلاق شکن کارستانیوں، خودسری، خواہش پرستی، چھوٹی عقل، کوتاہ فکری، تعقل وتدبر سے عاری، اقدار حیات کی پامالی، دینی فساد اور عملی بدکرداری کا معجون مرکب، وہ مسیحیت کا پروردہ جنگلی درندگی بہیمیت اور بربریت کا عادی، مادر پدر آزاد اور ہوس پرستی کا رسیا تھا، اسلام سے اس کا کسی طرح کا کوئی تعلق نہ تھا البتہ یہ ضرور ہے کہ دنیاداروں، زر پرستوں، حرص وہوس کے شکار افراد کی نگاہ میں حاکم مانا جارہا تھا۔ حاکم شام معاویہ بن ابوسفیان نے امام حسنؑ سے جو صلح کی تھی اس کے معاہدہ کی مخالفت کرتے ہوئے، کفروالحاد نفاق وعناد کے ثبوت میں اپنی دیرینہ آرزو اور سلسلۂ سابقین کی تمناؤں کی تکمیل یزید کی صورت میں دیکھی تو اسے مسلمانوں کی گردن پر ولی عہد بناکر لاد دیا اور اس نے بربریت کا رقص عریاں اس طرح کیا کہ فطری انسانیت پناہ مانگنے لگی۔

علاّمہ بلاذری نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

یزید کی تربیت مسیحیت کی تعلیمات کے مطابق ہوئی تھی یا اس میں عقلاً مسیحیت کا رجحان پایا جاتا تھا۔[۱]

یزید کے کالے کرتوت، بدعقیدگی، بدکرداری کے تعلق سے امام حسینؑ کے اس خط کو پیش کیا جاسکتا ہے جو آپ نے معاویہ کو اس وقت تحریر فرمایا تھا جس میں یزید کی ولی عہدی اور حاکمیت کے مقابلہ میں امامؑ کا ردعمل بھی ہے۔

”جو کچھ تونے یزید کی لیاقت اور اسلامی امور کی تدبیر کی صلاحیت کے بارے میں

لکھا ہے وہ معلوم ہوگیا ہے معاویہ ! تو لوگوں کو یزید کے سلسلے میں فریب میں رکھنا چاہتا ہے تو ایسے شخص کا تعارف کرارہا ہے جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے جسے لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے یا صرف تم اس کو جانتے ہو۔ یہ امر ایسا نہیں ہے یزید نے خود اپنے کو پہچنوایا ہے اور اپنا باطن کھول کر سامنے رکھد یا ہے۔ یزید کا تعارف اس طرح کرانا چاہئے کہ یزید کتوں اور کبوتروں سے بازی کرنے میں مشغول ہے۔ وہ ایک بوالہوس شخص ہے زیادہ وقت راگ ورنگ اور رقص وسرور کی محفلوں میں گزارتا ہے۔ اس طرح اس کا تعارف کراؤ اس کے علاوہ کوئی اور کوشش نہ کرو'۔

اسی خط میں امامؑ نے معاویہ کے کردار کی بھی عکاسی کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

اس امت پر تم نے جتنے جرائم کئے ہیں وہی کافی ہیں اب مزید بارگناہ اٹھا کر خدا کی بارگاہ میں جانے کی کوشش نہ کرو۔ تم نے اس حد تک ظلم وانحراف سے کام لیا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔ اب تمہارے اور موت کے درمیان چند لمحے باقی رہ گئے ہیں۔ ۲۔

نیز ولید کے دربار میں جب سوال بیعت ہوا اور امامؑ اپنا موقف واضح کر کے واپس ہونے لگے تو مروان کے گستاخانہ فریب آمیز جملے اور دریدہ دہن کے خیالات کے جواب میں امامؑ نے یزید کی بدکرداری کا اظہار فرمایا:

یزید ایک فاسق وفاجر شراب خور اور قاتل ہے جو علی الاعلان فسق وفجور کا ارتکاب کرتا ہے مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا۔ ۳۔

یہ کچھ تھوڑا سا حال حاکم وقت یزید کا تھا جس کی بے دینی ،ستم وجور سے معمور زندگی کا تذکرہ کتابوں میں اس حد تک تفصیل سے ملتا ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کے گھناؤنے کردار سے نفرت کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے بلکہ اس کے نام کو نہ صرف ننگ انسانیت وآدمیت بلکہ داخل دشنام قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ'' اَلنَاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوکِھِم ''کے آئینہ میں رعایا کا حال بھی اس سے کم خراب نہیں تھا بلکہ دیگ سے زیادہ چمچے گرم تھے۔ ان کی دنیا طلبی ،زر پرستی اور دین بیزاری کا معمولی سا نقشہ اس واقعہ سے معلوم ہوجاتا ہے جو امام حسینؑ نے عمر سعد سے گفتگو کے دوران واضح کیا ہے۔

'' اے ابن سعد تجھ پر افسوس ہوتا ہے کیا تجھے خدا کا خوف نہیں ہے اور میرے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہے۔ تجھ کو معلوم ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ اس قوم کو چھوڑ

کر میری طرف آجا تا کہ تو خدا کے نزدیک ہوجائے۔ ابن سعد کہتا ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے گھر کو تباہ وبرباد کردیں گے۔ امامؑ نے فرمایا میں تیرے لئے گھر بنادوں گا۔ عمر سعد نے کہا یہ لوگ میری جائداد پر قبضہ کرلیں گے۔ امامؑ نے فرمایا حجاز میں میرے پاس جو دولت ہے اس میں سے تجھے تیری جائداد سے بہتر دے دوں گا۔ ابن سعد نے کہا کہ میں اپنے بچوں کے بارے میں خوف میں مبتلا ہوں ظاہر ہے کہ جب ذہن ودماغ مال ودولت کی کثرت کے نشہ یا حرص وہوس کے غرور میں مبتلا ہوتو انسان قلبی مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔'' **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوبِهِم وَعَلٰی سَمْعِهِم وَعَلٰی اَبْصَارِهِم غِشَاوَةٌ**'' ۴؎ کا مصداق ہوجاتا ہے امامؑ نے فرمایا خدا کرے تیرا سر بستر خواب پر ہی کٹ جائے اور روزِ محشر تیرا گناہ نہ بخشا جائے۔ مجھے امید ہے کہ تو عراق کی گندم نہ کھا سکے گا۔ ابن سعد نے طنز کرتے ہوئے کہا گندم نہیں تو جو سہی'' ۵؎

ظاہر ہے جو سماج اور معاشرہ ایسے موذی مرض اور متعدی بیماری میں مبتلا ہواس کا علاج انقلاب واصلاح کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس کا حاکم اپنی شرابخوری پر ناز کرتا ہو، بدکاری پر اینٹھتا ہو، پرہیزگاری سے کوئی واسطہ نہ ہو، جس کے لئے صحابی رسولؐ عبد اللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ نے شہادت دی ہو کہ اس یزید کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہ شراب پیتا ہے۔ طنبورہ بجاتا ہے نیز یہ کہ بنی امیہ کے نرم روخلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس شخص کو بیس تازیانوں کی سزادی جس نے اس کے سامنے یزید کو امیرالمومنین کے نام سے یاد کیا۔ ایسی صورت میں رعایا کے اندر سے بھی احساس ذلّت وخواری کا خاتمہ لازم تھا اور وہ تھوڑے سے مال ومتاع دنیا کے لئے دین ایمان انسانیت اور شرافت کو بیچ دینے میں کوئی عار وعیب نہیں سمجھے گا۔

انقلاب امام حسینؑ کا مقصد اصلاح:

انقلاب لانے والے ہی کو حق ہوتا ہے کہ وہ انقلاب کے ہدف کو بیان کرے، انقلاب کے بانی فرزند رسولؐ، امام وقت معصوم عصر حضرت امام حسینؑ تھے انہوں نے خود اپنی زبان سے اس ہدف ومقصد کو واضح طور پر اس طرح بیان کیا ہے۔ امامؑ اپنے بھائی محمد حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

□ میں کسی تفریح ہواوہوس ، غرور وفساد وظلم کے لئے نہیں نکل رہاہوں میں اپنے جد رسول خدا

کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ میرا مقصد امر بالمعروف اورنہی عن المنکر ہے۔ میں اپنے نانا اور بابا کی سیرت پر چلتے ہوئے امت کو اس سیرت پر چلانا چاہتاہوں۔ اگر کوئی اسے نہیں مانے گا تو میں صبر سے کام لوں گا یہاں تک کہ خدا میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کردے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔۶؎

کتب مقاتل وتاریخ میں کسی مقام پر امام حسینؑ کی زبان مبارک سے مقصد کے بیان کرنے میں لفظ انقلاب کا استعمال نظر قاصر سے نہیں گزرا ہے البتہ یہ لفظ اب اتنا عام ہوگیا ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے استعمال کرنا اردو زبان میں درست ہے۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ انقلاب کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی ہے اور اصلاح کی لفظ امامؑ نے اپنی وصیت میں بھی استعمال کی ہے اور دوسرے مقامات پر بھی استعمال کی ہے اور اصلاح کے حالات وتغیر وتبدل کا ذکر اپنے خطبوں میں بھی فرمایا ہے۔

امامؑ نے اس وصیت میں فرمایا ہے کہ میں تفریح کے لئے یا ہوا وہوس نفسانی کے لئے نہیں جارہاہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد ایک عام انسان کے لئے جب اسلام برداشت نہیں کرتا تو ہادی ورہنما اورعلمبردارحق وحقانیت امامؑ کے لئے کیسے برداشت کرے گا۔اورحق کا پیشوا بھی اس مقصد کے لئے اتنی بڑی قربانی کیوں دے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ظلم وفساد کے لئے بھی نہیں نکل رہا ہوں۔ امامؑ سے ظلم وفساد کا تصور بھی محال ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ میں امت جد کی اصلاح چاہتاہوں یعنی یہ امت جد خرافات میں کھوگئی ہے غلطیوں اور گناہوں میں ملوث ہے۔ احساس خطا اس کے درمیان سے ختم ہوگیا ہے دینی اقدار کو مٹا دیا گیاہے اور جاہلیت کی طرف الٹئے پیر لوٹ رہی ہے، پیغمبراسلام □ نے جو دین ودیانت کا ماحول اور مذہبی احکام کی پابندی کی فضا قائم کی تھی اس سے یہ لوگ بیگانہ ہوگئے ہیں۔ بعد رحلت مرسل اعظمؐ خود ساختہ مملوکیت اورسقیفہ ساز حکومت کی زیرسرپرستی جو حالات پیدا ہوئے تھے اس کی تصویر شاعر نے اس طرح پیش کی ہے۔

اہل دل سے کہہ رہی ہے یہ مورّخ کی زباں
بعد پیغمبرؐ ہوئی تھیں کس طرح سرگوشیاں
چھا گیا تھا ہر طرف کس طرح دولت کا دھواں
کیا دبے پاؤں چلے تھے سازشوں کے کارواں

اب بھی ان امواج میں ڈوبی ہوئی ہے کربلا
ہاں اسی کی ایک تاریخی کڑی ہے کربلا ۷ ؎

امام حسینؑ نے اس ماحول اور فضا کو واپس لانے اور امن وآشتی کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے انقلاب مع اصلاح کا طریقۂ کار اپنایا۔ یہ اصلاح اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کیا جائے اور یہ حق اس شخصیت کو ہوتا ہے۔ جو خود او امر و نواہی کو با قاعدہ پہچانتا ہو۔ امامؑ سے زیادہ اس کا جاننے والا کون ہوسکتا ہے اس کا اظہار آپ نے میدان کربلا میں قوم یزید کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا ''کیا میں نے کسی حلال محمد □ کو حرام اور حرام محمدؐ کو حلال کیا ہے تو مجمع بیک زبان کہہ رہا تھا آپ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہے، یہ اقرار دلیل ہے کہ قوم یزید امام حسینؑ سے برسرِ پیکار ضرور تھی لیکن ان کے کردار وسیرت کی طہارت دشمن سے بھی خراج عقیدت حاصل کر رہی تھی۔

امامؑ نے یہ بھی فرمایا کہ'' میں اپنے جدّ پدر بزرگوار کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں اور اسی سیرت پر امّتِ رسولؐ کو بھی چلانا چاہتا ہوں۔'' پیغمبر اسلام □ کی بعثت کا مقصد اور ان کا انقلابی پیغام قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے'' وہ وہ خدا ہے جس نے مکہ والوں میں ایک رسولؐ کو بھیجا جو آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے۔ تزکیۂ نفس اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے ذریعہ اصلاح کرتا ہے جبکہ وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے یعنی جب گمراہی اپنے سرطانی پنجوں کو پھیلانے والا شیطانی فریب حیات کے رگ وریشہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو الٰہی رہبر کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں گمراہی کے اندھیرے سے نکالے اور ہدایت واصلاح کی روشنی میں لائے اور یہ کام تلاوت کلام الٰہی تزکیہ نفوس اور کتاب وحکمت کی تعلیم سے ممکن ہے، چنانچہ امام حسینؑ نے ان تینوں ذرائع کو واقعہ کربلا میں استعمال کیا۔ اپنے خطبوں کے ذریعہ مختلف وقتوں میں کتاب الٰہی اور حکمت کی تعلیم دی۔ اپنے عمل وکردار سے لوگوں کا تزکیۂ نفس کیا۔ حرجیسا یزید ی فوجی اپنے نفس کی گندگی کو نکال کر یزیدی لشکر کی غلاظت سے دور ہوکر طیب وطاہر الٰہی فوج میں شامل ہوگیا۔ نیز امامؑ نے تلاوت کلام الٰہی کے ذریعہ دین وضمیر کے جمود اور خمود کو توڑ کر بیداری کی نورانی فضا پیدا کی اس طرح سیرت جدو پدر پر چلتے ہوئے امت جد کی اصلاح کی راہ کو مستحکم کردیا۔

اس وصیت میں امامؑ نے یہ بھی فرمایا کہ جو مجھے حق کی خاطر قبول کرے گا تو خدا ہمیشہ سے

حق کا مددگار ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امامؑ نے حق کی خاطر انقلاب واصلاح کی آواز بلند کی۔ اس کی راہ میں خود اور ساتھیوں کے ساتھ جہاد کیا اور قربان دیکر یقینی بنادیا کہ جو مالک حقیقی خدا حق کا مددگار ہوتا ہے وہی قربانیوں کو زندہ بھی رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ جب خدا مددگار ہوگا تو اسے بہر حال کامیابی ملے گی۔

حق پوشی، حق کشی، باطل پرستی اور باطل نوازی کا جوطوفان سر بعد حیات مرسل اعظم بلند ہوا تھااور جس کی داغ بیل سقیفہ میں رکھی گئی تھی۔ وہ کربلا تک آتے آتے یزید کی شکل وصورت اختیار کرگیا تھا۔جس کے لئے بند باندھنا اور انقلاب واصلاح کی حکمت عملی سے رکاوٹ پیدا کرنا لازمی تھا ورنہ خدا کا بھیجا ہوا، نبیؐ کا پہونچایا ہوا اور علیؑ کا بچایا ہوااسلام نیست ونابود ہوجاتا ہے اسے حیات دوام امام حسینؑ کے انقلابی اور اصلاحی عمل نے عطا کردی۔

امام حسینؑ بیعت یزید سے انکار کرنے میں بھی سیرت جدوپدر پر گامزن تھے اور اس کا اقرار دشمن کی زبان سے لیا ہے۔طبری نے نقل کیا ہے کہ'' حسینؑ یزید کی بیعت کبھی نہ کریں گے کیونکہ ان کے پہلو میں ان کے باپ کا نفس ہے۔ اس انداز پر امامؑ نے اپنی سیرت و کردار کی حفاظت کے ساتھ جد واب کی سیرت کا بھی تحفظ کیا ہے۔''

امام حسینؑ نے مقصدِ جہاد وانقلاب کولشکرِحُر سے یوں بیان فرمایا ہے جس میں فوج یزید اور اس کے عزائم کا بھی پتہ دیا ہے لوگو! رسول اکرم □ نے ارشادفرمایا ہے کہ'' اگر کسی ظالم حکمراں کو اس حال میں دیکھو کہ وہ محرمات الٰہی کو حلال کرتا ہے ،اللہ کے عہد کو توڑتا ہے ،سنت رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے اور اللہ کے بندوں پر زیادتی کرتاہےتو ان حالات میں اپنی آواز یا عمل کے ذریعہ جو اس کو نہ روکےتو وہ اسی ظالم کی طرح مستحق عذاب ہے۔لوگو! ان (بنی امیہ) لوگوں نے شیطان کی اطاعت کی، رحمان کی نافرمانی کی، فساد اور فتنہ میں پڑگئے ،اسلامی حدود وتعزیرات کومعطل کیا، بیت المال کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور حرام الٰہی کو حلال اور حلال کوحرام کردیا، اسلامی حکومت کی سربراہی کے لئے میں ایسے لوگوں سے زیادہ سزاوار ہوں اور میرے پاس تمہارے خطوط اور بیعت کا پیغام تمہارے نمائندے لائے ہیں اورتم نے یہ عہد کیا ہے کہ مجھ سے ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے، عہد نہیں توڑو گے، اگر تم نے اس کو پورا کیا تو ہدایت پاؤ گے کیونکہ میں حسین ابن علیؑ ہوں رسول خدا□ کی بیٹی فاطمہؑ کا فرزند ہوں، میں تمہارے دکھ درد میں شریک رہوں گا اور میرے اہلبیتؑ تمہارے بال بچوں کے ساتھ

شریک رہیں گے۔ اگر تم نے بیعت شکنی کی تو مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم نے میرے پدر بزرگوار، میرے بھائی اور میرے ابن عم مسلم بن عقیل کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اس شخص نے دھوکہ کھایا جس نے تمہارے وعدوں پر اعتبار کیا۔ تم نے خود کو بدبخت بنالیا ہے۔ تمہاری تقدیر ہی بری ہے جو عہد شکنی کرتا ہے اس کی سزا خود بھگتنا پڑتی ہے۔'' ۸؎

خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر تمام تاریخی بیانات کو یکجا کرکے تنقید، تنقیح وتحلیل وتجزیہ کردیا جائے تو انقلاب امام حسینؑ کے اسباب کو حکومت وقت کے انحراف، دینی اقدار کی پامالی، انسانیت سوزی، عوامی استحصال، اخلاقی گراوٹ، جرائم وجنایات کی فراوانی ماناجاسکتا ہے۔ جن سے معاشرہ کے افراد پریشان ہوکر ختم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کیلئے ایثار وقربانی کی ضرورت تھی جس کیلئے آمادہ ہونا سب کے بس میں نہ تھا۔ مگر امام حسینؑ نے ہر طرح کی قربانی دیکر انقلاب برپا کیا اور اس میں اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ آج تک ہر سچے اور صحیح انقلاب کے پیچھے کربلا کا واقعہ ہی ہوتا ہے اسی سے سبق حاصل کیا جاتا ہے۔ ائمہ معصومینؑ نے امام حسینؑ کی کامیابی کا اعلان دعاؤں اور زیارتوں میں فرمایا ہے۔

امام حسینؑ کا اصلاحی انقلاب کامیاب رہا:

ائمہ معصومینؑ نے جو زیارتیں سید الشہداء امام حسینؑ کی پڑھی ہیں جنہیں علماء ومحدثین نے نقل کیا ہے ان سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ امامؑ انقلاب کے تطہیری اور اصلاحی عمل میں مکمل طور پر کامیاب رہے فوجی اسلامی اصول وقوانین کا تحفظ کرکے رائج ونافذ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں قائم ودائم بنادیا، مسجدوں سے آواز اذان کا بلند ہونا، نمازوں کی پابندی، اصول وفروع کا مداح کامیابی کی دلیل ہے۔ کامیابی تو در اصل مقصد کی کامیابی ہوتی ہے چاہے اس کی راہ میں بہت کچھ کھونا پڑے۔

زیارات میں کامیابی کا تذکرہ اس طرح آیا ہے۔

۱۔ شیخ عباس قمی نے سیر بن طاؤس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصباح الزائرین میں ایک زیارت کے ضمن میں امامؑ کی فتحیابی کا اعلان اس طرح فرمایا ہے۔

''پروردگار رحمت نازل فرما۔ میرے مولا اور سردار پر، انہوں نے تیری اطاعت پر عمل کیا، تیری معصیت سے روکا، تیری رضامندی حاصل کی۔۔۔ وہ بندوں کو تیری طرف دعوت دیتے ہیں، ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ تیرے روبرو کھڑے رہے۔ ظلم کی دیوار کو درشتگی سے گراتے رہے۔ کتاب

کے ذریعہ سنت کا احیاء کرتے رہے۔ تیری راہ میں منافقین وکفار سے جہاد کرتے رہے۔'' ۹۔

۲۔اسی کتاب کے ص۴۲۱ پر درج ہے۔

''سلام آپ پر اے ابوعبد اللہ۔ میں گواہی دیتاہوں کہ آپ نے نماز قائم کی، زکوٰۃ دی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور اپنے رب کی سبیل کی جانب حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ذریعہ دعوت دی۔''

۳۔نیزص۴۳۷ پر یوں تحریر ہے۔

''میں گواہی دیتاہوں کہ آپ نے قسط وعدل کا حکم دیا اور اس کی جانب دعوت دی۔ آپ صادق وصدیق ہیں۔ اپنی دعوت میں آپ زمین میں اللہ کا انتقام ہیں۔''

۴۔مذکورہ کتاب کے ص۴۴۰ پر درج ہے۔

''میں گواہی دیتاہوں کہ آپ کو قتل کیا گیا موت نہیں آئی بلکہ آپ کی حیات کی امید میں شیعوں کے قلوب زندہ ہیں اور آپ کے نور کی ضیاء سے ہدایت حاصل کررہے ہیں۔''

۵۔ص۴۴۵ پر یوں درج ہے۔

''میں گواہی دیتاہوں کہ آپ دین کا ستون، مسلمانوں کے رکن مومنین کی پناہ گاہ ہیں۔ میں گواہی دیتاہوں کہ آپ نے اپنا خون راہ خدا میں دیدیا یہاں تک کہ بندوں کو جہالت کے اندھیرے اور گمراہی کی حیرانی سے نجات دلائی۔''

حوالے:

۱۔انسانیت الاشراف، بلاذری ۴/قسم دوم/۱،تاریخ العرب ۲/۲۵۸،سمو المعنی فی سمو الذات ،ص۵۹

۲۔الدامۃ والسیاسۃ ،ابن قتیبہ دینوری، ج۱،ص۱۹۵،۱۹۶

۳۔اعیان الشیعہ ، ج ۴/حصہ اوّل/ ۱۸۳، ۱۸۴

۴۔سورۂ بقرہ،آیت ۷

۵۔طبری، ۴/۳۰۹،۳۱۰

۶۔مقتل العوالم،ص۵۴،لہوف،ص۳۴،مقتل نوارزی،ص۲۲۵،منتہی الآمال،قمی ، ج۱

۷۔جوش ملیح آبادی

۸۔الطبری، ج ۴/ ۳۰۴، الکامل، ۳/ ۲۸۰ ، اعیان الشیعہ ، ۴/۲۲۸

۹۔مفاتیح الجنان ،ص۴۱۲،مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

قیام امام حسینؑ سے متعلق
چند سوالات اور ان کے جوابات

نعمت اللہ صفری فروشانی

کربلا کے ریگستان میں دین مبین اسلام کی بقا کی خاطر حسینؑ مظلوم نے اپنے اعزہ واقربا اور اصحاب واحباب کے ہمراہ ایسے مظالم کا سامنا کیا جس کی مثال تاریخ بشریت میں نہیں ملتی۔ ان کی درد ناک شہادت کو تقریباً چودہ سو سال گزر چکے لیکن اسلام دشمن طاقتوں کے زرخرید غلام واقعہ کربلا کے سلسلے میں آج بھی اکثر ایسے سوالات کرتے رہتے ہیں جن کے ذریعہ وہ اس ہمیشہ باقی رہنے والی تحریک کو کمزور بنا سکیں۔ ذیل میں ایسے کچھ سوالات اور ان کے جوابات حاضر خدمت ہیں۔ (ادارہ)

حاکم شام کے زمانے میں قیام نہ کرنا

سوال: ۱۔امام حسینؑ نے حاکم شام کے زمانے میں ہی کیوں یہ اقدام نہیں کیا؟

امام حسینؑ کو (۴۹ـ۶۰ھ) گیارہ سال کی مدت امامت میں حکومت شام کی طرف سے متعدد مسائل کا سامنا رہا جن میں سے اکثر کو امام حسینؑ کے خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امام حسینؑ نے اپنی تحریروں میں حاکم شام کی بعض زیادتیوں کا ذکر فرمایا ہے جس میں حجر بن عدی اور عمرو بن حمق جیسے بزرگ محبان علیؑ کا قتل شامل ہے تاہم آپ نے حاکم شام کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے بہت بڑا فتنہ قرار دیا ہے[۱]، جس کے مدنظر حکومت کے قانونی جواز پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ امام حسینؑ نے حاکم شام کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کو بہترین عمل اور اس کے ترک کو موجب استغفار جانا ہے[۲]۔

سوال یہ ہے کہ خود امام حسینؑ نے کیوں حاکم شام کے خلاف تحریک کا آغاز نہیں کیا؟ اس کی بعض علتوں کو امامؑ کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس کی مزید علتوں کو جاننے کے لئے تاریخ کا تجزیہ ناگزیر ہے:

D:Rah.Imam Husain,-224,2013.

ا۔ صلح نامہ

امام حسینؑ نے حاکم شام کو لکھے گئے ایک خط میں خود کو اس صلح نامہ کا پابند بتایا ہے اور خود کو پیمان شکنی کے اتہام اور الزام سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے ۳؎۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حاکم شام نے کوفہ میں قدم رکھتے ہی ، جبکہ ابھی صلح نامہ کی تحریر خشک بھی نہیں ہوئی تھی اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور خود کو اس سے متعلق ہر قسم کی جوابدہی سے الگ کر لیا؟ ۴؎۔ ایسے میں امام حسینؑ کس طرح خود کو اسی صلح نامہ کا پابند قرار دے رہے ہیں جب کہ وہ فریق مقابل کی طرف سے اوائل میں ہی غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے!

اس سوال کے جواب کو الگ الگ زاویوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے:

ا۔ اگر حاکم شام کی تحریر کو دیکھا جائے تو منقولہ عبارت سے صلح نامہ سے متعلق اس کی عہد شکنی صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتی بلکہ اس میں عبارت اس طرح ہے: ''**انی کنت منیت الحسن اشیاء و اعطیته اشیاء**'' میں نے حسنؑ سے کچھ چیزوں کا وعدہ کیا ہے ؛ ممکن ہے جن امور کے وعدہ کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ صلح نامہ کے مواد سے خارج ہوں اور حاکم شام خود کو اس کا پابند نہ قرار دیتا ہو چنانچہ وہ خود کو صلح شکن نہیں گردانتا یا کم از کم خود کے عہد ناشکن ہونے کے دلائل پیش کر سکتا ہے۔

۲۔ پوری عالم بشریت کو امام حسینؑ اور حاکم شام کے مابین بنیادی فرق کو ماننا پڑیگا جیسا کہ حضرت علیؑ اور حاکم شام کی سیاسی شخصیت کے مابین بعد المشرقین دیکھا گیا ہے۔

بنیادی طور پر حاکم شام ایسے سیاسی افراد میں سے تھا جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے کسی بھی سیاہ وسفید کو انجام دینے سے دریغ نہیں کرتا تھا اس کی بیشتر مثالوں کو اس زمانے کے کوائف میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بالخصوص اس وقت جب وہ حضرت علیؑ کے مقابل کھڑا ہوا۔ قتل عثمان سے لیکر تحریک طلحہ و زبیر تک، نیزہ پر قرآن بلند کرانے سے لیکر حضرت علیؑ کے زیر اثر شہروں میں شب خون مارنے تک اور اس جیسی متعدد مثالیں ہیں جو اس کی دسیسہ کاریوں کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف امام حسینؑ الٰہی اقدار اور اصولی ضابطوں سے آراستہ شخصیت کے مالک تھے جو ظاہری کامیابی کے لئے ہر اقدام کو درست نہیں گردانتے ، جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا تھا ''**و لن اطلب النصر بالجور**'' میں ظلم کے سہارے کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ ۵؎۔ یہ اس گھرانہ کی اصول

نوازیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی سے کئے گئے عہد کو حاکم شام کی پیمان شکنیوں کے باوجود بھی نہیں توڑا۔

۳۔ زمانے کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے صلح نامہ کے تئیں امامؑ کے نقطہ نظر کے نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ حاکم شام اس وقت پورے اسلامی معاشرہ کا سربراہ تھا۔ اس کا دائرہ اثر جملہ اسلامی مملکتوں یعنی شام سے لیکر عراق ،حجاز سے لیکر یمن پر محیط تھا یہاں تک کہ مذکورہ تمام علاقوں میں اس کے کارندے اس کی حکومت کا شدت سے دفاع کررہے تھے۔

امام علیؑ کے مد مقابل رہتے ہوئے وہ عثمان تک اپنی امداد رسانی کی کوتاہیوں کو بھی چھپانے میں کامیاب رہا جو بعد میں ان کے قتل پر تمام ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے شامیوں کو خون عثمان کا اکیلا منتقم قرار دیا تو ظاہری بات ہے اس زمانے میں جب کوئی اس کے مد مقابل نہیں اور وہ کسی سے نبردآزما بھی نہیں ہے تو اس الزام کو عام کرنا کتنا آسان ہوگا کہ امام حسینؑ نے صلح نامہ پر پابند نہ رہتے ہوئے عہد شکنی کی ہے اور اس طرح پورا اسلامی معاشرہ اور ممالک کے افکار کو امام حسینؑ کے خلاف ، منحرف کیا جاسکتا تھا۔ ایسے میں صرف وہ آواز جو لوگوں کے کانوں تک نہ پہونچتی وہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی چیخ وپکار تھی۔

۲۔ حاکم شام کی حقیقی کیفیت

حاکم شام کی شخصیت اس زمانہ کے لوگوں بالخصوص شامیوں کے نزدیک ایک رخ سے قدرے مثبت شبیہ کی حامل تھی جو اس کے خلاف کسی بھی نہضت وتحریک کو دشوارتر بنائے دے رہا تھا۔ کیونکہ لوگ اس کو صحابی رسولؐ ، کاتب وحی ، زوجۂ رسولؐ کے بھائی کے طور پر دیکھتے تھے اور ان کی رو سے حاکم شام نے دمشق اور اس کے قرب وجوار میں اسلام کی ترویج واشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔

علاوہ ازیں، اس کا حکومتی تجربہ اور حسنین علیہما السلام سے سن میں زیادہ ہونا دو ایسے اسباب تھے (جس کا تذکرہ خود امام حسنؑ نے اپنے خطوط میں کیا ہے۶) جو امام حسینؑ کے مقابل،عوام الناس کو صاف اور واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

۳۔ حاکم شام کی سیاست

صلح کے عہدو پیمان کے بعد اگرچہ حاکم شام زیادہ تر اس فکر میں لگارہتا تھا کہ بنی ہاشم

بالخصوص خاندان علوی کو کوئی نہ کوئی گزند پہنچائی جائے چنانچہ امام حسنؑ کو زہر دیا جانا اسی سلسلہ کا حصہ تھا۔ ۷۔ البتہ وہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ اس خانوادہ بالخصوص امام حسینؑ کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہتا ہے اور ان کا پاس ولحاظ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں حاکم شام کی طرف سے بھیجے گئے ماہانہ وسالانہ ھدیوں کو دیکھا جاسکتا ہے جو وہ امام حسینؑ اور عبد اللہ ابن جعفر کے لئے بھیجتا تھا۔ چونکہ اہل بیت رسولؐ خود کو بیت المال کے لئے سزاوار تر اور اس کے مصارف کو بہتر انداز میں جانتے تھے لہٰذا اسے قبول بھی کر لیتے تھے۔ ۸۔

حاکم شام کا ظاہری برتاؤ اس کی موت کے وقت بھی دکھائی پڑتا ہے۔ جب اس نے اپنے بیٹے یزید سے امام حسینؑ کی طرف سے کئے جانے والے ممکنہ اقدامات کے لئے کہا کہ اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں قتل نہ کرنا۔ ۹۔

اس سیاست عملی کو اختیار کرنے کی وجہ روشن تھی۔ حاکم شام امام حسنؑ سے صلح کر کے ظاہری طور پر اپنی حکومت کو شرعی حیثیت دینے میں کامیاب رہا اور اس نے لوگوں میں خود کو قانونی طور پر ایک خلیفہ کے عنوان سے پہچنوایا چنانچہ اس وقت اس نے اپنے دامن کو خون امامؑ سے داغدار ہونے سے بچالیا تا کہ اسلامی معاشرہ میں خود کو منفور ہونے سے محفوظ رکھے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اس کے برعکس خود کو اس خاندان سے زیادہ سے زیادہ نزدیک ظاہر کرنے کی کوشش کی تا کہ عوام میں اپنے چہرہ کو مزید مثبت انداز میں پیش کر سکے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اپنی اس سیاست عملی کے ذریعہ بزعم خود کسی بھی ممکنہ تحریک کو بے اثر کر دینا چاہتا تھا، امام حسنؑ وامام حسینؑ کو دئے گئے ہدیوں پر ناز کرتے ہوئے انہیں اپنا قرضدار سمجھتا تھا جیسا کہ ایک جگہ اس نے خود کو کہا ہے: ''یہ مال لے لیجئے اور جان لیں کہ میں ہند کا بیٹا ہوں، خدا کی قسم نہ اس سے قبل یہ مال کسی نے کسی کو دیا تھا اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کسی کو دے گا''۔

امام حسینؑ نے یہ بتاتے ہوئے کہ حاکم شام کی یہ عطاو بخشش موجب امتنان نہیں ہوسکتی فرمایا: ''خدا کی قسم نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے بعد کسی نے دو ایسے افراد کو کچھ دیا ہوگا جو ہم دونوں سے زیادہ بافضل وشرف رہا ہو''۔ ۱۰۔

علاوہ ازیں، حاکم شام جانتا تھا کہ جارحانہ روش اختیار کرنے سے خود اسی کا نقصان ہوگا اور لوگوں کی توجہ اس خانوادہ کی طرف زیادہ ہوجائے گی اور پھر لوگ اس کی حکومت سے متنفر

ہوجائیں گے اور جوق در جوق اس خانوادہ کے اردگرد جمع ہونے لگیں گے۔ گوکہ حاکم شام کو امام حسینؑ کی طرف سے اس زمانے کے حالات کے پیش نظر کوئی سنگین خطرہ لاحق نہیں تھا چنانچہ وہ اس فکر میں تھا کہ ممکنہ خطرہ ہمیشہ کے لئے بے اثر کردیا جائے پھر بھی امام حسینؑ ہر موقع پر حکومت شام کی عیاریوں کو بے نقاب کررہے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال امام حسینؑ کا حاکم شام کو خط لکھنا اور اس میں اسے اسکی ظلم و زیادتیوں ۱۱؎ سے باخبر کرنا ہے نیز یزید کی ولیعہدی کے مسئلہ پر سوال اٹھانا ہے۔ ۱۲؎ حالانکہ امامؑ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اس وقت حاکم شام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی صورت میں بالخصوص حاکم شام کی اس وقت کی سیاست کے پیش نظر، عوام فوری طور پر ان کی حمایت نہیں کریں گے اور حکومتی پروپگنڈہ مشینری حالات کا رخ، حاکم کے حق میں موڑ لے گی۔

۴۔ اقتضائے حال

باوجوداس کے کہ امام حسنؑ کی شہادت کے فوراً بعد کوفیوں نے امام حسینؑ کو خط لکھا اور اس میں اظہار تعزیت کے ساتھ ساتھ خود کو آپ کے حکم کا منتظر قرار دیا۔ ۱۳؎ لیکن امام خوب جانتے تھے کہ شامی حکومت کی مرکزیت اور استحکام کی ظاہری مثبت شبیہ کسی بھی قیام کے نتیجہ کو فوری طور پر ثمرآور نہیں ہونے دے گی اور سوائے چند افراد کے قتل اور خود کے شہید ہونے نیز ایسی حکومت کے خلاف جو بظاہر اسلامی ہے باغی کہلانے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جبکہ حکومت یزید کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے وقت، صورت حال بالکل مختلف تھی۔

مدینہ سے ہی تحریک کی شروعات نہ کرنے کے اسباب

سوال ۲: امام حسینؑ نے مدینہ ہی میں کیوں اپنی تحریک کا اعلان نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب، حالات اور جگہ کے دقیق مطالعہ میں مضمر ہے۔ حالات کے اعتبار سے ابھی مدینہ میں امیر شام کی موت کا عمومی اعلان نہیں ہوا تھا اور عوام الناس کو ابھی بھی امیر شام اور اس کے بیٹے کی حکومت کے مابین فاصلہ زمانی کا علم نہیں تھا چنانچہ باوجود اس کے کہ یزید کا چہرہ امام حسینؑ، عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر، عبدالرحمن ابن ابی بکر وغیرہ کے لئے ایک شراب خور اور کتوں و بندروں سے کھیلنے والے کی حیثیت سے آشکارا تھا ۱۴؎۔ لیکن اکثر عوام الناس حاکم شام کی کوششوں اور اس کے پروپگنڈہ نیز لالچ اور خوف کی بنا پر حاکم شام کے ہی زمانے میں اس کے بیٹے

کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے تھے ۱۵؎۔

جگہ کے لحاظ سے ، مدینہ، سرکار سید الشہدا کے لئے مناسب مقام نہیں تھا کیونکہ :

۱۔ باوجود اس کے کہ مذہب کے اکثر لوگ بالخصوص انصار، اہل بیت رسولؐ کے دلدادہ تھے مگر ان کی محبتیں اس حد تک نہیں تھیں کہ وہ اپنی جان کو اہل بیتؑ پر قربان کر دیتے جیسا کہ واقعہ سقیفہ کے دوران دیکھا جاسکتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جب حضرت علیؑ نے بیعت توڑ دینے والوں کے خلاف مقابلہ کے لئے اہل مدینہ سے مدد طلب کی تو ان میں سے اکثر نے جواب ہی نہیں دیا اور حضرت علیؑ کو چارسو۱۶؎ یا بروایت دیگر سات سو۱۷؎ افراد کے ساتھ ان کے مقابلہ پر جانا پڑا۔

۲۔ مدینہ والے رحلت پیغمبرؐ کے بعد خود کو حکومت کا تابع گردانتے تھے اور سیرت شیخین کی پیروی کو لیکر بہت حساس تھے چنانچہ عبد الرحمن بن عوف نے جو اس گروہ کے نمائندے تھے شوریٰ کے سامنے حضرت علیؑ کو حکومت سونپنے کے لئے سیرت شیخین کے اتباع کو بنیادی شرط کے طور پر پیش کیا تھا جسے حضرت علیؑ نے قبول نہیں کیا۔۱۸؎ حضرت علیؑ تک خلافت کو پہنچنے میں بھی اہالی مدینہ کا کلیدی رول نہیں تھا بلکہ اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں ساکن مہاجرین نے اس میں اہم کردار نبھایا تھا۔

۳۔قبیلہ قریش کے خاصے لوگ بالخصوص اموی ذہنیت رکھنے والے مروان جیسے افراد اس زمانہ میں ہی مدینہ میں صاحب اثر لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور یہ فطری تھا کہ وہ امام کی کسی بھی تحریک کی فی الفور مخالفت کرتے۔

۴۔ مدینہ کی آبادی اس زمانہ میں اتنی نہیں تھی کہ کسی تحریک کی تشکیل میں بہت زیادہ ان پر تکیہ کیا جاسکتا بالخصوص کوفہ، بصرہ وشام جیسے دوسرے بڑے شہروں کے مقابل اس کی آبادی بہت کم تھی۔

۵۔ تاریخ گواہ ہے کہ مدینہ کبھی بھی کسی بھی دور کی مرکزی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے مناسب مقام نہیں رہا ہے۔جیسا کہ ۶۳ھ میں اہل مدینہ نے یزید کی حکومت کے خلاف (واقعہ حرہ) قیام کیا جو ان کی شکست پر تمام ہوا۔ ۱۹؎ اسی طرح محمد ابن عبد اللہ کا قیام جو نفس زکیہ کے نام سے معروف تھے، انہوں نے ۱۴۵ھ میں قیام کیا۔۲۰؎ ۱۶۹ھ میں حسین بن علی موسوم بہ شہید فخ کا قیام جس میں اہل مدینہ نے ذرا ساتھ دیا مگر وہ بھی شکست پر تمام ہوا۔۲۱؎

۶۔ اموی دور میں اہل مدینہ کے سوابق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اموی حکومت کے مقابل خاندان اہل بیتؑ کا دفاع کرنے کے لئے بہت سنجیدہ نہیں تھے کیونکہ برسوں سے چل رہے

حاکم شام کے ذریعہ حضرت علیؑ پر سب وشتم کے سلسلے اوراموی حاکموں کے ذریعہ منبروں سے مغلظات کے کذب محض کوجاننے کے باوجود ایسا بہت کم دیکھا گیا کہ اہل مدینہ نے کبھی کوئی سنجیدہ اعتراض درج کرایا ہو، اس زمانہ میں بھی خود خاندان رسالتؐ آپ ہی اس کے مقابل پیش پیش تھا اس سلسلے میں امام حسینؑ کی کوششیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کی مدد کرنے کوئی نہ اٹھا ہے۔ ۲۲۔

۷۔ اموی حاکم ولید بن عتبہ، شہرکو پوری طرح اپنے کنٹرول میں لئے تھا اور ایسا نہیں تھا کہ بآسانی کسی بھی تحریک کے نتیجہ میں زمام حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی اورکوئی دوسرا ہتھیا لیتا۔

مکہ کی طرف ہجرت

سوال ۳: امام حسینؑ اپنے آغاز سفر میں مدینہ سے مکہ کی طرف کیوں تشریف لے گئے؟

امام حسینؑ کا مدینہ سے نکلنے کا سبب یہ تھا کہ یزید نے ولید ابن عتبہ کو لکھے اپنے خط میں اس بات پر تاکید کی تھی کہ چند لوگوں سے جن میں امام حسینؑ بھی شامل ہیں ضرور بیعت لی جائے اور بغیر اس کے جانے نہ دیا جائے۔ ۲۳۔

ولید اپنی امن پسند روش کو اپنائے ہوئے خود کو خون امام حسینؑ سے[illegible]ط رکھنا چاہتا تھا۔ ۲۴۔ لیکن مدینہ میں اموی عناصر بالخصوص مروان بن حکم جیسے افراد بھی موجود تھے جنہیں ولید اپنا مشیر خاص سمجھتا تھا۔ ان جیسے افراد کی خواہش یہ تھی کہ امام حسینؑ کا خون بہتا ہے تو بہہ جائے مگر ان سے بیعت ضرور لی جائے چنانچہ حاکم کا خط ملتے ہی جب ولید نے مروان سے مشورہ کیا تو مروان نے کہا: میرے لحاظ سے ابھی فوراً اس پر عمل درآمد ہونا چاہئے اور ابھی نمائندوں کو بھیج کے ان چند لوگوں سے بیعت لے لینا چاہئے اوراگر مخالفت کریں تو اس سے پہلے کہ حاکم شام کی موت کی خبر سے مطلع ہوں ان کا سرتن سے جدا کردے، کیونکہ اگر انہیں معاویہ کی موت کی خبر معلوم ہوگئی تو ان میں کا ہر ایک مخالفت پر آمادہ ہوجائے گا اور لوگوں کو بھی اپنی طرف بلانے لگے گا۔ ۲۵۔

چنانچہ امام حسینؑ نے مدینہ کی فضا کو مخالفت اورتحریک کے لئے سازگار نہ جانتے ہوئے اپنی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالا اور اسے ترک کرنے کا عزم کرلیا تاہم مدینہ چھوڑتے وقت جس آیت کی تلاوت فرمائی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے اس شہرکو غی[illegible]ط جان کر چھوڑ دیا۔

ابومخنف کے مطابق امام حسینؑ نے ۲۷/یا ۲۸ رجب کی شب اپنے خاندان کے کچھ لوگوں کے

ہمراہ اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے مدینہ چھوڑا جو جناب موسیٰ نے مصر چھوڑتے وقت کی تھی:۲۶۔

فخرج منہا خائفایترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین۔۲۷۔

موسیٰ شہر سے خارج ہوئے اس حال میں کہ وہ خوفزدہ تھے اور انہیں ہر آن کسی حادثہ کا اندیشہ تھا،عرض کی پروردگارا مجھے ظالم قوم سے نجات دے۔

آپؑ نے مکہ کا انتخاب اس وقت کیا جب کہ ابھی مختلف شہر کے لوگ مرگ معاویہ سے بے خبر تھے اور لوگ ابھی باقاعدہ یزید کی مخالفت میں سامنے نہیں آئے تھے۔ ابھی امام حسینؑ کو کوفہ اور دیگر شہروں کی طرف سے دعوت نامے نہیں موصول ہوئے تھے چنانچہ امامؑ کو ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں آپ آزادانہ طور پر اپنے نظریات کو بیان کرسکیں ، دوسرے یہ کہ آپ ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے آپ اپنے نظریات کو پوری اسلامی مملکت تک پہنچا سکیں اور بہرحال شہر مکہ میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں کیونکہ آیۂ قرآنی کی رو سے ''**ومن دخلہ کان امنا**'' ۲۸۔ ہے مکہ، حرم امن الٰہی تھا اور اس کے علاوہ پوری دنیائے اسلام کی آماجگاہ ہے۔ امام حسینؑ دنیائے اسلام کے مختلف گروہوں سے ملاقات کرکے اموی نظام کے تئیں اپنے اعتراض کو دوسروں تک پہنچا سکتے تھے،یعنی اسلامی تعلیمات سے آشکار کراسکتے تھے علاوہ ازیں، اہل کوفہ واہل بصرہ ۲۹۔ سے بھی یہاں پر رابطہ کرنا آسان تھا۔

امام حسینؑ ، شب جمعہ،۳/شعبان ۶۰ھ کو وارد مکہ ہوئے اور ۸/ ذی الحجہ تک اسی شہر میں مصروف تھے۔ ۳۰۔

مکہ سے روانگی

سوال ۴۔ امام حسینؑ نے اپنے حج کو نامکمل چھوڑتے ہوئے اعمال حج کی شروعات کے دوران مکہ کو کیوں ترک کردیا؟

اس سے قبل کہ ہم اس سوال کا تجزیہ کریں یہ بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا قطعاً درست نہیں ہے کہ امام حسینؑ نے حج کو نامکمل چھوڑ دیا کیونکہ امام نے ۸/ ذی الحجہ یوم الترویہ کے روز مکہ چھوڑ دیا ہے۳۱۔ جبکہ اعمال حج کی شروعات شب نہم ذی الحجہ سے ہوتی ہے جس کے لئے مکہ میں احرام باندھا جاتا ہے اور عرفات میں وقوف ہوتاہے لہٰذا امام علیہ السلام نے قاعدتاً حج شروع ہی نہیں

کیا تو ادھورا چھوڑنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے:

ہاں یہ درست ہے کہ امام نے وارد مکہ ہونے کے بعد عمرہ مفردہ انجام دیا اور بہت ممکن ہے مکہ میں اپنے قیام کے دوران مختلف اوقات میں اعمال عمرہ بھی بجالائے ہوں لیکن اعمال عمرہ مفردہ کو اعمال حج نہیں قرار دیا جاسکتا۔اور بعض روایات میں امام کے ذریعے کیے گئے صرف ایک عمل عمرہ مفردہ کا ذکر ملتا ہے۔۳۱؎

البتہ یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کہ باوجود اس کے کہ امام نے مکہ کا انتخاب اپنے اعتراضات کو دوسروں تک پہونچانے کے لئے کیا تو پھر ایسا کیا ہوا کہ امام نے اس وقت مکہ چھوڑ دیا جب مکہ، عرفات، منیٰ لوگوں کے جم غفیر سے چھلک رہا تھا اور اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کا بہترین موقع تھا! امام کے اس فیصلہ کے پیچھے کارفرما علتوں کو مندرجہ ذیل اقتباسات میں تلاش کیا جاسکتا ہے:

۱۔جانی خطرہ کا امکان

امام حسینؑ کے بعض ان ارشادات اور جوابات سے معلوم ہوتا ہے جو آپ نے ان لوگوں کی گفتگو کے جواب میں بیان کئے جو حضرت کے مکہ چھوڑ دینے کے مخالف تھے، کہ امام حسینؑ مکہ میں مزید قیام کو اپنے جانی خطرے کے پیش نظر مناسب نہیں جانتے تھے جیسا کہ آپ نے ابن عباس کے جواب میں فرمایا: میں کچھ دور یا فاصلہ پر ماراجاؤں مجھے پسند ہے مگر مکہ میں قتل کیاجاؤں یہ مجھے بالکل گوارانہیں ہے۔۳۳؎

عبد اللہ بن زبیر کے جواب میں فرمایا: بخدا اگر مکہ کے ایک بالشت فاصلہ پر قتل کیاجاؤں مجھے پسند ہے مگر حدود مکہ میں خواہ وہ ایک بالشت ہی کیوں نہ ہو مجھے پسند نہیں ہوگا! بخدا اگر میں جانور کے گھونسلے میں بھی پناہ لے لوں یہ مجھے وہاں بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور جو یہ چاہتے ہیں وہ کرگذریں گے۔۳۴؎

امام اپنے بھائی محمد حنفیہ سے صریحی طور پر حدود بیت اللہ میں یزیدی پلان کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں۔۳۵؎ بعض تاریخی متون میں واضح طور پر درج ہے کہ یزید نے امام حسینؑ کوقتل کرنے کے لئے مسلح افراد کو مکہ بھیج دیا تھا۔۳۶؎

۲۔حرمت حرم کی پامالی

امام حسینؑ کے گذشتہ ارشادات کے علاوہ آپ کے فرامین میں اس کی تاکید بھی نظر آتی ہے

جس میں آپ نے حرم بیت اللہ کے احترام کی پامالی کے خدشہ کا اظہار فرمایا ہے اور کہا ہے کہ اگرچہ اس صورت میں گناہ، اموی ظالموں کے سرجائے گا مگر اس سے حدود بیت اللہ کے احترام کی پامالی ہوگی۔

امام حسینؑ نے یہ گفتگو عبد اللہ بن زبیر سے ملاقات کرکے فرمائی ہے؛ آپ نے ابن زبیر کے جواب میں فرمایا: ''**ان ابی حدثنی ان لھا کبشاً بہ تستحل حرمتھا فما احب ان اکون انا ذلک الکبش**''۔۳۷۔ میرے بابا علی نے مجھ سے نقل کیا ہے کہ مکہ میں ایک بھیڑ ہوگی جس کے سبب اس شہر کی حرمت پامال ہوگی اور میں نہیں چاہتا کہ اس کا مصداق قرار پاؤں۔

کوفہ کا انتخاب

سوال ۵۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے قیام کے لئے کوفہ کا انتخاب کیوں کیا؟

پوری تاریخ اسلام میں یہ سوال ہمیشہ سارے محققین اسلام کے لئے اپنی اپنی ظرفیت علمی کے مطابق اہمیت کا حامل رہا ہے اور ان کی اپنی فہم وادراک کے مطابق اس کے مندرجہ ذیل جوابات موصول ہوتے رہے ہیں:

ا۔ امام حسینؑ کو اپنی اس تحریک میں ظاہراً شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنیادی وجہ کوفہ کا انتخاب ہے۔

۲۔ اس زمانہ کی اہم شخصیتیں جیسے عبد اللہ بن جعفر (ہمسر حضرت زینب)۳۸۔ عبد اللہ بن عباس ۳۹۔ عبد اللہ بن مطیع ۴۰۔ مسور بن مخرمہ ۴۱۔ اور محمد بن حنفیہ ۴۲۔ کبھی اس حق میں نہیں تھیں کہ امام حسینؑ عراق اور کوفہ کا سفر اختیار کریں یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے کوفیوں کی غداریاں اور امام علیؑ کے ساتھ کیے گئے برتاؤ کو یاددلایا۔

لیکن امام نے ان تمام باتوں کے باوجود کہ جو بعد میں ظاہراً درست بھی ثابت ہوئیں اپنے مصمم ارادے کے پیش نظر کوفہ کا عزم کیا چنانچہ اس موقع پر بعض مورخین جیسے ابن خلدون نے بڑی صراحت کے ساتھ اس کو امام حسینؑ کی سیاسی غلطی سے تعبیر کیا ہے۔۴۳۔

چنانچہ اکابرین کی گفتگو سے لگتا ہے کوفہ کے علاوہ دیگر شہر بھی مقام انتخاب میں تھے جس میں یمن سرفہرست ہے، ابن عباس، امام حسینؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر آپ مکہ چھوڑنے پر آمادہ ہیں تو یمن تشریف لے جائیں کیونکہ وہاں کی وادیاں کشادہ اور قلعے مضبوط ہیں

وہاں سے آپ اپنے مبلغین کو مختلف مقامات پر بھیج سکتے ہیں۔ ۴۴۔

سوال یہ ہے کہ کیوں امام حسین علیہ السلام نے مذکورہ بالا صورت کو انتخاب نہیں کیا؟

اس سوال سے متعلق اکثر غیر شیعہ شخصیتوں اور مستشرقین نے اپنے مفروضات کے پیش نظر بڑی آسانی کے ساتھ امام حسینؑ کے اس فیصلہ کو غلط ٹھہرادیا۔

لیکن شیعہ علماء و محققین نے اپنے مبانی کلامی کے پیش نظر امام حسینؑ کے اس طرز عمل کی تحلیل کی ہے جس سے کچھ بنیادی نظریات ابھر کے سامنے آتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نظریہ شہادت

یہ نظریہ مندرجہ ذیل امور پر مبنی ہے:

(الف) شیعوں کا کوئی امام جب منصب امامت پر فائز ہوتا ہے تو اسے شہادت کے وقت تک کے الٰہی وظائف کا علم ہوتا ہے اور وہ اس بات پر پابند ہوتا ہے کہ اسی کے مطابق عمل کرے۔ ۴۵۔

(ب) امام حسین علیہ السلام نے اپنے وظائف پر نظر ڈالتے ہی یہ مشاہدہ کرلیا تھا: ''**قاتل فاقتل وتقتل واخرج باقوام للشهاده لاشهادة لهم الا معک**'' ۴۶۔ جنگ کرو، قتال کرو اور جان لو کہ تم بھی قتل کئے جاؤ گے، اپنے گروہ کے ہمراہ شہادت کے لئے اپنے دیار سے نکل جاؤ اور جان لو وہ صرف تمہارے ساتھ شہادت سے ہمکنار ہوں گے۔

چنانچہ ازل سے ہی مشیت الٰہی یہی تھی کہ امام حسینؑ شہید ہوں اور آپ کا عراق کی جانب سفر، اسی خواب کی تعبیر تھا جو آپ کو پیغمبرؐ کے ذریعہ ابلاغ کیا جاچکا تھا اور آپ نے اپنے بھائی محمد حنفیہ کے پوچھے جانے پر جواب دیا تھا: میں نے رسولؐ کو خواب میں دیکھا؛ آپ فرمارہے تھے: ''**یا حسین اخرج فان اللّٰہ قد شاء ان یراک قتیلا**''۔ ۴۷۔

مذکورہ نظریہ کے مطابق ۴۸۔ امام حسینؑ کا کوفہ کی طرف سفر، شہادت کی راہ میں اٹھایا گیا قدم تھا اور آپ کو اس کے انجام کی خبر تھی؛ یہ وہ خاص فریضہ تھا جو صرف امام حسینؑ سے مخصوص تھا اور دوسرے کسی امام کے لئے قابل تقلید نہیں تھا۔

البتہ، اس شہادت کے اہداف سے متعلق ارباب نظر کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے

اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو زندہ کرنے اور امام حسینؑ کے ذریعہ شجر اسلام کی آبیاری کرنے سے تعبیر کیا ہے؛ کیونکہ یہ خون اسلام کی سربلندی اور یزید کی رسوائی نیز بنی امیہ کے ۷۰ سال کے دور اقتدار کے خاتمہ پر جاکے تمام ہوا۔

بعض دوسرے غیر علمی نقطۂ نظر کے حامل افراد کے مطابق یہ شہادت امام حسینؑ کے چاہنے والوں کے گناہوں کا کفارہ تھی جیسا کہ عیسائی ، حضرت مسیحؑ کی وفات سے متعلق خیال رکھتے ہیں۔۴۹۔

نظریہ شہادت سے متعلق اہم اعتراض کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ امام حسینؑ سے متعلق خصوصیت سے اس فریضہ کی ادائیگی کا قائل ہونا دیگر ائمہ کو اس اسوہ کی قابلیت سے خارج کردیتا ہے درحالیکہ ہر وقت کے امام کا اپنے پیروکاروں کے لئے منزل اتباع اور نمونہ عمل کی حیثیت رکھنا لازمی ہے۔

۲۔مذکورہ بالانظریہ امام حسینؑ کے اس قول کی رو سے منافات کا حامل ہے جس میں آپ نے فرمایا:''**لکم فی اسوۃ**''۵۰۔ہم تمہارے لئے اسوہ حسنہ ہیں۔

۳۔درست ہے کہ شہادت امام حسینؑ سے متعلق ماقبل پیغمبروں بالخصوص پیغمبر اکرمؐ کی پیشین گوئیوں کو قبول کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ امام حسینؑ کا خود بھی اپنی شہادت سے باخبر ہونا ثابت ہے لیکن کسی بھی منطق کے سہارے ، شہادت کو امام حسینؑ کی تحریک کا ہدف محض نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ آپ کے اقدام کے اغراض و مقاصد کو آپ ہی کی تحریر کے مطابق یعنی آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھے گئے وصیت نامہ میں تلاش کرنا چاہئے:''**وانما خرجت لطلب الاصلاح فی امۃ جدی ارید ان امر بالمعروف وانھی عن المنکر واسیر بسیرۃ جدی وابی علی بن ابی طالب**''۔۵۱۔

مدنظر عبارت سے تین اہداف قیام امام حسینؑ سمجھ میں آتے ہیں: اصلاح امت پیغمبرؐ، احیائے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور سیرت پیغمبروعلیؑ پر عمل اور اس کا احیاء، اس میں کہیں شہادت کو تحریک کا مقصد نہیں قرار دیا گیا۔

۲۔حکومت اسلامی کی تشکیل کا نظریہ

بعض صاحبان قلم کی تحریروں کے مطابق ۵۲۔ یہ نظریہ اوائل میں سید مرتضیٰ معروف بہ علم الہدیٰ (۳۵۵۔۴۳۶ھ) چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کے مابین رائج تھا۔ انہوں نے امام حسینؑ کے عازم کوفہ ہونے کے ذیل میں یوں تحریر فرمایا ہے: ہمارے آقا ومولا (ابا عبد اللہ الحسینؑ) اس وقت تک حکومت کے لئے کوفہ کی سمت نہیں نکلے جب تک انہیں اقوام کی جانب سے کامیابی کا یقین نہیں ہوگیا۔ ۵۳۔ واضح رہے کہ یہ نظریہ سید مرتضیٰ کے بعد زیادہ رواج نہ پاسکا بلکہ شیخ طوسی، سید ابن طاوس، علامہ مجلسی اور بیشتر علمائے مشاہیر نے اسکی شدید مخالفت کی۔ ۵۴۔

بعض ماہرین نے ایک بار پھر اس نظریہ کی بیخ کنی کی اور مناسب جوابدہی کی غرض سے تاریخ کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ مستشرقین کو مطمئن کیا جاسکے؛ غور طلب ہے کہ شہید مطہری اور ڈاکٹر علی شریعتی جیسے افراد نے بھی اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔ ۵۵۔ اس نظریہ کا بنیادی سقم، امام وقت کے علم غیب پر دسترسی کو نظر انداز کرنا ہے۔ البتہ اصل نظریہ تشکیل حکومت اسلامی جو کہ یزید کے خلاف امام کے قیام پر منحصر تھا اور یہ بغیر اس کے نظام کی رسوائی و زوال پذیری کے ممکن نہیں تھا اسے امام خمینیؒ جیسے پایہ کے عالم دین کی بھی تائید حاصل ہے؛ آپ نے بارہا اپنے بیانات میں ایک صالح دینی حکومت کے قیام کو عاشورہ کے مقدس اہداف میں شمار کیا ہے۔ جن میں سے بعض کا سردست ذکر کیا جارہا ہے:

الف) امام خمینیؒ نے پہلی بار ۲۷/مئی ۱۹۷۱ئ کو نجف اشرف میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا: امام حسینؑ نے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ ان سے بیعت لے سکیں اور حکومت اسلامی تشکیل پاسکے اور اس زمانہ میں موجود فاسد حکومت کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ۵۶۔

ب) امام حسینؑ کا مکہ آنا اور مکہ سے باہر چلا جانا یہ ایک عظیم حکیمانہ عمل تھا۔ حضرت کے جملہ اقدامات، اسلامی حکمت وسیاست سے مملو تھے جو بعد میں بنی امیہ کے خاتمہ کا سبب بن گئے ورنہ اسلام نیست ونابود ہوگیا ہوتا۔ ۵۷۔

ج) امام حسینؑ حکومت ہی کے لئے نکلے تھے اسی لئے آپ نے قیام کیا تھا اور یہ بات قابل افتخار ہے، جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے لئے نہیں آئے تھے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ حکومتیں امام حسینؑ جیسی شخصیتوں کے ہاتھ میں ہی ہونا چاہئے۔ ۵۸۔ اس مسئلہ کے ثبوت کے طور پر مندرجہ ذیل دلائل کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔سب سے اہم دلیل امام حسینؑ کی گفتگو ہے جو تین اہم اہداف پر مشتمل ہے اوراسے مدینہ چھوڑتے وقت آپ نے تحریر فرمایا ہے۵۹۔ ظاہر سی بات ہے کہ بڑے پیمانے پر حکومت کے بغیر اصلاح نہیں کی جاسکتی باوجودیکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی بغیر حکومت کے کما حقہ رائج نہیں کیاجاسکتا۔سب سے اہم بات احیائے سیرت رسول خداؐ وحضرت علیؑ ہے جو ان دونوں بزرگوں کے طرز حکومت کی طرف نشاندہی کرتاہے اس طرح امام نے صالح حکومت اسلامی کی خواہش کا اعلان کیا ہے۔

۲۔کوفیوں کے خطوط کا طرز اور اس میں لشکر کی آمادگی اور ان کے درمیان امام کا نہ پایاجانا' اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ وہ یزیدی حکومت کو غیر قانونی جانتے ہیں اور امام حسینؑ سے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ وہ کوفہ تشریف لاکر امام کی حیثیت سے حکومت کریں چنانچہ امام نے بھی کوفیوں کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریک کا آغاز کیاہے۔ بطور مثال ایک خط کے کچھ اقتباس پیش ہیں جو کوفہ کے معروف محبان اہل بیتؑ سلمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجبہ اور حبیب ابن مظاہر کے ذریعہ لکھا گیا تھا:

''**انّه ليس علينا امام، فاقبل لعلّ اللّٰه ان يجمعنا بک علی الحق**'' ۶۰۔ ہمارا کوئی پیشوا نہیں ہے،آپ یہاں تشریف لے آیئے تاکہ خدا ہمیں آپ کے ذریعہ حق پر جمع کردے۔

۳۔ امام حسینؑ کا جناب مسلم کو کوفہ بھیجنا ، اہل کوفہ کے خطوط کا پہلا جواب تھا اور اس بات کا عکاس تھا کہ امام عالی مقام مسئلہ امامت اور تشکیل حکومت سے متعلق جوابدہ ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ امام نے مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجتے وقت اہل کوفہ کو خطاب کرتے ہوئے تحریر فرمایا: ''**وقد فهمت کل الذی اقتصصتم و ذکرتم و مقالة جلکم انّه ليس علينا امام فاقبل لعل اللّٰه ان يجمعنابک علی الهدی و الحق**'' ۶۱۔جو کچھ بھی تم لوگوں نے کہا وہ میں سمجھتا ہوں تمہاری سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمہارے پاس امام وپیشوا نہیں ہے۔۔۔)

مذکورہ خط کی رو سے امام نے اپنے کوفہ تشریف لے جانے کو مسلم کی تائید پر موقوف کیا تھا جیسا کہ متن خط سے ظاہر ہوتا ہے۔۶۲۔

۴۔امام حسینؑ کے خطوط اور آپ کے بیانات بھی اسی نظریہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام حسینؑ نے ان خطوط میں بیشتر امامت کے حکومتی وقابل نفاذ پہلوؤں کو بیان کیا ہے ، شریعت کے احکام کم بیان کئے ہیں درحالیکہ وہ بعض افراد کی رو سے امام کا اصل فریضہ

ہے۔

امام حسینؑ کے خط کے مضمون کا بقیہ حصہ اس طرح ہے:" **فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب و الآخذ بالقسط و الدائن بالحق و الحابس نفسه علی ذات اللّٰہ**"۔ ۶۳؎ قسم خدا کی صرف اسی کو امام کہلانے کا حق ہے جو کتاب خدا کا علم رکھتا ہو معاشرہ میں عدل وانصاف کو قائم کرسکتا ہو، حق پر عمل پیرا ہو اور تمام تر کوششوں کو اللہ کی راہ میں بروئے کار لاتا ہو۔

۵۔کوفہ میں جناب مسلم کی فعالیتوں کی نوعیت، جس میں لوگوں سے بیعت لینا شامل ہے جو خود اپنے آپ میں امام حسینؑ کی مدد ۶۴؎ اور بیعت کرنے والوں کے ناموں کو درج کرتا ہے۔ (جس کی تعداد ۱۲۰۰۰ سے ۱۸۰۰۰ تک بیان کی گئی ہے)۶۵؎ علاوہ ازیں، اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ امام حسینؑ کوفہ میں صالح دینی حکومت کو قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔

۶۔جن ایام میں کوفہ میں حضرت مسلم کے طرفدار بڑھتے چلے جارہے تھے اس زمانے میں بنی امیہ کے چاہنے والوں کی یزید کے ساتھ خط وکتابت سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر یہ صورت حال کچھ دنوں ایسی ہی رہی تو کوفہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مندرجہ ذیل عبارت انتہائی صراحت کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالتی ہے:

"**فان کان لک بالکوفه حاجة فابعث الیها رجلاً قویا ینفذ امرک ویعمل مثل عملک فی عدوک**"۶۶؎ اگر تمہیں کوفہ کی ضرورت ہے تو ایک مضبوط آدمی کو اپنی نیابت میں یہاں بھیجو کہ جو تمہارے حکم پر عمل درآمد کرائے اور تمہارے دشمنوں سے تمہاری طرح برتاؤ کرے۔

۷۔ جناب مسلم نے امام حسینؑ کو جس طرح کوفہ کے حالات سے آگاہ کیا وہ امام کے مقصد کی تائید اور اہل کوفہ کے ہر طرح مدد کے لئے تیار رہنے کی توثیق کرتا ہے جو سبب بنا کہ امام حسینؑ نے کوفہ کا رخ کرلیا۔ ۶۷؎ امام عالی مقام نے درمیان راہ، اہل کوفہ کو ایک خط لکھا اور اسے قیس بن مسہّر صیداوی کے ذریعہ روانہ کیا جس میں آپ نے جناب مسلم کے خط کی تائید کرتے ہوئے ۸/ذی الحجہ کو کوفہ کی جانب روانہ ہونے کی بات کہی ہے اور وہاں کے عوام سے چاہا کہ وہ اپنی کوششوں میں مزید سنجیدہ ہوجائیں یہاں تک کہ میں کوفہ پہونچ جاؤں:

"**فان کتاب مسلم بن عقیل جائنی یخبرنی فیه بحسن رایکم و اجتماع ملأکم علی نصرنا و الطلب بحقنا فسالت اللّٰہ ان یحسن لنا الصنع و ان یثیبکم علی ذالک اعظم الاجر و قد**

شخصت الیکم من مکة یوم الثلثا لثمان مضین من ذی الحجه یوم الترویة فاذا اقدم علیکم رسولی فانکمشوا امر کم وجدّوا فانی قادم علیکم فی ایامی هذه''۶۸ ؎ مجھے مسلم ابن عقیل کا خط ملا جس سے مجھے تم لوگوں کی حسن رائے کی خبر ملی پتہ چلا کہ تم ہماری مدد کرنا چاہتے ہو، دشمنوں سے ہمارا حق لینا چاہتے ہو، خدا سے دعا ہے کہ ہماری کوششوں کو نیکیوں میں شمار کرے اور تم لوگوں کو عظیم اجر عنایت کرے، میں اس خط کے ساتھ ساتھ شب ۸/ ذی الحجہ روز ترویہ کو مکہ سے تمہاری طرف روانہ ہو چکا ہوں ، جیسے ہی میرا نمائندہ تم تک پہونچے تم تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو آمادہ کرلینا اور اپنے کاموں میں مزید سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا کہ میں بہت جلد تمہارے پاس پہونچ رہا ہوں۔

چند اعتراض

مذکورہ بالا نظریہ (۲) پر کچھ اعتراض وارد ہوتے ہیں جن میں چند اہم اعتراض یہ ہیں:

۱۔ یہ نظریہ، شیعی نقطہ نظر کے (جو کلامی لحاظ سے امام کے عالم الغیب ہونے کے قائل ہیں) متضاد ہے۔

۲۔ یہ نظریہ امام پر خطا اور اشتباہ جیسے کلمات کو روا قرار دیتا ہے جو امام کی عصمت کے خلاف ہے۔ شیعہ معاشرہ کے فکری انحراف کی بہت بڑی وجہ یہی نظریہ ہے۔

اس کے جواب کے لئے لازمی ہے کہ شیعی نقطہ نظر سے علم کلام ،عصمت وعلم غیب نیز اس کے اثبات اور تاریخی حقائق کے تئیں اس کے عدم تضاد پر گفتگو ہو مگر چونکہ سردست یہ ہمارا موضوع نہیں ہے اور یہ گفتگو ہمیں تاریخی تجزیہ سے خارج کردے گی لہٰذا ہم اس پر سیر حاصل گفتگو نہیں کرسکتے ہیں البتہ یہاں یہ بات ضرور واضح کرنا چاہیں گے کہ علم کلام کے اصولوں میں اس نظریہ کے قبول ہونے کا امکان ہے جیسا کہ خود امام خمینیؒ کی تحلیل سے ثابت ہوتا ہے کہ صالح حکومت کی تشکیل ایک ذمہ داری ہے اور اسے تدبیر ، اتمام حجت ، درایت اور اجتماعیت سے انجام پایاجانا چاہئے البتہ اس کا نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے، اس کی رضا پر راضی رہنا چاہئے یہاں تک کہ اگر ہمیں اس کے نتیجہ کا علم ہوتو بھی ہمیں اپنے فریضہ پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ جو حق کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے اس کی شکست وقتی طور پر تو ممکن ہے مگر کامیابیوں کا سلسلہ پوری تاریخ پر محیط ہوتا ہے۔

مذکورہ اعتراض کے مطابق ، امام حسینؑ اپنے مقصد میں ظاہراً کامیاب نہیں رہے اور حکومت

اسلامی تشکیل نہیں پاسکی اور اہل کوفہ نے دھوکہ وفریب کاری سے کام لیا اور امام نے ان کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا جبکہ ابن عباس وغیرہ کا نظریہ درست ثابت ہوا۔ اس کے جواب میں تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے واقع نگر رویہ کے ساتھ امام حسینؑ کی تحریک کی عقلانیت کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی تحریک پر ایک تحقیقی جائزہ

اگر ایک سیاسی شخص کسی بھی قسم کے حالات کے تئیں اپنی تحقیق کی مدد سے کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس درمیان کوئی ایسا خارجی مانع درپیش آجائے جس کی توقع نہیں کی جاسکتی ہو اور وہ شخص اپنے پلان کے مطابق کامیاب نہ ہو پائے تو اس شخص کو خطا کار بہرحال نہیں کہا جاسکتا۔

امام حسین علیہ السلام نے بہر حال اس وقت کوفہ کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا جبکہ آپ نے حاکم شام کے دورحیات میں اہل کوفہ کو کوئی مثبت جواب نہیں دیا تھا اور ان کی خواہش کو نظر انداز کردیا تھا۔۶۹؎ یہاں تک کہ اپنے بھائی محمد حنفیہ کو بھی ان کے خطوط کا کوئی مثبت جواب دینے سے منع کیا تھا۔۷۰؎ ان حالات میں بھی آپ نے محض ان کے خطوط کے آنے پر اکتفا نہ کی بلکہ اہل کوفہ کے دعووں کی چھان بین کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور جب مسلم کو ایک مہینہ سے زیادہ ہوگیا اور آپ وہاں کے حالات سے بخوبی آشنا ہوگئے تاہم آپ کو احساس ہوا کہ امام کی آمد کے لئے حالات سازگار ہیں تو آپ نے امام کو خط لکھا اور پھر امام نے اس شہر کا قصد کیا البتہ امام حسینؑ کے اتنی جلدی آمادہ سفر ہوجانے کو مکہ میں درپیش جانی خطرہ پرحمل کیا جانا چاہیئے۔

اس درمیان ایک غیرمتوقع عامل پیش آیا کہ نعمان بن بشیر کو ہٹا کر عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا والی وحاکم مقرر کیا گیا، یہ ایک خلاف توقع عمل تھا بلکہ ظاہراً حالات اس کے برعکس لگ رہے تھے اور یہ کہا جارہا تھا کہ یزید،ابن زیاد سے بہت ناراض ہے ۷۱؎ اور اسے بصرہ سے معزول کردینا چاہتا تھا یہاں تک کہ بعض مآخذ میں یوں درج ہے:''**کان یزید ابغض الناس فی عبید اللّٰہ بن زیاد**''۔۷۲؎

ان باتوں کے باوجود اگر مسلم اور انکے ساتھی بھی ابن زیاد کی طرح ڈرانے، لالچ دینے کے علاوہ بیعت کرنے والوں کی سیاسی، اقتصادی واجتماعی مدد کرتے تو بہت ممکن تھا کہ یہ زیادہ کامیاب

ہوتے۔اگر جناب مسلم نے اس غیر معمولی صورت حال میں شریک بن اعور اور عمارہ بن عبد السلول کی پیش کش پر عمل کیا ہوتا تو ابن زیاد، ہانی ابن عروہ کے گھر میں مارڈالا گیا ہوتا۔ جیسا کہ اس وقت انہیں پورے حالات پر کنٹرول تھا۔

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے، حالات کوفہ سے متعلق امام حسینؑ کی شناخت، ابن عباس وغیرہ کے مقابل دقیق تر تھی اس لئے کہ پہلی بات یہ ہے کہ ابن عباس ،حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے زمانے والے کوفہ سے متعلق اپنی شناخت کا اظہار فرمارہے تھے جب کہ امام حسینؑ اس وقت کے تازہ ترین حالات کوفہ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ یہ شناخت ،اکابرین شیعہ سلیمان بن خزاعی اور حبیب ابن مظاہر جیسے افراد کے خطوط کے علاوہ امام کے براہ راست نمائندہ جناب مسلم کی تائید پر مشتمل تھی درحالیکہ ابن عباس وغیرہ کے پاس اپنی معلومات کی تصحیح یا تائید کے لئے کوئی آلہ کار موجود نہیں تھا۔

واضح رہے کہ اس وقت کوفہ کے حالات گذشتہ بیس برس والے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ آج یہ لوگ خاندان رسالت کا ساتھ دینے کے حق میں زیادہ پر جوش ہیں چنانچہ دھوکہ وفریب کا امکان تقریباً معدوم تھا اور اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔کوفہ نے شام کے مقابلہ مرکزیت کھودی تھی اور مرکز شام میں منتقل ہو چکا تھا اموی بادشاہوں کی سیاست یہ تھی کہ کوفہ کو عقب افتادہ ہی رکھا جائے تاکہ ہم اپنی عظمت کی جلوہ نمائی زیادہ کرسکیں۔

۲۔ اموی حکومت کی اہل کوفہ بالخصوص شیعان کوفہ پر چوطرفہ سخت گیریاں انہیں اموی سلطنت کے خلاف اور متحد اور مستحکم تر بنائے دے رہی تھیں۔

۳۔ چونکہ اہل کوفہ یزید کو پہلے سے پہچانتے تھے اس لئے اب وہ اسے امام حسینؑ کے مقابل ترجیح دینے پر آمادہ نہیں تھے اور جتنی جلدی ہوسکے اس کی حکومت سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ حکومت شام کی کمزوریاں ، یزید میں تجربہ کی کمی یا فقدان ، کوفہ میں نعمان بن بشیر جیسے کمزور آدمی کا حاکم ہونا ، امام حسینؑ کے کامیاب ہونے اور اسلامی حکومت کی تشکیل دینے کے امکانات کو مزید مضبوط بنا رہا تھا۔ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ تاریخی تجزیوں سے یہ بات ثابت ہے کہ امام حسینؑ کا کوفہ جانے کا فیصلہ اس وقت کے اقتضائے حال کے مطابق بالکل درست تھا اور اگر غیر متوقع موانع درپیش نہ ہوتے تو ظاہری طور پر بھی امام ہی دنیاوالوں

کو کامیاب نظر آتے۔

حوالے:

۱۔الامامۃ والسیاسۃ ج ۱،ص ۱۸۰

۲۔ایضاً ، بحار الانوار ج ۴۴،ص ۲۱۳

۳۔موسوعۃ کلمات الامام الحسین ص ۲۳۹

۴۔الارشاد ،مفید ،ص ۳۵۵

۵۔نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶

۶۔مقاتل الطالبین ،ص ۴۰

۷۔الارشاد ،ص ۳۵۷

۸۔موسوعۃ کلمات الامام الحسین،ص۲۰۹۔۲۱۰

۹۔الاخبار الطوال ،ص ۲۲۷،تجارب الامم، ج ۲، ۳۹

۱۰۔تاریخ ابن عساکر، ترجمہ الامام الحسین،ص ۵،ج ۵

۱۱۔بحار الانوار ج ۴۴،ص ۲۱۲

۱۲۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲،ص ۲۲۸، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱،ص ۱۸۶

۱۳۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲ ،ص ۲۲۸

۱۴۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲ ،ص ۲۲۸

۱۵۔الامامۃ والسیاسۃ ،ج ۱۱،ص ۱۶۱۔۱۶۴

۱۶۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲ ،ص ۱۸۱

۱۷۔مروج الذہب ، ج ۲،ص ۳۹۵

۱۸۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲،ص ۱۶۲

۱۹۔الکامل فی التاریخ ،ج ۲،ص ۵۹۳

۲۰۔ایضاً ج ۳،ص ۵۶۳۔۵۷۹

۲۱۔تاریخ یعقوبی ،ج ۲،ص ۴۰۴ و ۴۰۵

۲۲۔بحار الانوار ،ج ۴۴،ص ۲۱۱

۲۳۔واقعہ الطف،ص ۷۵

۲۴۔ابن اعثم ، الفتوح، ج ۵،ص ۱۱۲؛ واقعۃ الطف ،ص۸۱
۲۵۔واقعۃ الطف،ص ۷۷
۲۶۔ایضاً ص ۸۵، ۸۶
۲۷۔قصص (۲۸)، آیت ۲۱
۲۹۔آل عمران (۳) آیہ ۹۷
۳۰۔ واقعۃ الطف ،ص ۱۰۳۔ ۱۰۶
۳۱۔ ایضاً ،ص ۸۸
۳۲۔ ایضاً ،ص ۱۴۷
۳۳۔عن الصادق :''ان الحسین بن علی خرج یوم الترویہ الی العراق و کان معتمراً''، وسائل الشیعہ ج ۱، ص ۲۴۶، کتاب حج، باب ۷، ابواب العمرہ ج ۲، ۳
۳۴۔ابن کثیر ،البدایۃ والنہایۃ ،ج ۸،ص ۱۵۹
۳۵۔ واقعۃ الطف ،ص ۱۵۲
۳۶۔ سید ابن طاوس، لہوف،ص ۸۲
۳۷۔ ایضاً
۳۸۔ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲،ص ۵۴۶
۳۹۔ابن اعثم کوفی، الفتوح ،ج ۵،ص ۶۷
۴۰۔ایضاً ص ۶۶
۴۱۔ البدایۃ والنہایۃ ،ج ۸،ص ۱۶۲
۴۲۔ ایضاً ص ۱۶۳
۴۳۔بحار الانوار ، ج ۴۴،ص ۳۶۴
۴۴۔مقدمہ ابن خلدون ،ص ۲۱۱
۴۵۔ابن اثیر ، الکامل فی التاریخ ، ۲،ص ۵۴۵
۴۶۔ اصول کافی ج ۲،ص ۲۸۔ ۳۶
۴۷۔ایضاً ،ص ۲۸،۱
۴۸۔لہوف ،ص ۸۴
۴۹۔شہید فاتح در آئینہ اندیشہ، محمد صحتی سردرودی،ص ۲۰۵۔۲۳۱

۵۰۔شہید فاتح ،ص ۲۳۹
۵۱۔تاریخ طبری، ج ۵،ص ۴۰۳
۵۲۔ بحار الانوار، ج ۴۴،ص ۳۲۹؛ ابن اعثم ، الفتوح ، ج ۵،ص ۲۱
۵۳۔شہید فاتح،ص ۱۶۹
۵۴۔ایضاً ص ۱۷۰، بہ نقل از تنزیہ الانبیاء ،ص ۱۷۵
۵۵۔شہید فاتح،ص ۱۸۴۔۱۹۰و۲۰۵۔۲۳۱
۵۶۔صحیفہ نور،ج ۱ ،ص ۱۷۴
۵۷۔ ایضاً ج ۱۸،ص ۱۴۰
۵۸۔صحیفہ نور ج ۲۰،ص ۱۹۰
۵۹۔بحار الانوار ،ج ۴۴،ص ۳۲۹
۶۰۔ واقعۃ الطف، ابی مخنف ،ص ۹۲
۶۱۔ ایضاً ،ص۹۱
۶۲۔ واقعۃ الطف
۶۳۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲۰،ص ۲۱۵ و ۲۱۶
۶۴۔مروج الذہب ، ج ۳،ص ۶۴؛ شیخ مفید، ارشاد ،ص ۳۸۳
۶۵۔ واقعۃ الطف ،ص ۱۰۱
۶۶۔ واقعۃ الطف ،ص ۱۱۲
۶۷۔الارشاد،ص ۴۱۸
۶۸۔ دنیوری ، الاخبار الطوال ،ص ۲۰۳
۶۹۔ تاریخ طبری ، ج ۵،ص۳۵۶،۳۵۷؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲،ص ۵۳۵
۷۰۔ ابن مسکویہ،تجارب الامم، ج ۲،ص ۴۲ ؛البدایہ والنہایہ، ج ۸،ص ۱۵۲
۷۱۔سبط ابن جوزی ، تذکرۃ الخواص ، ۱۳۸
۷۲۔ الکامل فی التاریخ ، ج ۲ ،ص ۵۳۷

☆☆☆

جہاد امام حسین علیہ السلام

سید طیب رضا نقوی

امیرالمومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں مندرج کلمات قصار میں بعض فرائض کی حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا"**فرض اللّٰہ الایمان۔۔۔ والجبار عزالاسلام**" [۱]

ترجمہ: خداوند عالم نے ایمان کا فریضہ عائد کیا شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے نماز فرض کیا، انسان کو رعونت سے بچانے کے لئے اور زکوٰۃ کورزق میں اضافہ کا سبب بنانے کے لئے، روزہ کو مخلوق کا اخلاص آزمانے کے لئے، حج کو دین کی تقویت کے لئے اور جہاد فرض کیا اسلام کو سرفرازی بخشنے کے لئے ظلم اور ظالموں کی مقاومت اور فتنہ وفساد کی روک تھام کے لئے اور واضح رہے کہ جان ومال کو راہ خدا میں قربان کردینے کا نام جہاد ہے۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں ۔

جہاد اصغر: جہاد بالسیف یعنی تلوار کے ذریعہ دشمن کے خلاف جو جہاد کیا جاتا ہے وہ جہاد اصغر ہے۔

جہاد اکبر: یعنی انسان کی ذات میں موجود اپنے باطنی دشمن اور اس کے مذموم اثرات یعنی جہالت، بزدلی، جوروجفا اور رشک ونخوت وغیرہ سے برسرپیکار ہونا جہاد اکبر ہے۔ کبھی جہاد ابتدائی طور پر ہوتا ہے جسے جہاد بدائی کہتے ہیں اور کبھی دفاعی شکل میں ہوتا ہے جسے دفاعی جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دونوں طرح کے جہاد، جہاد ہی ہیں، چاہے ابتدائی ہو یا دفاعی البتہ ذرا سا فرق ہے ورنہ توجہاد بدائی بھی کلمہ اسلام کی سربلندی کے لئے کیا جاتا ہے اور دفاعی جہاد میں بھی امت مسلمہ کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ جہاد بدائی میں بھی اسلام کی سر بلندی کے لئے طاقتیں صرف کی جاتی ہیں اور دفاعی

میں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ جہاں دشمن کا حملہ نظر آتا ہے اس کا نام جہاد دفاعی ہے اور جہاں حملہ نظر نہیں آتا اس کو جہاد بدائی کہا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ فقط خدا کی راہ میں تلوار چلانے کا نام جہاد نہیں بلکہ جہاد کا مقصد اسلام کا دفاع وتحفظ اور اس کے اقدار کی نگہداشت ہے لہٰذا اگر جہاد کا فلسفہ فقط شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں محدود ہوتا تو خواتین اس کے اجروثواب سے محروم رہ جاتیں پس دین کی راہ میں شوہر کی اچھی خدمت کو بھی جہاد کا درجہ دیا گیا ہے بعض خواتین نے اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں میں عرض کیا ،کیا وجہ ہے کہ ہم خواتین کو جہاد کے شرف سے محروم رکھا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ''**جهاد المرء ة حسن التبعّل**'' عورت کا جہاد اپنے شوہر کی بہترین نگہداشت اور اچھی خدمت ہے۔

جہاد کی اہمیت

آنحضرت □ کے بارے میں قرآن کریم نے ان الفاظ میں صراحت فرمائی ہے۔''**النبی اولٰی بالمومنین من انفسهم**'' یعنی آنحضرت مومنین کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتے ہیں رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ ہی ساتھ امامؑ کی اطاعت بھی فرض ہے ۔ یہی سبب ہے کہ شیعہ عقائد میں حکم امام کے بغیر جہاد ساقط ہے۔ خود امام علیہ السلام ہوں یا امام کی جانب سے نائب خاص ہو چنانچہ جب امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک بن اشترنخعی کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا جس میں حضرت نے انہیں بہت سے احکام دیئے ہیں ان میں چار خاص چیزوں کی جانب متوجہ فرمایا ہے ۔**جبابة خراجها وجهاد عدوّها واستصلاح اهلها وعمارة بلادها**۲۔ یعنی وہاں کے مالی نظام کو درست کریں دشمن سے جہاد کریں اور وہاں کے لوگوں کی رشد و ہدایت کے لئے کمربستہ ہوجائیں اور وہاں کے شہروں کی تعمیر کریں۔

قرآن مجید میں جہاد کا ذکر پینتیس(۳۵) مقامات پر کیا گیا ہے۔لیکن خدا کی راہ میں جہاد فقط تینتیس مرتبہ ہے بقیہ دوجگہوں پر ذکر جہاد ضرور ہے مگر وہ خدا کی راہ میں جہاد نہیں ہے۔ وہ اس جہاد کومنفی جہاد سے تعبیر کرتے ہوئے پروردگار نے اولاد کو متوجہ فرمایا ہے کہ دیکھو ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، نیکی کرنا، حسن سلوک کرنا، ان کے ساتھ دنیا میں معروف اور پسندیدہ کام انجام دیتے رہنا اس لئے کہ وہ تمہارے ظاہری وجود کا ذریعہ ہیں۔تمہارے عالم ہستی میں آنے کا سبب ہیں اگر وہ

تمہاری پرورش و پرداخت نہیں کرتے تو آج تم دنیا میں موجود نہیں ہوتے۔'' وَإِنْ جَاهَدَاکَ عَلٰی أَنْ تُشْرِکَ بِی مَا لَیْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ فَلاَتُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوفًا''[۳] اور اگر تمہارے ماں باپ اس بات پر زور دیں کہ کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا لیکن دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا۔

مقصد یہ ہے کہ ہم نے والدین کو اپنی معرفت کا ذریعہ بنایا تھا اب یہ اس لائق نہیں رہے یہ تمہارے خالق نہیں ہم تمہارے خالق ہیں ہم نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے انہیں بھی خلق کیا ہے یہ درست ہے کہ والدین انسانی وجود کا ذریعہ ہیں۔ اولاد کی پرورش میں والدین بھی اپنا سکون حرام کردیتے ہیں پس اگر ان کا عمل پروردگار کی اطاعت کے خلاف ہے اوروہ خدا کی ذات میں شریک قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت سے ٹکرارہی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی اطاعت فرض تھی لیکن اسی وقت تک جب تک والدین اور خدا کی اطاعت میں ٹکراؤ کی شکل پیدا نہ ہوجائے۔''لا طاعة المخلوق فی معصية الخالق''[۴] یعنی جہاں سے خالق کی نافرمانی شروع ہوجائے تو مخلوق کی اطاعت کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے اب اگر خداوند عالم اپنے رسولؐ کی اطاعت کے بعد صاحبان امر کی اطاعت کا حکم مطلق طور پر دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان ہستیوں کی اطاعت کسی لحہ بھی اطاعت خدا سے متعارض نہیں ہوتی۔

جہاد کی مشروعیت

آنحضرت □ کی مکی زندگی کے بارے میں مورخین بخوبی واقف ہیں کہ اعلان رسالت کے بعد سے آپ پر کس طرح عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا تھا۔ جناب عمار کے والد جناب یاسر کو چلچلاتی دھوپ اور تپتی ہوئی ریت پر لٹادیاجاتاہے۔ ان کی زوجہ حضرت سمیّہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیاجاتاہے آخر میں پیغمبرؐ اور مسلمانوں کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ آپ کو ہجرت کرنی پڑتی ہے اس طرح آپ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہونچ جاتے ہیں لیکن مشرکین کو اس پر بھی چین وسکون نہیں ملتا اور وہاں بھی اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کے ذہن میں مشرکین کی جانب سے کوئی انتقامی تصور نہیں تھا لیکن مشرکین قریش جو اپنے ناکام منصوبوں پر پیچ وتاب کھائے ہوئے تھے آنحضرت کے صحیح وسالم مدینہ پہونچنے اور انصار کے ذریعہ آپ کا پرتپاک استقبال کئے

جانے پر کف افسوس مل رہے تھے، فتنہ وشورش کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کو گھر سے باہر کرنے کے بعد ان کا اطمینان وسکون سلب کرنے اور اسلام کی توسیع وترقی روکنے کے لئے حرب وپیکار پر اتر آتے ہیں اور اس بے سروسامان جماعت کو اپنی طاغوتی طاقتوں سے کچلنے کا مکمل ارادہ کرلیتے ہیں۔ پیغمبر □ جنہوں نے مکہ میں پر امن طریقہ سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہاتھا اور مدینہ میں قبائل یہود سے صلح وامن کا تحریری معاہدہ کیا تھا وہ قریش کی شر انگیزیوں کے باوجود نہیں چاہتے تھے کہ جنگ کی نوبت آئے اورکشت وخونریزی کی گرم بازاری ہومگر جب قریش کی شرپسندی اور فتنہ انگیزی نے مسلمانوں کے سکون واطمینان کوختم کرنے کے لئے ان کے سروں پر جنگ مسلط کردی تو اس کے سواکوئی چارۂ کارنہیں تھا کہ جارحانہ حملوں کے خلاف مدافعانہ قدم اٹھایا جائے چنانچہ آنحضرت □ نے اس وقت تک جنگ کا نام نہیں لیاجب تک قریش ویہود نے آپ کو جنگ کے لئے مجبورنہیں کیا اور کفار کے بڑھتے ہوئے تشدد کو روکنے کے لئے جہاد کی اجازت نہیں دیدی چنانچہ ارشاد ہوتاہے۔''أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۔''۴ یعنی جن لوگوں کومسلسل ستایاجارہا تھا جن پر ظلم وستم ڈھایاجارہا تھا انہیں اجازت دیدی گئی۔ سب سے پہلے اذن یعنی اجازت کی لفظ ہے اور اذن بھی اس لئے دیا جارہا ہے کہ انہیں مسلسل ستایا جارہا ہے اس (ظلم) میں مسلمانوں پر کیے گئے تمام مظالم کی داستان پوشیدہ ہے ایک اورآیہ کریمہ میں ارشاد ہوتاہے۔

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ۵۔

اے مسلمانو! تم کوکیا ہوگیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور بے بس مردوں اورعورتوں اور بچوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے واسطے جہادنہیں کرتے جو حالت مجبوری میں خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سےجس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اورتو خود ہی اپنی طرف سے مددگار بنا۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۶۔

یعنی اے صاحبان ایمان، مشرکین جس طرح تم سے سب کے سب ملکر لڑتے ہیں تم بھی اسی طرح سب کے سب ملکر ان سے لڑو اور یہ جان لو کہ خدا تو یقینا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

انفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالاً وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ

ہے

اے مسلمانو! تم ہلکے پھلکے نہتے ہو یا بھاری بھرکم اسلحوں سے مسلح بہر حال جب تم کو حکم دیا جائے فوراً چل کھڑے ہو اور اپنی جانوں سے اور اپنے مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کرو۔ اگر تم کچھ جانتے ہو تو سمجھ لو کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اگرچہ اسلام نے ان ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے مگر جنگ کے مختلف مراحل آغاز اثناء اور اختتام کے لئے ایسی ہدایات جاری کی ہیں جو اسلام کی امن پسندی اور انسان دوستی کی آئینہ دار ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی خون ریز اقدام سے پہلے دعوت اسلام دینا ضروری ہے تا کہ جنگ پر آمادہ گروہ اگر اسلام سے متاثر نہیں ہے تو کم از کم اس پر یہ واضح ہوجائے کہ جنگ کا مقصد انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا مال غنیمت سمیٹنا یا باقی ماندہ مرد وخواتین کو غلام وکنیز بنانا نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیم کو عام کرکے ایک امن پسند معاشرہ تعمیر کرنا ہے اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اپاہجوں ، مزدوروں ،امن پسندوں ، عورتوں ،بوڑھوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانا اور اندھا دھند خون بہانے سے اسلام نے منع کیا ہے چنانچہ جنگ حنین میں جب خالد بن ولید نے ایک عورت کو قتل کردیا تو آنحضرت □ نے ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کہلا بھیجا کہ وہ کسی عورت بچے یا مزدور پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ پیغمبر □ نے صحابہ کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ جنگ کے دوران مشرکین کے بچوں کو قتل نہ کرنا۔ کچھ لوگوں نے عرض کی وہ تو مشرکین کی اولاد ہیں اس وقت آپ نے فرمایا'' **اولیس خیارکم اولاد المشرکین** '' کیا تم میں کے اچھے لوگ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے سامان رسد کھانے پانی وغیرہ میں رکاوٹ پیدا کی جائے انہیں ضروریات زندگی سے محروم کیاجائے اور بلاوجہ ان کے باغات کھیتوں کو اجاڑا جائے ،پھل دار درختوں کو کاٹا اور عمارتوں کو گرایاجائے۔

قرآن کریم میں منزل جہاد میں بار بار ہجرت کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے'' **الّذین آمنوا وھاجرو وجاھدوا** '' یعنی جنہوں نے ہجرت اور جہاد (دونوں) کیے یعنی ہجرت بھی جہاد کی ایک قسم ہے یعنی ہجرت کے ساتھ جہاد ہے تو سب کچھ ہے اگر ہجرت کے ساتھ جہاد نہیں ہے تو فقط ہجرت جس میں میں کوئی شرف نہیں ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت کے ساتھ جہاد میں دونوں طرح کے جہاد شامل ہوجاتے ہیں جہاد بالسیف اور جہاد نفس یعنی جہاد اصغر اور جہاد اکبر دونوں مگر یہ

کیسے معلوم ہو کہ کس کی ہجرت بر بنائے جہاد ہے اور کس کی ہجرت کسی دوسری مصلحت کی بنا پر ہے اس کا راز اسی وقت کھلے گا جب جاھدوا کی منزل آجائے گی تب معلوم ہوگا کہ ہجرت بر بنائے جہاد ہے تو ایسے مجاہد کو ہر میدان میں نظر آنا چاہیئے اگر ہجرت بر بنائے جہاد نہیں ہوگی تو ہجرت میں سب نظر آئیں گے۔ جہاد میں میدان صاف ہوگا۔ تاریخ اسلام کا فیصلہ ہے ''استوی الاسلام سیف علی'' یعنی اسلام کو طاقت وغلبہ اور استحکام علی علیہ السلام کی تلوار سے حاصل ہوا اگر چہ شب ہجرت اور بدر کبریٰ سے جمل وصفین ونہروان کی جنگیں اور تمام غزوات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کی علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ثبات قدم جان فروشی اور ہجرت وجہاد کا عدیم المثال نمونہ ہے۔ ہر واقعہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ اسلامی تاریخ کے آغاز ہی سے اسلام کا غلبہ اوراس کی سربلندی و سرفرازی حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر کی مرہون منت ہے چنانچہ جنگ بدر کے بعد احد کا نقشہ مورخین کے پیش نظر ہے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے شمع رسالت کے بیشتر پروانے رخصت ہو چکے ہیں بس ایک علیؑ کی ذات، وہی میمنہ پر ہے وہی میسرہ پراور وہی قلب لشکر میں نظر آتی ہے۔ اس مقام پر اس ذات کا تعارف فرشتہ کے ذریعہ کرایا جائے تو بہتر ہوگا۔ محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق فرشتہ نے آکر عرض کی یارسولؐ اللہ! آپ علیؑ کا جہاد دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح وہ تن تنہا دائیں بائیں قلب وجناح پر ہر طرف سے آپ کا دفاع کررہے ہیں حضرتؐ فرماتے ہیں۔ ''کیف لا'' علیؑ ایسا مثالی دفاع کیوں نہ کریں ''فانّہ منی و انامنہ'' بیشک علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔

یہ منزل جہاد اس ذات کی ہے جس کی تلوار سے اسلام کو استحکام ملا آپ ہی کے فرزند ارجمند حضرت امام حسینؑ ہیں جن کے متعلق جب اسلام کی نسبت سے تعارف کرایا گیا تو اس طرح کہا گیا ''محمّدالحدوث حسینی البقا''

یعنی اسلام کی ابتداء پیغمبرؐ سے اور اس کی بقا ہے حسینؑ سے

۵۰ھ میں امام حسنؑ کو زہر دغا سے شہید کردیا جاتا ہے وہیں سے امام حسینؑ کے عہد امامت کا آغاز ہوتا ہے جبکہ امیر شام کا انتقال ۶۰ھ میں ہوا اس طرح امام حسینؑ کی امامت کے دس برس امیر شام کی ملوکیت کے دور میں گذرے۔ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد شیعیان علیؑ نے امام حسینؑ کے نام تعزیتی خط لکھتے ہوئے یہ تحریر کیا کہ اللہ نے آپ کو اسلاف کا عظیم ترین خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے ہم آپ کی پیروی کرنے والے لوگ آپ کے حزن واندوہ میں محزون اور آپ کی خوشی میں

خوش ہونے والے ہیں اور سب کے آخر میں یہ عبارت لکھی ''المنتظرون لامرک'' ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں بنو جعدہ بن ہبیرہ نے اپنے خط میں تحریر کیا کہ اہل کوفہ امام حسینؑ کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ امام حسینؑ کوفہ تشریف لائیں، یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اعوان وانصار سے ملاقات بھی کی ہے جن کے قول وفعل پر اعتبار کیا جاسکتا ہے یہ لوگ دشمن کے لئے سخت جنگجو اور آل ابوسفیان کے مخالف ہیں۔ آخر میں امام حسینؑ سے درخواست کی گئی کہ حضرت اپنی رائے سے مطلع فرمائیں ان کے جواب میں امام حسینؑ نے تحریر فرمایا

انّی لارجوان یکون رای اخی۔۔۔انشاءاللّٰہ

ترجمہ: میں امید کرتا ہوں کہ صلح میں میرے بھائی کی رائے اور ظالموں سے جہاد کرنے میں میری رائے دونوں ہی حق وصواب اور رشدو ہدایت پر ہیں تم لوگ اپنی زمین سے وابستہ رہو اور خواہش کو مخفی رکھو جب تک ابن ہندہ زندہ ہے اگر وہ مرگیا اور میں زندہ رہا تو اس وقت انشاء اللہ اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔

بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ مسیب بن عتبہ فزاری امام حسنؑ کی شہادت کے بعد کچھ لوگوں کے ساتھ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ کہہ کر آپ سے معاویہ کے معزول کرنے کی درخواست کہ ہمیں آپ کی اور آپ کے برادر دونوں کی رائے معلوم ہے اس کے جواب میں آپ نے فرمایا ''**انّی لارجو ان یعطی اللّٰہ اخی علی نیتہ فی حبّہ الکف وان یعطینی علی نیتی فی حبّی جھاد الظّالمین**'' ۸۔

یعنی مجھے امید ہے اللہ میرے بھائی کو اس محبت کا اجر عطا فرمائے گا جو انہیں صلح سے تھی اور مجھے اس محبت کا اجر عطا فرمائے گا جو مجھے ظالموں کے ساتھ جہاد سے ہے۔

شیخ مفید کے مطابق امیر شام کی وفات ۱۵/رجب کو واقع ہوئی۔ یزید امیر شام کی تدفین کے تین روز بعد دمشق پہونچتا ہے۔

جب یزید حاکم ہوا تو مدینے کا والی ولید بن عتبہ بن ابوسفیان اور مکہ کا والی عمرو بن سعید عاص بصرہ کا والی عبیداللہ بن زیاد اور والی کوفہ نعمان بن بشیر تھا۔ اس وقت یزید کی توجہ صرف ان لوگوں پر تھی جنہوں نے معاویہ کے عہد میں اس کی بیعت سے انکار کیا تھا لہٰذا یزید نے ولید کو ایک خط کے ذریعہ معاویہ کی موت کی خبر بھیجی اور ایک مختصر خط بھی لکھا جس میں لکھا تھا حسینؑ اور عبد اللہ

بن عمر اور عبد الملک بن زبیر سے اس طرح بیعت لو کہ انہیں بیعت کے بغیر کوئی چارہ نہ رہے۔

قاصد خط لیکر مدینہ پہونچتا ہے ولید نے شب کے وقت امامؑ کو بلا بھیجا۔ امام بنی ہاشم کے ہمراہ دربار میں پہونچتے ہیں ولید امامؑ کو یزید کی بیعت کی دعوت دیتا ہے۔ امامؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ اے امیر ہم اہلبیتؑ نبوت اور رسالت کا معدن ہیں۔ ہم فرودگاہ ملائکہ ہیں اور ہم رحمت کے نزول کا محل ہیں سلسلہ ہدایت کا اللہ نے ہم سے آغاز کیا اور ہم ہی پر اس کا اتمام کیا اور یزید ایک فاسق شرابی ہے۔ نفس محترم کا قاتل اور اعلانیہ فسق وفجور کرنے والا ہے مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا۔ صبح ہونے دو تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کریں پھر دیکھیں گے ہم میں سے کون خلافت وبیعت کا حق دار ہے، دروازے پر کھڑے ہاشمی جوانوں نے امام حسینؑ کے یہ جملے سنے تو تلواریں نکال کر دروازہ کھولنا ہی چاہتے تھے کہ امام حسینؑ باہر آئے اور انہیں ان کے گھروں کو واپس کر دیا اور خود اپنے گھر روانہ ہوگئے۔

اس کے بعد امام قبر رسولؐ پر تشریف لائے اور مدینہ ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

صبح کو محمد حنفیہ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی بھیا آپ مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہیں اور میں سب سے بڑھ کر آپ سے محبت کرتا ہوں لہٰذا یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کے لئے جو بات خیر سمجھتا ہوں وہ آپ کی خدمت میں عرض کروں اور ایسا کیوں نہ کروں جبکہ آپ میرے بڑے بھائی ہیں میرے امام ہیں اور آپ کی اطاعت مجھ پر فرض ہے میری رائے یہ ہے کہ یزید کی بیعت سے بچنے کے لئے شہروں سے دور رہیں اور صحرائی بستیوں میں قیام کریں پھر آپ اپنے نمائندے علاقوں میں بھیجیں اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیں حسینؑ نے کہا بھیا میں کہاں جاؤں؟ کہا مکہ چلے جایئے اور اگر اہل مکہ آپ کی صحیح پزیرائی نہ کریں تو آپ یمن کی طرف نکل جائیں اور اگر وہاں بھی سکون نہ ملے تو پہاڑی اور میدانی علاقوں کی طرف نکل جائیں۔ امام نے فرمایا اے برادر! اگر مجھے دنیا میں کوئی جائے پناہ نہ مل سکے جب بھی میں یزید کی بیعت نہیں کرسکتا پھر دونوں بھائی ملکر روتے رہے پھر امامؑ نے ارشاد فرمایا اے بھائی! اللہ تمہیں جزائے خیر دے، تم نے اچھے مشورہ کا حق ادا کیا اب میں اپنے رشتہ داروں اور چاہنے والوں کے ساتھ مکہ کا سفر اختیار کررہا ہوں تم مدینہ میں رہ کر یہاں کے حالات سے مجھے مطلع کرتے رہنا۔

امام حسین علیہ السلام نے ۲۸/رجب ۶۰ھ میں اپنے وطن مدینہ کو خیر باد کہہ دیا جہاں

نانا کا روضہ ماں کا مزار اور برادر کی لحد تھی اور ۳ شعبان کو وارد مکہ ہوتے ہیں امام حسینؑ کے تشریف لانے سے اہل مکہ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اوروہاں لوگ صبح وشام آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے ان میں شہر مکہ کے اصلی باشندے بھی تھے اور وہ بھی تھے جوحج وعمرہ کی غرض سے آئے تھے یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے آپ کے بیانات سے استفادہ کرتے اور آپ سے سنی ہوئی روایات کوتحریر کر لیتے تھے۔

مکہ کے حالات ناگزیر تھے لہٰذا آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو ۸ ذی الحجہ کی شب میں ایک خطبہ اپنے اصحاب کے سامنے ارشاد فرمایا۔

'' ساری تعریف اللہ کے لئے سزاوار ہے اور وہی ہوتاہے جو اللہ چاہتا ہے اور کسی کے پاس کوئی توانائی نہیں ہے مگر اللہ ہی کی مدد سے اور اللہ کا درو دو سلام ہو اللہ کے رسولؐ پر، فرزندان آدم کے لئے موت ایسی ہی زینت ہے جیسی جوان لڑکی کے گلے میں گلوبند ہو۔ میں اپنے اسلاف اور بزرگوں سے ملاقات کا اس طرح اشتیاق رکھتا ہوں جیسے یعقوبؑ کو یوسفؑ کا اشتیاق تھا۔ میرے لئے ایک شہادت گاہ معین ہے مجھے وہاں تک پہونچنا ہے''۔

سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے امامؑ اور آپ کے ساتھی ۲ محرم الحرام ۶۱ھ کو وارد کربلا ہوتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے یزیدی افواج کی کثرت سے میدان کربلا پُر ہو جاتا ہے۔ سات محرم سے اصحاب واطفال حسینؑ پر پانی بند کردیا جاتا ہے شب عاشورآتی ہے یہاں تک شب عاشور بھی گذر جاتی ہے امام حسینؑ کے ایک ایک ساتھی داد شجاعت دیتے ہیں اور جام شہادت نوش کرتے جاتے ہیں پھر آپ کے اعزّہ کی باری آتی ہے یہاں تک کہ عاشور کا سورج زوال پذیر ہوجاتا ہے اور اب امام حسینؑ سے وہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتاجارہا تھا جس لمحہ میں آپ کو اپنا وعدہ طفلی پورا کرنا تھا بکھرے ہوئے لاشوں کے درمیان امامؑ کھڑے ہوئے اس آخری سجدہ کی تیاری کر رہے تھے جو سجدہ توحید کی شان اور رسالت کی آبرو بننے والا تھا آپ نے جاں نثاروں کے لاشوں پر نگاہ کی اور اہل حرم کے خیمہ کی طرف متوجہ ہوئے آواز دی''**یاسکینہ یا فاطمہ یازینب یا ام کلثوم علیکنّ منّی السّلام**'' اے سکینہ اے فاطمہ اے زینب اے ام کلثوم تم سب پر میرا سلام ہو جواب میں جناب سکینہ نے کہا **یا ابا استسلمت الی الموت**؟ بابا کیا آپ مرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ آپ نے جواب میں فرمایا ''**کیف لا یستسلم من لا ناصر له ولا معین**'' وہ شخص کیسے مرنے کے لئے تیار نہ

ہوجس کا کوئی ناصر ومددگار ہی نہ رہ گیا ہو۔

پسر سعد سے گفتگو: امام علیہ السلام میدان میں تشریف لائے اور عمر سعد کو مخاطب فرمایا جب وہ سامنے آیا تو آپ نے فرمایا میرے تین مطالبے ہیں۔۱۔ مجھے چھوڑ دو تا کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ چلا جاؤں اور اپنے جد کی قبر کے پاس زندگی گزاروں ۲۔مجھے پانی پلادو اس لئے کہ میرے جگر میں آگ لگی ہوئی ہے اگر یہ دونوں باتیں قبول نہیں ہیں تو دستور عرب کے مطابق فرداً فرداً مجھ سے جنگ کرو۔پسر سعد نے جواب میں کہا، تیسری بات قابل قبول ہے ۹۔ آپ کے سامنے لشکر یزید سے سپاہی آتے رہے اور قتل ہوتے رہے، حملہ کے دوران آپ یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

انا بن علی الطھر من آل ھاشم   کفانی بھذا مفخراً حسین افخر
وجدّی رسول اللّٰہ اکرم من مضی   ونحن سراج اللّٰہ فی الارض نزھر
وشیعتنا فی الناس اکرم شیعۃً   ومبغضنا یوم القیامۃ یخسر
فطوبی لعبدٍ زار نابعد موتنا   بجنۃ عدن صفوھا لایکدر ۱۰۔

ترجمہ: میں علی کا فرزند اور اولاد ہاشم سے ہوں مقام فخر میں یہی بات میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

میرے جد رسول اللہ ہیں جو تمام رسولان گذشتہ سے افضل ہیں اور ہم اس زمین پر اللہ کا نور بخشنے والے چراغ ہیں اور رسول کی دختر فاطمہ میری مادر گرامی ہیں اور میرے چچا جعفر ہیں جن کے پاس دو پر پرواز ہیں۔ہمارے پیرو ساری دنیا کے پیرو سے بہتر ہیں اور ہمارا دشمن قیامت کے دن خسارے میں ہوگا۔خوش خبری ہو اس شخص کو جو ہماری موت کے بعد جنت باصفا میں ہم سے ملاقات کرے گا۔

سید الشہداء علیہ السلام نے انفرادی جنگ میں دشمنوں کی کثیر تعداد کو قتل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھ کر دشمن کے میمنہ پر حملہ کیا۔

الموت اولی من رکوب النار   والعار اولیٰ من دخول النار

ننگ وعار کی سواری پر سوار ہونے سے موت بہتر ہے اور ننگ وعار جہنم میں جانے سے بہتر ہے۔

پھر حضرت نے یہ رجز پڑھ کر دشمن کے میسرہ پر حملہ کیا

انا الحسین بن علی آلیت ان لاانثنی

احمی عیالات ابی امضی علی دین النبی ۱۱؎

میں علیؑ کا بیٹا حسینؑ ہوں، میں نے قسم کھائی ہے کہ سر تسلیم خم نہیں کروں گا میں اپنے باپ کے عیالات کی حمایت وحفاظت کررہاہوں اور نبیؐ کے دین پر کاربندہوں۔

علاّمہ مجلسی لکھتے ہیں راوی کا بیان ہے خدا کی قسم میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی شخص کے انصار واہل خاندان قتل ہوگئے ہوں اور اس پر چاروں طرف سے ان گنت دشمنوں کا حملہ ہو وہ حسینؑ سے زیادہ قوی دل اور ثابت قدم ہو جب لوگ آپ پر حملہ کرتے تو آپ جواب میں ان پر حملہ آور ہوتے تھے تو دشمن اس طرح بھاگتے تھے جیسے بھیڑیے کے حملے سے بکریوں کے ریوڑ بھاگتے ہیں جب آپ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اس طرح منتشر ہوتے تھے جیسے ٹڈیوں کے دل منتشر ہوتے ہوں آپ حملہ کرکے اپنی جگہ واپس آجاتے تھے اور فرماتے تھے ''لاحول و لاقوۃ الاّ باللہ العلیّ العظیم'' ۱۲؎

صاحب معالم السبطین فاضل حائری نے امام علیہ السلام کے جہاد کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔''امام حسینؑ نے پوری فوج پر اکیلے حملہ کیا اور جنگ کرتے ہوئے ان کے درمیان میں داخل ہوگئے۔ تلوار مارتے جاتے تھے اور انہیں قتل کرتے جاتے تھے فوج کے سردار گھبرائے ہوئے تھے اور لوگ حسینؑ کے سامنے سے فرار کررہے تھے۔ یہاں تک کہ زمین مقتولین کے خون سے رنگین ہوگئی۔ آپ نے میمنہ پر حملہ کیا پھر میسرہ پر حملہ کیا پھر میمنہ کو میسرہ پر پلٹ دیا دوبارہ میسرہ کو میمنہ پر پلٹ دیا اور قلب لشکر کو میمنہ ومیسرہ دونوں پر ڈھکیل دیا۔ چاہا تو فوج کے بیچ میں چلے گئے چاہا تو باہر نکل آئے ہر ایک حسینؑ کے دسترس میں تھا کسی کو قتل کرتے تھے اور کسی کو زد پر ہونے کے باوجود چھوڑ دیتے تھے۔ کسی نے سوال کیا تو فرمایا کہ جس کے صلب میں مومن کو دیکھتا ہوں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

جب یزیدی فوج بڑی تعداد میں امامؑ کے ہاتھوں قتل ہوگئی اور بیشتر سپاہی زخمی ہوگئے تو عمر بن سعد نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے تم کس سے جنگ کررہے ہو؟ یہ علیؑ بن ابی طالب کا بیٹا ہے یہ قتال عرب کا بیٹا ہے تم سب ملکر اس پر چاروں طرف سے حملہ کرو اس وقت چار ہزار تیر اندازوں نے آپ پر تیروں کی بارش شروع کی اور ایک سواسی نیزہ بر داروں نے حملہ

کیا۔ ۱۳؎

امام حسینؑ نے یزید کے لشکر والوں سے سوال کیا۔ ''**یا ویلکم علی ماتقتلو نی؟ علیٰ حق ترکتہ ام علیٰ سنۃ غیر تھا؟ ام علیٰ شریعۃ بدلتہا**'' تم لوگ مجھ سے کیوں جنگ کررہے ہو؟ کیا میں نے کسی حق کو ترک کیا ہے؟ کیا میں نے رسولؐ کی کوئی سنت تبدیل کی ہے؟ کیا میں نے کسی حکم شریعت کو تبدیل کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم آپ کے باپ کی دشمنی وعناد میں آپ سے لڑرہے ہیں کہ انہوں نے ہمارے آباواجداد کو بدروحنین میں قتل کیا تھا یہ اس کا انتقام ہے۔ ۱۴؎

پسر سعد کے حکم سے امام حسینؑ پر چار ہزار تیر اندازوں نے حملہ کے۔ا فوج امام حسین اور آپ کے خیام کے درمیان آ گئی۔ اسی دوران اہل حرم کے خیموں پر حملہ کردیا گیا، جب امام کے کانوں تک بی بیوں اور بچوں کی فریاد پہونچی تو آپ نے یزیدی لشکر سے پکار کر فرمایا وائے ہوتم پر، اے آل ابوسفیان کے شیعو! اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہے اور تمہیں روز قیامت کا خوف بھی نہیں ہے تو کم از کم اپنی دنیا میں تو آزاد بنو یزید کے غلام نہ بنو اور اگر اپنے کو عرب جانتے ہوتو اپنے بزرگوں کے طور وطریق پر تو عمل کرو۔ شمر نے کہا اے فاطمہ کے بیٹے کیا کہہ رہے ہو؟ آپ نے فرمایا میں تم سے جنگ کررہا ہوں تم مجھ سے جنگ کررہے ہو لیکن عورتوں کا اس سے ربط نہیں ہے۔

امام حسینؑ پر پیاس کا شدید غلبہ تھا جب آپ پانی سے قریب ہوئے تو آپ نے چلّو میں پانی لیا حصین بن تمیم نے آپ کی جانب ایک تیر پھینکا جو آپ کے دہن میں پیوست ہوگیا۔ آپ نے پانی پھینک کر دہن سے تیر نکالا پھر خون آسمان کی طرف پھینکا اور حمد وثنا ئے الٰہی کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے عرض کی ''**اللّٰھمّ احصھم عدداً واقتلھم برداً ولا تذر علی الارض منھم احداً**'' ۱۵؎

بار الٰہا ان کی جمعیت کو ختم کردے انہیں پراگندہ فرما کر قتل کردے اور روئے زمین پر ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ ۔ایک روایت کے مطابق جب امام حسینؑ نے پانی پینا چاہاتو حصین بن نمیر نے آپ کی جانب تیر پھینکا جو آپ کی ران میں پیوست ہوگیا آپ نے خون آسمان کی جانب پھینکا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی پروردگار تجھ سے شکایت کررہا ہوں ان لوگوں کی کہ انہوں نے میرا خون بہایا اور مجھ پر پانی بند کیا۔ ۱۶؎

امام حسینؑ کی پیشانی پر تیر: امام جہاد میں مصروف ہیں کہ ابو الحتوف نے کمان میں تیر جوڑ کر

آپ کی پیشانی کی طرف پھینکا۔ پیشانی سے خون جاری ہوا جو آپ کے چہرہ اور ریش مبارک پر پھیل گیا آپ نے آسمان کی جانب سر بلند کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی۔ بار الہا تو جانتا ہے میں ان لوگوں میں گھر گیا ہوں اور تیرے نافرمان بندوں کے ہاتھوں کس طرح مصیبتیں برداشت کر رہا ہوں۔ بار الہا روئے زمین سے ان کو مٹادے انہیں ہلاک کردے اور انہیں نابود کردے اور ان کی مغفرت نہ فرما۔۱۷؎

آخری جہاد: الغرض دلبند حیدرؑ کرار نے وہ شدید حملے کیے کہ باوجود کثرت افواج کے اپنے والد حیدر کرار کی طرح فوج اشرار پر شیرانہ حملہ کیا کبھی میمنہ پر پہونچتے ہیں کبھی میسرہ پر کبھی قلب لشکر میں در آتے ہیں۔ ہزاروں کو قتل کرکے میدان جنگ میں ضرب حیدری کا سکہ بٹھادیتے ہیں۔ فوج یزید کا ایک سردار عبد اللہ بن عمر بیان کرتا ہے' قسم بخدا ہم نے کسی شخص کو جس کے رفیق وانصار فرزند واقرباء مر چکے ہوں اسے اس پامردی اور ہمت سے لڑتے نہیں دیکھا'۔

حضرت کی اس شجاعت کا دنیا میں کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس تشنگی وخستگی اور مظلومیت کے باوجود علاّمہ مجلسی کے قول کے مطابق حضرت نے ایک ہزار نوسو پچاس پیادے اور سوار قتل کئے اور معصوم کی روایت سے تخصیص بھی ہے کہ وہ لوگ قتل ہوئے ہیں جن سے کسی مومن کے قتل ہونے کی امید نہیں تھی ۔صاحب ''روضۃ الشہیدائ'' نے مقتولین کی تعداد بارہ ہزار تک لکھی ہے بہر حال ایک تشنہ کام اور ضعیف انسان کے لئے یہ شجاعت عدیم المثال ہے مگر کہاں تک لڑتے ،خون بھی جسم سے بکثرت بہہ چکا تھا، دن ڈھل رہا تھا کہ ہر طرف سے خورشید امامت پر حملہ ہوتا ہے عمر سعد فوج کو آواز دیتا ہے۔ وائے ہوتم پر یہ شخص انزع البطین کا یادرگار ہے تم اس طرح ہر گز کامیاب نہ ہوسکو گے ہر طرف سے گھیر لو۔ یہ سننا تھا کہ تنہا بیکس پر فوجوں کا ہجوم ہوتا ہے حضرت کہاں تک دفع کریں ایک کو قتل کرتے ہیں تو اس مقام پر دس آجاتے ہیں ناگاہ ابو الحنوق کا تیر پیشانی پر پڑا حضرت نے دامن اٹھا کر خون پاک کرنا چاہا کہ دوسرا تیر سینہ مبارک سے پار ہوگیا فرمایا **بسم اللّٰہ و باللّٰہ علیٰ ملّۃ رسول اللّٰہ** امامؑ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں **الٰھی تعلم انّھم یقتلون رجلاً لیس علیٰ وجہ الارض ابن نبیّک غیرہ**۔ خداوند گواہ رہنا یہ لوگ ایسے شخص کو قتل کررہے ہیں جس کے سوا کوئی دوسرا شخص تیرے رسولؐ کا نواسہ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس تیر کو سینہ سے نکالا اور زخم کا خون چہرہ پر مل کر فرماتے ہیں اسی طرح نانا جان سے ملاقات کروں گا۔

زینب(س) قتل گاہ میں: جب امامؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے آپ خیمہ سے

باہر نکل کر دوڑیں اور فریاد کرتی ہوئیں تیزی سے امام کی طرف آئیں اور کہنے لگیں کاش آسمان زمین پر گر پڑتا اور پہاڑ صحرا پر آجاتا۔ ۱۸؎ پھر پسر سعد کی جانب متوجہ ہوکر فرماتی ہیں ابن سعد تو دیکھ رہا ہے حسینؑ قتل ہورہے ہیں، اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور جناب زینب(س) کی طرف سے منھ پھیرلیا۔ ابھی بہن اپنے بھائی کے پاس پہونچنے نہیں پائی تھیں کہ شمر نے صدائے تکبیر بلند کی۔ فتح کے باجے بجنے لگے۔ **الاقتل الحسین بکربلا، الاذبح الحسین بکربلا** کی صدائیں آسمان میں گونجنے لگیں۔

حوالے:

۱۔نہج البلاغہ کلمات قصار، ارشاد نمبر ۲۵۲

۲۔نہج البلاغہ، خط نمبر ۵۳

۳۔سورۂ لقمان ،آیت ۱۵

۴۔نہج البلاغہ،کلمات قصار

۵۔سورۂ نسائ،آیت ۷۵

۶۔سورۂ توبہ،آیت ۳۶

۷۔سورۂ توبہ،آیت ۴۱

۸۔البدایہ والنہایہ، ج۸،ص ۱۷۴

۹۔منتخب طریحی،ص ۳۱۷

۱۰۔منتخب طریحی،ص ۳۱۷۔ناسخ التواریخ، ج ۲،ص ۳۶۵۔بحوالہ طریحی۔منقول از حدیث کربلا ،ص ۴۸۷

۱۱۔مقتل مقرم،ص ۲۷۴

۱۲۔بحار الانوار، ج ۴۵،ص ۵۰ ، ارشاد، شیخ مفید ودیگر کتب

۱۳۔معالی السبطین ، ج ۲،ص ۳۱

۱۴۔مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴،ص ۱۲۰

۱۵۔ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۳۷۶۔ الامام الحسین واصحاب، ص ۳۰۲ ،منقول از حدیث کربلا، علامہ طالب جوہری ،ص ۴۸۹

تاریخ طبری، ج ۴،ص ۳۴۳ ۔ناسخ التواریخ، ج ۲،ص ۳۷۹،منقول از حدیث کربلا

۱۶۔الدمعۃ السّاکبہ

۱۷۔مقتل خوارزمی، ج ۲،ص ۳۸۔نفس المہموم،ص ۱۸۹

۱۸۔لہوف مترجم، ۱۴۲، منقول از حدیث کربلا

]ب[

حسینی انقلاب میں عناصر بیداری

عزاداری اور مرثیہ نگاری

پروفیسر سید جعفر رضا

'عزاداری' اور 'تعزیہ داری' کی اصطلاحیں عربی لفظ **عَزِیَ** سے ماخوذ ہیں: **عَزِیَ یَعزیَ عَزَاءً** مصیبت میں صبر کرنا ہے۔صفت مذکر **عَزٍ**، صفت مونث **عَزِیّۃ**، **عَزّیِ تعزیۃً۔ الرجل**، تسلی دینا، **تعزّی تعزِیاً۔ الیه**، منسوب ہونا ، **عنهُ**، صبر کرنا ، تسلی حاصل کرنا **تَعَازیٰ تَعَازِیاً۔القومُ**، ایک دوسرے کو تسلی دینا، **العِزِی**، صابر۔ ا؎ اسلامی فقہ و حدیث میں **عَزِیَ** کا ذکر جنائز کے آدابِ تلقین اور صبر و تسلی میں ملتا ہے۔کسی المناک واقعہ یا موت پر اظہارِ غم و الم، گریہ و زاری اور نالہ و بکا انسانی فطرت میں داخل ہے۔قرآن الحکیم کی آیت ہے: **وَانّه هُو اَضحک وَ اَبکیٰ** (اور یہ کہ اسی نے ہنسایا بھی ہے اور رلایا بھی ہے۔سورۂ نجم، آیت ۴۳)۔ اس حکم ربانی کی روشنی میں **امر بالمعروف و نهی عن المنکر** (نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا۔سورۂ حج، آیت ۴۱) کو قائم رکھنے کیلئے اسلامی عقاید کے اعتبار سے ایسے ادارے کی ضرورت ناگزیر تھی، جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں میں بھی جگہ بنا سکے۔اس مقصد کی تکمیل کیلئے سانحۂ کربلا کی یاد تازہ رکھنا بقائے حق کے لیے لازمی ہو گیا۔ کتاب'' امالیٰ'' میں ابن بابویہ نے امام رضاؑ سے روایت کی ہے : **مُتَذَکّرہُ مُصَابِنَانَبکِی وَ اَبکٰی لِما ارتکب مِنّا کانَ مَعَنا فِی دَر جتِنا یَومَ القِیمة** (جو شخص یاد کرے ہماری مصیبت کو اور روئے ان مصیبتوں پر جو ہم پر گزریں ، وہ شخص ہمارے ساتھ ہو گا ، ہمارے درجہ میں بروز قیامت) ۲؎

عزاداری اور تعزیہ داری کی اصطلاحیں سانحۂ کربلا کے مختلف و متنوع پہلوؤں کی نشر و اشاعت کے لیے مخصوص ہو گئی ہیں۔ ان کی بدولت آج تاریخِ اسلام کا ادنیٰ سا طالب علم بھی حسینی

انقلاب کے آثار و اثرات سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے۔ بلکہ ان ملکوں میں جہاں عزاداری کسی بھی شکل میں ہوتی ہے،ان میں ناخواندہ افراد بھی امام حسینؑ اور ان کے کار ناموں سے کسی حد تک روشناس ہیں۔ عزاداری کی مختلف ممالک میں متنوع کمیت و کیفیت ہے۔ مثلاً عراق وایران میں عزاخانہ کو حسینیہ اور بحرین میں ماتم کہتے ہیں۔ بیان عزا کو عراق میں قرایہ،ایران میں روضہ خوانی، بحرین میں عاشورہ اور لبنان میں تعزیہ یا ذکرہ کہتے ہیں۔ایران اور لبنان میں جلوس عزا کا کوئی خاص نام نہیں ہے لیکن عراق میں معازیہ یا معالب اور بحرین میں تعزیہ کہتے ہیں۔عزا داری کی ڈرامائی پیش کش کو ایران میں تعزیہ یا شبیہ،عراق میں شبیہ اور لبنان میں شبیہ یا تمثیل کہتے ہیں۔ ہندوستان (بلکہ برصغیر ہند) میں عزاداری کی اصطلاح حسینی انقلاب کے تمام اہم پہلوؤں کی نشر و اشاعت پر محیط ہے۔ تعزیہ روضۂ امام حسینؑ کی شبیہ کے لیے مخصوص ہے، جو عام طور پر جلوس عزا میں برآمد کیا جا تا ہے۔ تعزیہ مختلف شکلوں میں تیار کیا جا تا ہے، جو تعزیہ دار کے ذوق و مزاج اور مقامی رسم رواج کے اعتبار سے تیار کیا جاتا ہے۔

'مرثیہ' عربی لفظ **رَثَا** سے مشتق ہے : **رَثَا يَرْثُوْارَثْوًاورَثیٰ يَرْثِي رَثيا ورَثَاءً و رِشايَةً و مَرْثَاةً و مَرْثِيَةً ۔ ۔المیّتَ**۔ میت پر رونا اور اس کی خوبیاں گننا،مرثیے میں اشعار نظم کرنا۔[۳] اصطلاح میں مرثیہ ایسی صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی کی وفات یا شہادت کا ذکر کیا جائے ور اس کے دنیا سے رخصت ہونے پر رنج وغم کا اظہار ہو۔اس طرح اردو میں جو مرثیے لکھے گئے ہیں، ان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو واقعاتِ کربلا سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو دوسرے لوگوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اردو میں واقعاتِ کربلا سے متعلق مرثیے اتنی بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں کہ اب اردو تاریخ وتنقید میں جب 'مرثیہ' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ مرثیے ہوتے ہیں جو واقعاتِ کربلا سے متعلق ہیں اور جن کی ایک الگ ادبی وتہذیبی حیثیت ہے۔[۴]

زیر نظر مطالعہ میں عزاداری اور مرثیہ نگاری کو ایک معاشرتی رجحان اور عمرانی قوت کی حیثیت سے پیش کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ عزاداری نے سماجی عمل کی حیثیت سے زور پکڑا تو ادب میں اس کے مظاہر مرثیہ کی صورت میں رونما ہوئے۔ پھر دونوں باہمی طور پر ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے۔ اب کسی ایسے سماج کا تصور نہیں کیا جاسکتا جس میں عزاداری کسی حیثیت سے

موجود نہ ہو لیکن مرثیہ کا رواج ہو گیا ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عزاداری کی نوعیت و کیفیت کے اعتبار سے مرثیہ کی ہیئت، حدود اربعہ اور عناصر ترکیبی ترتیب پاتے ہیں، جن میں مرثیہ نگار اپنی ذاتی بصیرت، تجربوں کی بوقلمونی، ادراک وشعور کی بالیدگی اور انفرادی محسوسات کو اجتماعی تاثرات کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔مرثیہ نگار اپنی ذات کے حصار میں مقید رہ کر کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی تخلیق عزاداروں کی مجلسوں میں محاکمہ کے لیے پیش ہوتی ہے۔مختلف و متعدد کیفیات اور فنی معیاروں میں مرثیہ نگاروں کی کثرت میں عزاداری کی ضرورتیں وحدت پیدا کرتی ہیں۔بیانیہ میں داخلیت کے جلوے مرثیہ نگاری کے معجزے ہیں جن کے ذریعہ مرثیہ نگار عزاداروں کے دلوں کی تطہیر و تسخیر کرتا ہے۔عزاداروں کی مجلسیں جھاڑ، فانوس، کنول سے آراستہ ہوتی ہیں۔ ان میں شمعیں جھلملاتی ہیں جن سے اہل مجلس کے حسن ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے بلکہ ان سے زیادہ ان شمعوں کی روشنی مسحور کن ہوتی ہے جو عزاداروں کے دلوں میں محبت و مودت نبی اور آلِ نبی سے روشن ہوتی ہے۔چشمِ اشکبار پانی میں ڈوبے کنول کے جلنے کی علامت بنتی ہے۔

عزاداری اور مرثیہ نگاری کے ذریعہ انسانی حقوق واقدار کے صحیح تناظر کو تلاش کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ اردو مراثی میں جذباتِ انسانی کے جلوۂ صدرنگ میں ماں باپ بہن بھائی، چچا چچی، پھوپھا پھوپھی، دوست و احباب وغیرہ کے باہمی رشتوں میں حفظِ مراتب اور اخلاص کی بوقلمونی ایسی خوبصورتی سے پیش کی گئی، جو بڑی حد تک اردو شاعری میں مفقود تھی۔ مذہبی اقدار کے معیار پر اسلامی کرداروں کی شناخت ممکن ہوسکی کیونکہ مرثیہ میں واقعۂ کربلا کا بیان محض ایک المیہ کی پیش کش نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ تحریکِ تحفظ حقوقِ انسانی کی نشر و اشاعت ہوتی ہے۔مرثیہ ہر شخص کے لیے بلا امتیازِ رنگ ونسل اور مذہب صلح وآشتی کا پیغام ہے۔مراثی میں حقوق انسانی کے بنیادی محرکات کو وسیع ترین معیاروں پر پیش کیا جاتا ہے۔مرثیہ صدائے غفلت شکن بن کر انسانیت کو بیدار کرتا ہے۔ اس نے برصغیر ہند میں مشترکہ تہذیبی و ثقافتی عناصر کو فروغ دینے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

عصر حاضر میں اردو مرثیہ کے تعلق سے بعض اہم مسائل و مباحث سامنے آئے ہیں۔ اردو شاعری میں سانحۂ کربلا کو تخلیقی رجحان کی طرح شعری استعارہ کی حیثیت سے پیش کر کے گوپی چند نارنگ نے مرثیہ کے افہام و تفہیم میں نئی معنویت تلاش کی ہے۔ انھیں کے الفاظ میں: ''موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادتِ حسینؑ کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر

عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہاہے--- عام شاعری میں بنیادی حوالہ آتا تو ہے مذہبی تاریخی روایت ہی سے لیکن اس میں تہ در تہ استعاراتی اور علامتی توسیع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس میں ایک عالم گیر آفاقی معنویت پیدا ہو جاتی ہے، جس کا اطلاق تمام انسانی برادری کی عمومی صورتِ حال پر اور موجودہ عہد میں جبر و تعدی اور استبداد و استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے یا حق وصداقت کے لیے ستیزہ کار ہونے کی خصوصی صورتِ حال پر بھی ہوسکتا ہے۔'' ۵؎

وسیع مشربی تہذیبی ورثہ :

ہندوستان میں عزاداری کی اہم ترین انفرادی خصوصیت اس کا وسیع مشربی تہذیبی کردار ہے۔اس مختلف ومتنوع اور رنگا رنگ ملتوں ،قوموں، مذہبوں، روایتوں، زبانوں، بولیوں، موسموں، مزاجوں اور کرداروں کی سر زمین میں عزاداری 'صراط مستقیم' بن کر رہی ہے۔ ہندوستان میں مرثیہ کے اولین نقوش سرائیکی میں ہندو 'چارن' کی زبانی ملتے ہیں۔یہ قدیم ترین نمونہ سرائیکی زبان میں 'لولی' یا 'ڈوہرا' کی ہیئت میں ملتا ہے، جس کو پاکستان کے بھاول پور میں 'لولی' اور ملتان، مظفرگڑھ اور ڈیراجات میں 'ڈوہرا' کہا جاتا ہے۔ یہ دومصرعوں کا قدیم لوک گیت ہے، جواپنی ہیئت و زبان میں جوں کا توں ط ہے ۔ یہ دوہے بلوچستان،لس بیلہ، کچھی، تھرپار اور سندھ کے سرائیکی علاقوں سے لے کر صوبہ سرحد کے علاقوں تک یکساں مقبول و معروف ہیں، جو ان علاقوں کے ماہی گیروں ، چرواہوں اور کاشتکاروں کی زندگی کے ساتھی ہیں۔قوم چارن قدیم خاندانوں کے شجرے اور نسب نا ط رکھتے ہیں، ان کے بزرگوں کی تعریف سنا کرانعام واکرام حاصل کرتے ہیں۔ان میں ایک کبت قوم دت اور سانحۂ کربلا کے حوالہ سے ط ہے۔ روایت ہے کہ سندھی قوم دت کے بعض افراد امام حسین کی رفاقت میں شہید ہوئے تھے ، جن کو حسینی برہمن کہتے ہیں۔۶؎ اس کے بعد مختار کے ہمراہ قاتلانِ حسین سے بدلہ لینے (۶۵ھ / ۶۸۴ئ) میں بھی شامل رہے۔ مذکورہ کبت موجود ہے۔ ۷؎ جس کا زمانۂ تصنیف بکرما جیتی عہد کے قریب بتایاجاتاہے۔۸؎ لیکن نامانوس زبان اور طوالت کے پیش نظر اقتباس پیش کرنا مناسب نہ ہوگا۔

ہندوستان میں عزاداری کے قدیم ترین حوالوں کا جائزہ لیجیے تو واضح ہو جا تا ہے کہ اس کو سماجی اقدار کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے سرچشمے درباروں کے حصارتوڑ کرعوام الناس سے وابستہ رہے ہیں۔ہندوستان میں عزاداری کسی مخصوص حلقہ تک محدودنہیں رہی، بلکہ سماجی وتہذیبی زندگی

کا حصہ رہی ہے،جس کی عوامی مقبولیت میں سماج کے مختلف طبقوں نے اجتماعی انہاک کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستانی عزاداری تمام ملک میں بالخصوص شمالی ہند میں چھوٹے چھوٹے گاؤں ،قصبوں، اور شہروں میں مذہبی جوش وخروش سے عشرۂ محرم کے درمیان جلوس عزا کی شکل میں منائی جاتی ہے ، جن میں تعزیے برآمد کیے جاتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی انتہائی اہتمام سے عزاداری کرتی ہیں۔ لوگ سال بھر میں اپنی جائز کمائی سے زیادہ سے زیادہ رقم یکجا کرتے ہیں اورعشرۂ محرم میں صرف کرتے ہیں۔یہ صورت حال فقط آج کی نہیں ہے بلکہ عصر اینس میں بھی مسلمانوں کے علاوہ غیرمسلموں میں عزاداری رائج تھی۔ اس دور کی ایک انگریز خاتون مسز میر حسن علی اپنا مشاہدہ بیان کرتی ہے :

''ہندوؤں میں بھی تعزیہ سے عقیدت عام ہے۔ وہ لوگ تعزیہ دیکھ کر مودبانہ جھک جاتے ہیں۔مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔مسلمان بخوشی اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں--- میرا باورچی ایک مجوسی تھا۔عزاداری میں چالیس روپے خرچ کرتا تھا اور مسلمانوں کی طرح جوش وخروش کا اظہار کرتا تھا۔ روز عاشورہ دفن تعزیہ کے بعد اپنے دھرم کرم میں لوٹ آتا تھا۔''۹۔

اردو مرثیہ کے وسیع مشربی کردار کی نشان دہی اس کے اولین دور سے ہوتی ہے کہ اس کے پہلے مرثیہ نگار شاہ اشرف بیابانی ہیں جنھوں نے 'نوسرہار'کے نام سے شہادت نامہ لکھ کر ۹۰۹ھ/ ۴-۱۵۰۳ء میں اردو مرثیہ کی داغ بیل ڈالی۔

باراں کیتا ہندوہ مین قصہ مقتل شاہ حسین

موصوف خیر سے نامی گرامی صوفی صافی بزرگ تھے،حقایق و معارف سے واقف تھے، مقتدر صوفی بزرگ سید شاہ ضیا الدین رفاعی بیابانی کے خلیفہ وسجادہ نشین تھے۔ ان کے عقاید میں وسیع مشربی وہم آہنگی تلاش کی جاسکتی ہے لیکن ان کے برعکس شمالی ہند کے اولین شہادت نامہ' عاشور نامہ' کا مصنف روشن علی سہارنگ پوری (سہارن پوری) صوفی مسلک نہ ہوکر راسخ العقیدہ اہل سنت و الجماعت ہے، جو نہ صرف چار یار کی مدح کرتا ہے بلکہ شہادتِ امام حسینؑ کے بیان میں کہتا ہے:

پیمبر بھی آئے محمد کے سات کیا غم وزاری اور ماتم کی بات

چار یارو(ں) نے آکے زاری کیا بہت غم انھوں نے یہ بھاری کیا

اس شہادت نامہ کو مسعود حسین خان شمالی ہند کا پہلا مرثیہ اور اس کی تاریخ تصنیف ۱۲/صفر ۱۱۰۰ھ/۲۶ نومبر ۱۶۸۸ءقرار دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ''عاشور نامہ ادبی لحاظ سے جس قدر ساقط

الاعتبار ہے، لسانی لحاظ سے اسی قدر اہم دستاویز ہے۔''۱۰۱؎ چونکہ اس سے قبل کے مراثی دستیاب ہیں، ہماری تحقیق اس کی تائید نہیں کرسکتی۔لیکن اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور کی عزاداری میں کسی مخصوص فرقے یا مذہب کی تخصیص نہیں تھی۔شیعوں کی اکثریت یا مساوی آبادی کی بستیوں میں ہی نہیں بلکہ سہارن پور کی طرح کی بستیوں میں جہاں شیعوں کی آبادی برائے نام تھی،عزاداری کا عام رواج تھا۔اس کا ثبوت اس مرثیے کے سبب تالیف میں بھی ملتا ہے :

بعضے مرد ماں یوں کہا آئے کر اگر ہووے تم سے کرو یہ ذکر
کہ شاہزادے نبی کے ہیں آل انھوں نے سیتی ہے قائم بہ حال
بہ غربت انھوں نے ظلم ظالماں کہو جنگ نامہ بہ ہندی زباں

یہاں' بعضے مرد ماں' میں دیگر عقاید کے عزاداروں کی جانب اشارہ ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ دکن کی طرح شمال میں بھی عزاداری مسلمانوں کے کسی مخصوص حلقہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی خشت اوّل ہی وسیع مشربی بنیادوں پر رکھی گئی تھی۔مسلمانوں کے علاوہ ہندو مرثیہ نگاروں نے عزاداری کے وسیع مشربی کردار کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ان کے سرخیل معروف ومقبول مرثیہ نگار چھنولعل دلگیرؔ ہیں،جن کے مراثی میں والہانہ عقیدت نے انھیں اتنا محترم بنا دیا کہ ان کا نام احترامی کلمہ کے بغیر نہیں لیاجاتا اور' میاں دلگیر' کہتے ہیں ۔ یہی خصوصی احترامی رویہ دکّن کے ہندو مرثیہ نگار سیوا بیجا پوری کو حاصل ہے۔دکن کے دیگر غیر مسلم مرثیہ نگاروں میں راما راؤ اور داسؔ ممتاز ہیں تو شمالی ہند میں کنور سین مضطرؔ، الفت رائے الفتؔ، نانک چند نانکؔ، روپ کماری ،نتھولعل وحشی، کالی داس گپتا رضاؔ وغیرہ اہم مرثیہ نگاروں میں شامل ہیں۔

اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی:

یہ بات اتنی تواتر سے کہی جاتی رہی کہ اکثر لوگ ماننے لگے ہیں کہ اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی کی بنا پر لکھنؤ میں اردو مرثیہ کوعروج حاصل ہوا۔عصر انیسؔ میں اودھ کی حکمرانی شاہی کہلاتی تھی لیکن بساطِ سیاست پر انگریزوں کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔اس دور میں یا اس سے قبل کے کسی دور میں کسی مرثیہ نگار کو ان کے دربار دُربار سے کوئی قابلِ ذکر انعام و اکرام نہیں دیا گیا۔اور ان درباروں میں مرثیہ نگار کی سرپرستی کا کوئی شعبہ نہ تھا۔خیر سے

اس دور میں جب دربار آصفی میں ہُن برس رہا تھا، بقول مرزا غالبؔ :''وہ سرکارِ امیر گر تھی، جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا''۔ ۱۱؎

آصف الدولہ کو عزاداری سے والہانہ وابستگی تھی۔ بہ نفس نفیس ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندو مسلمانوں کے تعزیوں اور امام باڑوں کی زیارت کرتے، ان کی سیر چشمی کسی کو مایوس نہ ہونے دیتی، ہندو تعزیوں کو بڑے انعام واکرام اوراشرفیاں، مسلم تعزیوں کو چھوٹے انعام اور مرثیہ نگار کو روضہ خواں کے برابر پانچ سو سے ہزار روپے تک ۱۲؎ ان فیض یافتگان میں سکندرؔ، گداؔ، افسردہؔ، خلیقؔ، ضمیرؔ، فصیحؔ، دلگیرؔ وغیرہ کے نام نہیں ملتے، جن سے اودھ میں اردو مرثیہ کو پایۂ اعتبار حاصل ہوا لیکن اگر اس کے باوجود کوئی کہتا ہے کہ اودھ کے حکمرانوں کی سر پرستی اردو مرثیہ کے عروج کا سبب ہے تو میں مزید گفتگو کرنے کے بجائے اس سے اظہارِ ہمدردی کروں گا۔

واقعۂ کربلا کے موضوع پر مرثیہ کر فروغ دینے میں حکمرانوں کی سر پرستی کی تاریخ دیکھیے۔ امام حسین کی شہادت عظمٰی کے چوتھے سال (۶۴ھ/ ۶۸۳ ء) میں سب سے پہلے مختار بن ابو عبیدہ ثقفی نے انتقامِ قتل حسینؑ کے مقصد سے ابراہیم بن مالک اشتر کی سپہ سالاری میں جماعت توابین تیار کر کے حکمرانی قائم کی۔اس جہاد میں مختار اورابراہیم کے ہمراہ سلیمان بن صرد خزاعی، مسیّب بن نجبہ، عبداللہ بن سعد، رفاعہ بن شداد اور عبداللہ بن فضل وغیرہ شامل تھے۔واقعۂ کربلا سے متعلق ان کے مراثی ملتے ہیں۔لیکن یہ کوئی دربار سے وابستہ شاعر نہیں ، جماعت توابین کے سرفروش تھے،انتقامِ قتل حسینؑ کے لیے خود ہر طرح کی قربانیاں پیش کر رہے تھے اور لوگوں کو حق کی نصرت کی خاطر آمادہ کرنے میں شاعری کا استعمال کر رہے تھے، جو عربوں کا پرکھا ہوا طریقۂ کار تھا۔ان کے علاوہ عقبہ بن عمر السہمی اور سلیمان بن قتیبہ کے مرثیے ہیں، جن کا درباروں سے کوئی تعلق نہ تھا ۔سلیمان بن قتیبہ کی خصوصیت ہے کہ وہ شہادت امام حسینؑ کے تین دن بعد کربلا وارد ہوئے تھے ۔ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔اسی طرح کے بعض دیگر شعراء میں ابوالرمح ،جعفر بن عفان،کمیت ابو عمارہ، عبداللہ بن غالب اور دعبل خزاعی نے ائمہ اہل بیتؑ کے سامنے مرثیے پیش کیے۔ ان کے لیے مال دنیا کے طلب کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

دور خلافت بنی امیہ سے دور خلافت بنی عباس میں آل بویہ کے اقتدار میں آنے تک تین سو سال سے زاید (۱۴۱ھ/ ۶۶۱ ءتا ۳۵۲ھ/ ۹۶۳ئ) محبانِ اہل بیتؑ کے لیے دار و گیر کا زمانہ تھا،

جس میں جان کا بچانا مشکل تھا، کسی دربار سے اہل بیت کا مرثیہ کہہ کر انعام و اکرام لیا تو فوراً قتل کر دیا جاتا۔ حالانکہ مصر میں اسمٰعیلی عقاید کی حکومت ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں قائم ہو چکی تھی لیکن عزاداری کے فروغ و ارتقاء میں فاطمی خلافت کا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے البتہ آل بویہ کے اقتدار میں آنے کے بعد ۳۵۲ھ/۹۶۳ء میں معزالدولہ دیلمی نے عزاداری کا اذن عام دیا تو مرثیہ نگاری کیلئے فضا سازگار ہوگئی۔ اس دور کا سب سے مقتدر مرثیہ نگار ابو الفارس حارث ہے، جس نے بیانِ مصائب میں نئے پہلو پیدا کیے۔ دیگر مرثیہ نگاروں میں علی بن محمد منصور، طلحہ بن عبید اللہ، علی بن اسحٰق بغدادی، علی بن عباس، الشہیدی، احمد بن حسین الہمدانی، ابوالحسن سدی اور القاشی الاصغر اہم ہیں۔ لیکن ان میں کوئی درباری شاعر نہیں ہے۔

حکمرانوں کی سرپرستی میں مرثیہ کے فروغ و ارتقاء کا مسئلہ اگر ایران کے تناظر میں دیکھا جائے تو چشم کشا حقایق سامنے آتے ہیں۔ ایران میں اولین مراثی کا سراغ ملا۔ حسین واعظ کاشفی کی **روضۃ الشھداء** میں شامل عہد سلجوقی کے چند مراثی سے ملتا ہے۔ **روضۃ الشھداء** کو تاریخ عزاداری میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ایران میں ذاکری کو آج بھی روضہ خوانی کہتے ہیں اور ابتدا میں یہی صورت حال ہندوستان میں بھی تھی۔ اس کی تصنیف دورِ تیموری میں ہرات کے ایک شہزادے سید میرزا عبداللہ کی فرمائش پر ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۲ء ہوئی۔ مصنف سبزواری ہونے کی بنا پر شیعہ مشہور ہیں لیکن اصلاً اہل تسنن میں تھے اور مشہور صوفی شاعر عبدالرحمن جامیؔ کے برادرِ نسبتی تھے۔ ۱۳؎ اس میں شک نہیں کہ ایرانی حکمرانوں خصوصاً صفوی دورِ حکومت (۹۰۷ھ/۱۵۰۱ھ تا ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ئ) میں اپنے عقاید کی نشر و اشاعت پر زور رہا لیکن معروضی نظر سے دیکھیں تو دو سو سال کے طویل عرصے میں چند نام ہی ابھرتے ہیں؛ محتشمؔ کاشی (م:۱۵۸۸ئ)، حسنؔ کاشی، ملا مقبلؔ اور شیخ آذری (م:۱۴۶۱ئ)۔ ان میں سب سے اہم مرثیہ نگار محتشمؔ کاشی ہے۔ بقول سوداؔ: ''اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا۔'' ۱۴؎ لیکن اس عز و شہرت کا مدار محض ایک ترکیب بند ہے جو ۹۶ اشعار پر مبنی ہے۔ اس کو پروفیسر براون نے کسی غلط فہمی میں دوازدہ بند لکھ دیا ہے، جس کو لوگ دہراتے رہتے ہیں۔ ملا مقبلؔ اور شیخ آذریؔ دونوں ہجرت کر کے ہندوستان آگئے تھے۔ ملا مقبلؔ کی وفات ہندوستان میں ہوئی۔ ان کی مقبولیت **وقائع مقبلؔ** سے بھی ہے۔ شیخ آذریؔ کی شہرت سے متاثر ہو کر دکن کے بہمنی سلطان احمد شاہ اول (۳۴-۱۴۲۲ئ) نے خلعت فاخرہ نقد و جواہر پیش کرنے کے لیے دربار

میں طلب کیا اور آدابِ دربار کے مطابق زمین بوس ہوکر سلامی بجا لانا تھا۔غیور و خوددار مرثیہ نگار نے انعام و اکرام کی پیش کش کوٹھوکر ماردی کہ یہ سرتو فقط معبودِ حقیقی کے سامنے جھکتا ہے۔۱۵؎

شاہانِ صفوی کی داد و دہش اور فیاضی کے با وجود فارسی مرثیہ نگاری عربی مرثیہ کے ہم پلہ کوئی کارنامہ پیش کرنے سے کیوں قاصر رہ گئی، حالانکہ عرب میں حکومت کی سطح پر اہل بیتؑ کے سلسلے میں شدید ترین معاندانہ ماحول تھا جبکہ صفوی دور کے ایران میں اتنی ہی سازگار فضا تھی۔ اس میں سب سے بنیادی بات وہی ہے جو عربی کے مشہور مرثیہ گو متمم بن نویرہ نے حضرت عمر فاروق سے کہی تھی۔جب انھوں نے شکایت کی تھی کہ تونے جو مرثیہ میرے بھائی زید کا کہا ہے، اس میں وہ بات نہیں ہے جو تیرے بھائی کے مرثیہ میں ہے۔متمم کا جواب تھا، امیر المومنین ! زید آپ کا بھائی تھا، وہ میرا بھائی نہیں۔مرثیہ فرمائش،لالچ یا زر پاشی کا متحمل نہیں ہوتا۔اس میں خون دل کی حرارت، احساسات کی تپش اور موضوع سے دلی وابستگی کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ مرثیہ نگار کو جس ذہنی و ماحولیاتی ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے ،وہ کسی درباری فیاضی سے نہیں مل سکتی بلکہ اس کا سر چشمہ ہم مشرب عوام ہوتے ہیں۔ایران کا المیہ تھا کہ وہاں عزاداری میں شبیہوں کا عام رواج ہوگیا۔ ڈرامے کی کشش کیا ہوتی ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے مرثیہ کی متانت و سنجیدگی کو سخت صدمہ پہنچایا، ان میں فکر وفن کے اعلیٰ اقدار کے بجائے پست و ادنیٰ منظوم مکالمے لکھے جانے لگے۔مجموعی طور پر بھی ایران میں سیاسی خلفشار کی بنا پر فارسی شاعری کا زوال ہو گیا تھا۔ ایران کے باکمال شعرا و ادباء ہندوستان میں درباروں کی زینت بڑھا رہے تھے۔

دکن میں مرثیہ نگاری :

دکنی مراثی کی انفرادیت میں دکنیت کے امتیازات مضمر ہیں۔ ان کے ادراک کے بغیر ہندوستانی تہذیبی وثقافتی عوامل سے واقفیت ادھوری رہتی ہے۔اسی سرزمین سے اردو کو پایۂ اعتبار حاصل ہوا۔اگر سولہویں صدی میں کاملینِ علم وفن کے مرکز کی حیثیت سے دیکھا جائے تو شمال کے مقابلہ میں دکن مرجح ہے۔میر فضل علی انجو، خواجہ امدادالدین محمود گاواں،شاہ طاہر احمد،شاہ فتح اللہ شیرازی، ملاظہوری، محمد قاسم فرشتہ، میر مومن استرآبادی، برہان الدین جانم،امین الدین اعلیٰ وغیرہ اسی مردم خیز سرزمین کے گل سرسبد ہیں۔ ان کے علاوہ علمائ،صوفیہ اور شعرا و ادباء کی کثیر جماعت ہے اور ان کی سرپرستی کے لیے علم پرور و روشن خیال حکمرانوں کے سلسلے ہیں ،جن میں اکثر خود بلند پایہ شاعر

ہیں۔ اس علمی و تہذیبی فضا میں حب اہل بیتؑ میں سبقت کرنے کا عالم یہ ہے کہ دکنی مراثی کے محقق محمد چراغ علی کے بقول: ''صوفیائے کرام کے مراثی میں آلِ محمدؐ کی محبت میں جو دیوانگی نظر آتی ہے، وہ شیعہ مرثیہ گوشعراء کے جنون سے کبھی کبھی زیادہ ہی دکھائی دیتی ہے۔''۱۶؎ موصوف مزید لکھتے ہیں۔ ''دکن کے مرثیہ گوشعراء میں شیعہ اور سنی دونوں شامل ہیں اور دونوں بلا امتیاز یزید اور یزیدیوں پر لعنت بھیجتے ہیں--- دکنی مرثیے میں ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔''۱۷؎

دکنی سلاطین کی روشن خیالی، فنونِ لطیفہ کی سر پرستی، علمائ، ادباء وشعراء کی قدر افزائی، داد و دہش اور فیاضی کے واقعات تمام مورخین نے قلمبند کیے ہیں، اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کا ابر کرم ہر سمت سایہ کیے تھا، متعدد شعراء جس میں مرثیہ نگار بھی شامل ہیں، درباروں سے وابستہ تھے اور سب سے بڑھ کر ان میں بعض سلاطین خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر اور مرثیہ نگار تھے، یہ ایسے عوامل ہیں، جن سے مرثیہ کے فروغ وارتقاء میں یقینا بڑی مدد ملی۔ لیکن دکن میں مرثیہ کا فروغ وارتقاء تنہا سلاطینِ دکن کی سر پرستی کی بدولت ہے، ایسا کہنا مبالغہ پر مبنی ہوگا۔ اگر شاہی سر پرستی اعلیٰ درجے کے مرثیے کہلوا سکتی تو اسی دور میں ایران کے شاہانِ صفوی نے فروغ شیعیت کے لیے شاہی خزانے وا کر دیے تھے، سیم و زر کے توڑے تقسیم ہورہے تھے، مدح اہلِ بیتؑ کے نام پر زر پاشی ہورہی تھی لیکن فارسی مرثیہ نگاری ترقی نہ کرسکی۔ ان حقایق سے واضح ہوتا ہے کہ دکن میں مرثیہ کا ارتقاء وفروغ فقط شیعی سلطنتوں کی بدولت نہیں تھا بلکہ عزاداری ایک معاشرتی رجحان اور عمرانی قوت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں کی بلا تفریق شیعہ وسنی، عمومی معتقدات میں شامل ہو چکی تھی۔ مقتدر صوفیا کی شمولیت نے عزاداری کو عوامی مقبولیت عطا کی تھی اور دکن میں مرثیہ نگاری کے فروغ و ارتقاء کا سبب غم حسینؑ کو حرز جاں ماننے والے بلا تفریق مذہب و ملت عوام تھے۔

دکنی شاعری کے اعتراف میں میر تقی میرؔ کا شعر مشہور ہے:

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق تھا جو اپنا باشندۂ دکن تھا

اس سانولے سلونے، سنگِ موسیٰ سے تراشیدہ اور صباحت و ملاحت کے پیکر کو میرؔ کی راحتِ جاں بنانے میں گنگوتری سے کاویری تک کی پاکیزگی، علم وحکمت کی بوقلمونی اور تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستانیں شامل ہیں۔ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو شمالی ہند میں اردو کی اعلیٰ شاعری

کے بالعموم اور اردو مرثیہ کے بالخصوص تمام لوازم دکنی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ جوہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں ، جن کو ابھی تک تراشا نہیں گیا ہے۔ لسانی اعتبار سے اردو زبان ہندوی سے گجری، گجری سے دکنی ، دکنی سے ریختہ اور ریختہ سے اردو بلکہ اردوئے معلیٰ میں داخل ہوتی ہے۔ شاعری فنی بالیدگی حاصل کرتی ہے اور ہندوستانی ثقافت وتہذیب کو متعدد ومتنوع نئی نئی جہتیں عطا کرتی ہے۔دکن میں مرثیہ کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ دکن میں تمام بڑے شاعر مرثیہ نگار بھی ہیں۔ دکن میں مرثیہ کی تاریخ کا اجمالی بیان پیش کرنا بھی باعث طوالت ہوگا۔۱۸؎ ذیل میں دکنی مراثی کی اہم خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اولاً، دکنی مراثی میں فنی وتکنیکی اعتبار سے تنوع ورنگارنگی ہے۔ہیئتی طور پر مختلف اقسام شعر کا استعمال ہوا ہے، مثلاً منفردہ، مثلث، مربع،مخمس، مسدس، مسبع،مثمن،منسبع،معشر کے علاوہ ترکیب بند یا ترجیع بند میں بھی مرثیے نظر آتے ہیں۔مختلف اقسام شعر کے استعمال سے گوناگوں تجربات کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔ان میں منفردہ کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ بیجاپور، گولکنڈہ اور دیگر مراکز کے مراثی میں ہیئتی اعتبار سے یکسانیت ہے کہ عموماً (۹۵ فی صد) منفردہ میں ہیں ،جو عموماً غزل کی ہیئت میں لکھے گئے لیکن ان میں غزل کے ہیئتی نظام سے انحراف کی مثالیں بھی ہیں، خاص طور پر مرتضیٰؔ اور احمدؔ کے مرثیوں میں۔منفردہ مراثی کو سلام ،نوحہ ، واویلا وغیرہ بھی کہا گیا۔سلام کے لیے شرط رہی کہ ان کی ردیف میں 'السلام'، 'سلام علیک'،'صلوٰۃ'مرحبا'وغیرہ ہونا چاہیے۔ دکنی مراثی مثنوی کی ہیئت میں بھی ہیں۔شہادت ناموں کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ، شاہ قلی خان شاہی اور مرتضیٰؔ کے ایک ایک مرثیے مثنوی کی ہیئت میں ملتے ہیں۔

دوئم ، مسدس کی ہیئت میں پہلا مرثیہ بھی دکن میں احمدؔ نے (م: ۱۶۵۰ سے قبل ۱۹؎) لکھا۔ محی الدین قادری زورؔ نے اس کا نام تمیم احمد لکھا ہے اور اس کے سات مراثی کی نشان دہی کی ہے جو یونیورسٹی آف اڈنبرا میں محفوظ ہیں۔ ۲۰؎ ان میں سے مرثیۂ مسدس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

حیف گھائل حسین تن تیرا جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کیدھر تن تیرا یئو بسیرا ہوا ہے رن تیرا
نئیں ملتا پوند کس تیں پانی
سخت طفلاں کی سر پو حیرانی

جمیل جالبی نے احمدؔ کو گجراتی لکھا ہے،۲۱؎ جو ممکن ہے کیونکہ اس دور میں گجرات دکن کا حصہ تھا۔احمدؔ کے مرثیہ کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔۲۲؎ احمدؔ کے پندرہ مراثی کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی محفوظ ہیں۔

سوئم، دکنی مراثی میں عموماً آٹھ بحور کا استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے:۲۳؎

۱۔ بحر ہزج مثمن سالم (مفاعیلن ۴ بار) سب سے زیادہ مقبول رہی :

محرم کا چندر پھر کھن پو لے ماتم ہوا پیدا   جانمؔ

ماتم محرم کا انبر پھر جگ منے آیا   ملک خوشنودؔ

لیا یا سوکتے گوہراں امت پہ سب بخشش کیا   نصرتیؔ

اسی دکھ درد تھے آنجو گلا اس کا سکایا ہے   قطبؔ شہ

اس کے زحافات میں اخرب مکفوف، مسدس محذوف اور مسدس اخرب کا استعمال ہوا ہے لیکن ان کی تعداد کم ہے۔

۲۔ اس کے بعد بحر مضارع مثمن اخرب سالم (معفول فاعلاتن ۲ بار) مقبول رہی :

صلوات بر محمد صلوات بر محمد   احمدؔ

جب تے حسین کا غم جگ میں نشر ہوا   افضلؔ

۳۔ اور بحر رجز مثمن سالم (مستفعلن ۴ بار) مقبولیت میں اس کے بعد آتی ہیں:

ہیہات شہ کا درد ہے اس غم سوں عالم گرد ہے   فائزؔ

آیا محرم دہاؤ کر جب یا علی موسیٰ رضا   مرتضیٰؔ

ان کے زحاف میں بحر مضارع مثمن اخرب محذوف، مقصور و مکفوف اور بحر رجز میں مثمن سالم مذال بھی مروج رہی۔

۴۔ پھر بحر رمل آتا ہے جو مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں پیش ہوا :

مرحبا اے شاہ سرور مرحبا   مشتاقؔ

۵۔ ان کے بعد بحر متقارب سالم (فعولن ۴ بار) کا ذکر کیا جاسکتا ہے :

حسینا کے ماتم سوں آل حرم پر   شاہ راجوؔ قتال

لیکن اس کو زحافات میں مثمن مقصور، محذوف ، اثلم مقبوص یا دوازدہ و شانزدہ رکنی کے

ساتھ پیش کیا گیا۔

۶۔بحرخفیف کم ہی مروج ہوئی اور اگر ہوئی تو زحافات میں مسدس مخبون محذوف (فاعلاتن مفاعلن فعلن) کے ساتھ :

مکھ دکھایا چندر گگن سوں نکل مقیمیؔ

۷۔بحر متدارک (فعلن ۴ بار) بھی کم ہی مقبول تھی:

پوت نبی کے اتھے پیارے شاہیؔ

۸۔بحر منسرح بھی زحاف میں مثمن مطوی مکفوف (مفتعلن فاعلن ۲ بار) میں ملتی ہے لیکن سب سے کم :

آہے فلک کیا کیا آہے فلک کیا کیا ملک خوشنودؔ

دکنی مراثی میں خالص ہندی بحروں میں کوئی مرثیہ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ دکنیت کے ابتدائی اور متوسط ادوار میں ہندوی و گجری اثرات کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ بحیثیت مجموعی بحور کے معاملے میں دکنی مرثیہ نگار عربی و فارسی روایات کے پاسدار رہے ہیں۔البتہ بعض مقامات پر فنی جدت طرازیاں مروجہ روش کی خلاف ورزی کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ مثلاً عبد العزیزؔ نے بحر متدارک مخبون میں جدت کر کے شانزدہ رکنی (فعلن ۸ بار) مرثیہ ' آیا محرم بھاگ میں چنداغل اچایا ہے' لکھا ہے۔اس میں مزید جدت یہ بھی رکھی کہ مرثیہ کے اوّلین مصرعوں میں ردیف و قافیہ کی پابندی کی گئی۔

چہارم، مذکورہ بالا آٹھ بحور کے انتخاب میں فن موسیقی کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دکن میں مرثیے عموماً لحن و ترنم سے پڑھنے کا رواج تھا۔ اس لیے مرثیے کو تال اور سُر سے بے نیاز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔مرثیہ کی خوانی کے درمیان سینہ زنی بھی اصوات کی پر سوز نغمگی میں الفاظ کی جھنکار چاہتی ہے جس میں مرثیہ نگاروں کی موسیقی میں مہارت نے بیانِ جذبات کو راگ راگنیوں میں ڈھال دیا۔حالانکہ محمد قلی قطب شاہ نے بعض دیگر مرثیہ نگاروں کی طرح اپنے مراثی میں راگ راگنیوں کی نشاندہی نہیں کی ہے، جبکہ دیگر اقسام شعر میں اس کی نشاندہی کی ہے لیکن اس کے مراثی میں موسیقیت کا التزام اچھی طرح محسوس ہوتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نے اپنے مراثی کے لیے راگ راگنیاں تجویز کر دی ہیں۔ مثلاً ' حسین ابن علی کے دکھ بدل تن کوں گلانا ہے' (بحر ہزج مثمن سالم) کیلئے ' ہنڈول راگنی' تجویز کی ہے جو عموماً دوپہر میں گائی جاتی ہے۔ اسی بحر میں دو اور مرثیے ہیں؛ 'دیکھو کیا

غمِ نبوت کے ہوا ہے خاندان اوپرؔ اور'علی ہور فاطمہ یودواتھے سبحان کے پیارے'؛ دونوں مرثیوں کے لیے 'دیپک راگ' کی سفارش کی ہے۔ ساتھ ہی ان میں پہلے مرثیہ کے لیے اس کی قسم 'بھارجا' تجویز کی ہے جو شام سے پہر رات تک گائی جاتی ہے اور دوسرے مرثیہ کے لیے 'دیپک پتر' جو آدھی رات سے پچھلے پہر تک گائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر ہزج مثمن سالم 'ہنڈول راگنی' اور 'دیپک راگ' دونوں میں گائی جا سکتی ہے۔اسی طرح شاہیؔ کا ایک مرثیہ 'دیکھ محرم کا چاند سکھ کوں بسا رُو تمام' بحت منسرح مثمن مطوی مکفوف مقصور میں ہے ،جس لیے' جج ونتی' اور 'دیپک بھارجا' کی سفارش کی ہے۔ ایک اور مرثیہ نگار عبد العزیزؔ نے اپنے مرثیہ کے مقطع میں راگنی کا نام بہاگ (بیہاگ) بتاتا ہے اور پڑھنے کو' گانا' کہتا ہے:

سایا رکھو صاحب حسین غم ماتم یو آیا ہے عبدالعزیزؔ نے بہاگ میں ماتم شہ کا گایا ہے

ان راگ راگنیوں کے اثرات دکن کی مرثیہ خوانی میں الاوے کی گشت میں ہنوز دیکھے جا سکتے ہیں۔

پنجم ، دکنی مراثی میں صنائع و بدائع کا متوازن استعمال نظر آتا ہے۔ خاص طور پر تشبیہ ، استعارہ اورحسن تعلیل پر زیادہ زور ہے۔تشبیہات و استعارات میں مقامی رنگ و آہنگ نمایاں ہے۔ فارسی وعربی کی مروجہ تشبیہات کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی اشیاء سے مزین تشبیہیں نظر آتی ہیں، جو زیادہ تر معنی خیز و دلچسپ ہیں۔تشبیہ کی چند مثالیں دیکھیے :

سرورے دین کا تیغ سوں جیوں شمع تن سوں ظالم کیے جدا سر آج امینؔ
مرتضیٰؔ اُپر اچھو تیرا سایہ جیوں دنیا کے اُپر دھریا ہے چاند مرتضیٰؔ
سٹیا کاٹ ککڑی نمن سب شقی ملا خود و بکتر سلامٌ علیک دردیؔ

تشبیہ موکد ،جس میں حروفِ تشبیہ غائب ہیں، مثال دیکھیے :

نئیں حشر توں کیا ہے میدان کر بلا میں اس آفتابِ دیں کا نیزہ پو سر ہوا ہے احمدؔ
ماریا ہے غم کے تیشے سوہن کیا ہڈیاں کوں لہو رگاں کا دل بے خبر ہوا ہے ملک خوشنودؔ

استعارہ کی بہتر مثالیں بھی دکنی مراثی میں نظر آتی ہیں۔اس کو مقامی لسانی سیاق و سباق میں دیکھیں تو معنویت کے نئے باب کھل جاتے ہیں اور بلاغت کے اعلیٰ معیاروں کا اندازہ ہوتا ہے :

جس روز تے اسو رچلیا جگ سوں کر وداع اس روز سد ہوا سفر این کر بلا منے شاہیؔ

تقدیر سبحانی یو تھا تدبیر اس جا کچھ نہ تھا راضی قضا سوں ہوا پس وہ شیر نر مائل ہوا امینؔ
ایمان کی زمین پر کیوں نا پڑے اندھارا اسلام کے گگن کا پنہاں چندر ہوا ہے احمدؔ

دکنی مراثی میں حسن تعلیل پر سب سے زیادہ زور نظر آتا ہے، جس کا استعمال بیشتر مرثیہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس صنعت کی خصوصیت ہے کہ اس کے ذریعہ غمِ حسینؓ کی آفاقیت بیان کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ کو غم حسینؓ میں شامل کر سکتے ہیں۔ مرثیہ نگار اپنی ذاتی محسوسات کو آفاقی بنا کر فطرت کے مظاہر کی صورت میں پیش کر سکتا ہے۔ پہاڑ، دریا، چرند، پرند، درخت، پتے، پھول، چاند، سورج، آسمان، چاندنی دھوپ، بادل، بارش، غرضیکہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے حسن تعلیل کے وسیلے سے مرثیہ میں فضا آفرینی کی جاسکتی تھی اور کی گئی۔ حسن تعلیل کا استعمال شمالی ہند کے مراثی میں بھی ہے لیکن دکن کی طرح کا زور نہیں ہے۔ مرتضیٰؔ نے ایک پورے مرثیہ میں چاند کے تعلق سے حسن تعلیل کا استعمال کیا ہے:

یو عزیزاں دسیا محرم چاند سب دلاں کو ارکھیا ہے غم سوں باند

چند دیگر مثالیں دیکھیے:

آسمان نیلا پیر ہنیا ہے اس غم ستی خورشید غم نا تاب لیا پھاڑ یا لباس زرزری ہاشمیؔ
نئیں شفق اس سوز کی دیتے خبر چاند لہو میں سے سے پگ لگ نہائیا عبدلؔ
مکھ نوچ لے گگن میں گا لیا جیا چندر سے اس غم سوں آج کالا مج کوں اگر ہوا ہے خوشنودؔ

دکنی مراثی میں صنعت ترصیع اور صنعت تلمیح کا استعمال بھی کثرت سے نظر آتا ہے۔ صنعت ترصیع کی مقبولیت کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے کلام کی موسیقیت میں زبردست اضافہ ہوتا ہے اور موسیقیت کا التزام دکنی مراثی کی انفرادیت ہے۔ مصرعوں میں ہر لفظ کے ہم وزن ہونے کی بنا پر خود بخود لحن و ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ صنعت ترصیع کی مثال دیکھیے:

وک آگ سوں جگ بن جلے آکاش تا دھرتی ہلے
کھن پر فرشتے کھلبلے سٹ اختیاری وائے وائے قطبؔ شہ
اس دکھ سے دنیا سب جلی پاتال لگ دھرتی ہلی
سب کھن اچھایا کھلبلی کیا کام کیتا ہائے ہائے غواصیؔ

صنعت تلمیح کی مقبولیت کے اسباب ظاہر ہیں کہ مراثی میں مختلف تاریخی و مذہبی واقعات و

حالات اور کرداروں کے حوالے آتے ہیں۔ ملک خوشنودؔ نے اپنے ایک مرثیہ کے ہر شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے:

سندر دو نین ہیں پر وے تن کے بالا   آدم کے آج تن میں جیئو بحر و بر ہوا ہے

صنعت تجنیس کا استعمال سب سے کم ہوا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

کیا ہے مہمانی یوں اماماں کا محرم توں   جنگل میں کربلا کے سب بلایاں کو بلایا ہے   قطبؔ شہ

ششم، دکنی مراثی کے مطالعہ میں اردو زبان کے دور اولیں کے نہ صرف لسانی مباحث سامنے آتے ہیں بلکہ اس وسیع المشربی تہذیبی کردار سے روشناسی ہوتی ہے جو اردو زبان وادب کے فروغ و ارتقا میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ دکنی مراثی کی زبان میں مقامی بولیوں کے علاوہ برج، اودھی، راجستھانی، گجری کے تدبھو الفاظ اور سنسکرت تتسم الفاظ کا ذخیرہ نظر آتا ہے۔ ان میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کے ذخیرۂ الفاظ میں ہندوستانی رنگ و آہنگ نے لسانی وتہذیبی معیاروں پر ہم آہنگی کی دلچسپ مثالیں پیش کر دی ہیں۔عربی و فارسی الفاظ سنسکرت تدبھو اور تتسم الفاظ تحلیل ہو کر نیا روپ دھارن کرتے ہیں۔ اس کا ایک جزو ملکی ہوتا ہے اور دوسرا بین الملی۔ چونکہ اس دور مراثی میں غزل سے مختلف سوز و گداز، سپردگی اور وارفتگی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ اس میں خارجیت سے داخلیت جنم لیتی ہے۔ مرثیہ نگار خود بھی تڑپتا ہے اور دوسروں کو بھی تڑپاتا ہے۔

خدایا قطب شہ کوں بخش توں حرمت اماماں کی
کہ ان کی مدح کا حلقہ میری کن میں سُہایا ہے

نہم، دکنی مراثی میں واقعات کربلا کو تاریخی صداقت کے ساتھ لکھنے کا رجحان ابتدا سے نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں محمد قلی قطب شاہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے،جس نے احادیث سے واقعات نظم کیے ہیں۔اسی طرح اس کے نواسے عبد اللہ قطب شاہ (م: ۱۶۷۲ئ) نے اپنے ایک مرثیہ میں تاریخی تسلسل سے واقعاتِ کربلا پیش کیے ہیں۔ امام حسینؑ کا رخصت آخر کے لیے آنا، وصیت کرنا، شہر بانو کی فریاد، بچوں کا تقاضۂ آب، شادیِ قاسم، نوعروس کی زاری، امام حسینؑ کی شہادت، اہلِ حرم کا قید کیا جانا، دربارِ یزید میں پیشی، سرامام سے یزید کی گستاخی، بین وغیرہ اختصار مگر جامعیت سے پیش کیے ہیں۔علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ (م: ۱۶۷۳ئ) بھی بیان میں تصور کی جولانیاں دکھانے کی

بجائے صحیح واقعات کے لکھنے پر زور دیتا ہے:

بہت افسوس ہور غم تے لکھیا جو مرثیہ شاہیؔ ادھر یک بول کے اوپر جگت سب تلملایا ہے

دہم، دکنی مراثی میں چند ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو شمالی ہند کے مراثی میں دوسو سال کے بعد عصر انیسؔ کے مرثیوں سے مخصوص ہیں۔مثلاً مراثی میں ساقی نامہ، مکالمہ نگاری وغیرہ۔

علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ حضرت علیؑ کو 'پیا' کہہ کر مخاطب کرتا ہے، فقط شرابِ دید کی ہی تمنّا نہیں کرتا بلکہ ان کی رفاقت میں شرابِ طہور پینے کا بھی متمنی ہے:

آ رے گلال مج کوں پیالا پلامیا کا تا مست ہو کے دیکھوں مکھڑا علی پیا کا

شیشا شراب کا یوں دستا ہے سرخ رنگ میں گو یا شفق میانے خورشید ہے ضیا کا

پیو سات رات جاگوں پیالا پیا سو مانگوں پیالا سچا وہی ہے پیو ہات کے دیا کا

مرزاؔ بیجا پوری بقول استا ذی مسیح الزماں: ''عادل شاہی دور کا سب سے بڑا مرثیہ گو ہے۔''[۲۴] اپنی تمام عمر مرثیہ نگاری میں صرف کر دی۔حمد خدا، نعت نبی، منقبتِ اہل بیت اور بیانِ شہدائے کربلا کے لیے اپنی زبان مخصوص کر دی۔کسی امیر یا بادشاہ کی شان میں مرثیہ لکھنا کجا، ایک شعر بھی نہیں کہا۔علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ اس کا بڑا مربی تھا، قصیدہ کی فرمائش ہوئی تو ایک مرثیہ کہا، تخلص میں شاہیؔ لکھ کر پیش کر دیا۔اس البیلے شاعر نے حضرت حر کے حال میں ۱۶۸ شعروں کا مرثیہ لکھا۔

او شہیداں جن اُپر خوشنود ہے نت کردگار مصطفٰی شاہِ رسل ہور حیدرِ دلدل سوار

شہ اُپر او سب خوشی سوں جیو فدا کیتے ہیں یوں شمع پر اُپس پتنگ گرتا ہے نت قربان جیوں

سب شہیداں راست ہیں کا ولے سارباں منے حر کو ہے اگلا شرف جیوں چاند کو تاریاں منے

جب کھڑیا غم شہ اُپر تب سب شہید افضل ہوئے حر ولے ساریاں منے کامل شہید اول ہوئے

اس مرثیہ میں مرزاؔ نے مرثیہ کے وہ تمام عناصر ترکیبی اپنے انداز میں پیش کیے ہیں جو شمالی ہند کے مراثی میں دوسو سال کے بعد تلاش کیے گئے، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین۔

شمال میں مرثیہ نگاری:

شمالی ہند میں اردو کی لسانی شناخت ریختہ سے ہوتی ہے جس کو میرؔ تقی میرؔ نے ''شعریست بطور شعر فارسی بزبانِ اردوئے معلٰی شاہ جہان آباد دہلی۔''[۲۵] قرار دے کر اس کی چھ قسمیں بتائی

ہیں: (۱) ایک مصرع فارسی میں اور دوسرا ہندوی میں ہو۔(۲) نصف مصرع فارسی اور نصف ہندوی ہو۔ (۳) حرف وفعل فارسی ہوں۔ (۴) فارسی تراکیب استعمال کی جائیں۔ (۵) اور (۶)۔ مراثیِ ریختہ میں اولین چاروں صورتیں موجود ہیں۔

شمالی ہند میں اردو مرثیہ نگاری کے سمت و رفتار اور انفرادیت کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقایق پر نظر رکھنا منسب ہوگا:

اولاً، شمالی ہند میں اب تک دستیاب اردو مراثی میں قدیم ترین ایک بیاض۲۶ ہے۔ جس کے ترقیمہ میں درج ہے: ''تمام شد ایں بیاض بروز سہ شنبہ تاریخ یازدہم ربیع الثانی ۲۰ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی دستخط فقیر حقیر محمد مراد''۔ یعنی صحیح تاریخ کتابت ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۵۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۷۳۸ء ہوئی۔ اس بیاض میں مراثی ہیں، جن میں ۳۷ مراثی فارسی اور ۱۱۳ مراثی اردو میں ہیں۔ صلاحؔ کے ۶۸ مراثی ہیں۔ باقی مراثی قربانؔ علی، قاسمؔ، خادمؔ، سعیدؔ، ہدایتؔ، کلیمؔ، محبؔ، صادقؔ وغیرہ کے ہیں۔ان مرثیہ نگاروں کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ لیکن ان کے لسانی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان اسی طرح ہے جو امیر خسروؔ (۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ئ) کی جانب منسوب ہے، جس میں ہندوی اور فارسی سے مرکب زبان کا استعمال ہوا ہے۔ اس لیے ادیبؔ نے ان کو اردو کے بجائے 'مراثیِ ریختہ' کہا ہے اور ان کو میر جعفر زٹلی (م: ۱۷۱۱ء) سے قدیم ترمانتے ہیں۔۲۷ ماہر لسانیات استاذی ہر دیو باہری ان مراثی کی زبان و اسلوب میں فارسی وعربی غلبہ کے باوجود پراکرت کے تتسم اور تدبھو کینڈے کی بنا پر اس کے لسانی علاقہ کی زبان قرار دیتے ہیں، جو شاہان شرقی (۸۷۔۱۴۰۱ئ) کے زیرنگیں تھا۔ ۲۸ اس طرح ان مراثی کی قدامت پندرہویں صدی عیسوی سے وابستہ ہوتی ہے۔شاہان شرقی کے عہد میں عزاداری کا ذکر ملتا ہے ۔۲۹

مذکورہ بالا نادر مخطوطہ میں اردو کے ۱۱۳ مراثی میں ۹۵ منفردہ(۹۳ بطرز قصیدہ اور ۲ بطرز مثنوی)،۶ مربع اور ۱۱ مخمس ہیں۔ مسدس میں کوئی مرثیہ نہیں ہے۔مثنوی کی ہیئت کے دونوں مراثی میں واقعات مسلسل بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں صلاحؔ کے مرثیہ بطرز مثنوی۔ 'اے محباں از غمِ آلِ عبا' جو حضرت قاسم کے حال میں ہے، اس میں رخصت، جنگ، شہادت اور بین کا التزام ہے، جن کو بعد کے ادوار میں ناقدین نے اردو مرثیہ کے عناصر ترکیبی قرار دے کر بہترین مرثیہ کے لوازم میں شامل کیا۔

دوم،شمالی ہند میں اردو ادب کی باقاعدہ تاریخ عہد محمد شاہ (۴۸۔۱۷۰۲) سے شروع ہوتی ہے۔ اس دور میں بھی کئی مرثیہ نگار نمایاں ہیں، آبروؔ، یکرنگؔ،حاتمؔ،مسکینؔ،حزیںؔ، اور غمگینؔ۔ان کے علاوہ سب سے اہم نام فضل علی فضلیؔ ہے۔ان کی روضہ خونی پر مبنی کتاب ''کربل کتھا''(۱۱۴۵ھ مطابق ۳۳۔۱۷۳۲ئ) معروف بہ **دہ مجلس** کو اولیت حاصل ہے جو مجالس عزا میں پڑھی جاتی تھی۔ یہ کتاب عرصے سے اہلِ اردو کے لیے عنقا تھی۔ اس کی تلاش وتحقیق کا شرف خواجہ احمد فاروقی کو حاصل ہوا جنھوں نے ہیم برگ(جرمنی) میں پرشا کی اسٹیٹ لائبریری کے ذخیرۂ اسپرنگر سے اس نادر نسخے کو جس سے اب تک چشمِ مغرب روشن تھی اور جس کو متاعِ بازیافت کہنا چاہیے۔۳۰؎ حاصل کر کے اپنے گراں قدر مقدمہ اور مبسوط حواشی کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ **دہ مجلس** کے طرز پر کئی کتابیں ملتی ہیں، جن میں سب سے اہم **یازدہ مجلس میرحسنؔ دہلوی** معروف بہ **اخبار الائمہ** ہے،جو محمد کمال الدین حسینی ہمدانی کی مساعی سے شائع ہو گئی ہے۔فضلیؔ(م: ۱۷۴۹ئ) اور میرحسنؔ (م: ۱۷۸۶ ئ) کے زمانہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں نے روضہ خوانی کے اپنے مجموعوں میں مراثی بھی شامل کیے ہیں۔فضلیؔ کا ایک مرثیہ میں، جو ۳۳ بندوں پر مشتمل ہے، گھوڑے کے بیان سے ابتدا ہوتی ہے:

شہ کے جب حلق پر چلا خنجر   بہ بہا ہو ر بہا خنجر
گھوڑا دیکھا کیا کیا خنجر   کیا خداوند کا سر جدا خنجر

میرحسنؔ نہ صرف اس لیے ہیں کہ موصوف انیسؔ کے جد ہیں بلکہ خود بھی مرثیہ نگار تھے۔ میرحسنؔ بڑے بیٹے میر احسن خلیقؔ نے بھی دہ مجلس کا مسدس میں منظوم ترجمہ (ت:۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ئ) کیا تھا۔

سوم،شمالی ہند کے اولین مراثی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شعری روایتیں دکنی مراثی سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ البتہ لسانی محاوروں میں اختلاف نظر آتا ہے۔ اس سے سید مسعود حسن رضوی نے مذکارہ بالا قدیم ترین بیاض میں استعمال شدہ زبان کی بنیاد پر دلیل قائم کی :''ان لفظوں کی کلیتہً عدم موجودگی سے صاف ظاہر ہے کہ ان مرثیوں کی زبان دکنی نہیں ہے ۔''۳۱؎ حالانکہ ان مراثی میں صدہا الفاظ ایسے ہیں جو دکنی میں بھی مستعمل ہیں ۔ مثلاً اَپَس(اپنا)، اگن (آگ)، انجھوا(آنسو)،ایو(یہ)، ایہی(یہی)، بپت (مصیبت)،بچن (قول)،

توں (تو)، جگ (دنیا)، جیو (جان)، رکت (خون)، رتن (جوہر)، سنگ (ساتھ)، کوں (کو)، گگن (آسمان)، لوہو (لہو) ہمن (ہمارے) ہور (اور) وغیرہ ۔ یہ الفاظ اسی صورت میں یا قدرے تبدیل ہو کر عرصہ دراز تک (ناسخؔ کی اصلاح زبان تک) اردو مراثی میں مستعمل رہے۔

اختر اورینوی نے پھلواری شریف کے دستیاب مراثی کا، جن کا زمانۂ تصنیف یا خوانندگی ۱۲۰۶ھ / مطابق ۱۷۹۱ء تا ۱۳۰۶ھ / لغایت ۱۸۲۰ء کے درمیان ہے، لسانی تجزیہ کیا ہے۔ مغربی پراکرتوں میں ان کے تبدیل ہونے، بولیوں کی لسانی ترکیب، پنجابی کے اثرات وغیرہ پر بحث کر کے نتائج برآمد کیے ہیں۔ ۳۲ ؎ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ سے دکنی اور شمالی ہند کے ابتدائی مراثی کے درمیان تخلیقی تسلسل کا احساس کیا جا سکتا ہے۔

عام تصور ہے کہ شمال کے مراثی پر فارسی و عربی مراثی کی روایات کے زیادہ اثرات ہیں اور دکنی مراثی پر مقامی اثرات کارفرما ہیں لیکن اگر ملا وجہیؔ، غواصیؔ اور ان کے دیگر معاصرین کے مراثی کو دیکھیں تو ان میں 'پیروی فارسی' کی روایت کی پاسداری زیادہ ہی نظر آئے گی۔ ان میں خان دوراں درگاہ قلی خان (م: ۱۷۶۶ئ) دکن اور شمال کو اپنی غیر معمولی شخصیت سے پُل کی طرح جوڑتے ہیں اور ان کے مراثی میں (جن پر تاریخ تصنیف ۸۰۔۱۱۶۷ھ/۶۶۔۱۷۵۳ء ہے۔ ۳۳ ؎ عربی و فارسی یا ہندوی کے دو دو مصرعے دوہرہ بند ہیں۔ ان کے مراثی منفردہ، مثمن، مخمس اور مسدس میں ہیں۔ ان کے معاصر پھلواری شریف کے شاہ محمد آیت اللہ جوہریؔ (م: ۱۷۹۵ئ) کے مسدس کی ہیئت مرثیہ کی بیت بھوج پوری میں ملتی ہے۔ بلکہ شاہ ظہور الحق ظہور پھلواری (م: ۱۸۱۸ئ) نے تو بھوج پوری اور اردو کی ملواں زبان میں مرثیے لکھے۔ اس کے برعکس شاہ امان علی ترقیؔ (م: ۱۸۳۸ء) اور شاہ ابوالحسن فردؔ (م: ۱۸۴۸ء) کے مسدس مراثی بیت فارسی میں ملتی ہے۔ عربی و فارسی یا ہندوی الفاظ و تراکیب کی ملاوٹ کو آزادؔ نے بہت ہی پیارے انداز میں سمجھایا ہے: ''اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس ملائی مگر وہ اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصا میٹھا، ایک بالکل پھیکا ہے، پھر ایک مصری کی ڈلی دانت تلے آ گئی۔'' ۳۴ ؎

چہارم، شمالی ہند کے اولین مراثی اور دکنی مراثی کے بحور کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکنی مراثی کی مذکورہ بالا آٹھوں بحور (بہ اختلاف ترجیحات) شمالی ہند میں بھی مروج ہوئے بلکہ ان میں چند ایسی بحریں بھی رائج ہوئیں جن کا دکن میں رواج نہ تھا۔ ذیل میں ان کی تفصیلات

درج کی جاتی ہیں :

۱۔ بحر خفیف مسدس مخبون ابتر (فاعلاتن مفاعلن فعلن)

شہ کے جب حلق پر چلا خنجر — فضل علی فضلیؔ

۲۔ بحر متقارب مثمن مقصور (فعولن فعولن فعولن فعول)

محرم کا نکلا ہے پھر کر ہلال — میر تقی میرؔ

۳۔ بحر متقارب مثمن مسبغ (فعولن فعولن فعولن فعو)

ستاروں کی آمد ہے کالی گھٹا میں — عشقؔ

۴۔ بحر متدارک مخبون مسکّن شانزہ رکنی (فعلن ۸ بار)

سر پیٹ کے زینب رووت ہے اب ٹوٹ گئی من کی آسا سکندرؔ

۵۔ بحر رجز سالم (مستفعلن ۴ بار)

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے — فصیحؔ

۶۔ بحر کامل مثمن سالم (متفاعلن ۴ بار)

کہا رو کے باپ نے اے پسر جو امام زادہ ہے صبر کر فصیحؔ

۷۔ بحر خفیف مسدس مخبون ابتر (فاعلاتن معاعلن فعلن)

عشق تاجِ سرِ فصاحت ہے — عشقؔ

۸۔ بحر خفیف مسدس مخبون مقصور (فاعلاتن معاعلن فعلان)

ماں سے اصغر وداع ہوتے ہیں — تعشقؔ

پنجم، دکن کی طرح شمال میں بھی ابتداًمیں مرثیے عموماً لحن وترنم سے پڑھنے کا رواج تھا۔ بعد میں لحن وترنم نے فن سوزخوانی میں ڈھل گئی تو فن موسیقی کی کارفرمائی اتنی شدت اختیار کر گئی کہ نالہ پابندِ تال وسم ہوگیا۔ دکن کی طرح شمال کے بعض مراثی پر بھی راگ راگنیاں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ مثلاً کتب خانہ سالار جنگ میں مسکینؔ کے ان مرثیوں پر پڑھنے کی راگ راگنیاں درج ہیں :

مرثیہ مقام پوربی : جب کہ قاسم نے پہن گلے میں شہانہ باگا

مرثیہ در راگنی پرچ : باپ سے اپنے اکبر شہ نے رن کی جو رخصت پائی ہے

ششم، شمالی ہند میں مسدس کی ہیئت میں کب اور کس نے پہلی بار مرثیہ لکھا، ان

سوالوں کا جواب میرے نزدیک میاں مسکینؔ ہیں۔ ان کے دو اور بھائی حزیںؔ اور غمگینؔ تھے، جن کا کلام نہیں ملتا لیکن تینوں بھائی مرثیہ گوئی میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ ان میں مسکینؔ سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کا نام میر عبداللہ تھا۔۳۵؎ میر عبد اللہ کی مرثیہ خوانی کی مدح میں درگاہ قلی رطب اللسان ہیں۔ موصوف ۱۱۵۱ھ/۳۸-۱۷۳۷ء میں دہلی گئے اور تین سال قیام کے بعد دکن لوٹ گئے تھے۔ دورانِ قیام دہلی مسکینؔ کی مجالس میں شرکا ء کا ازدحام دیکھا تھا۔۳۶؎ سوداؔ نے بھی مسکینؔ کا ذکر اپنے ایک قصیدہ میں کیا ہے۔ مسیح الزماں کے نزدیک اٹھارویں صدی کے نصف اوّل کو مسکینؔ کے عروج کا زمانہ قرار دینا مناسب ہے۔۳۷؎

مسکینؔ کے کئی سو مراثی مختلف ذخائر اور کتب خانوں میں ہیں۔ان کے مراثی میں مسدس کی ہیئت ابتدائی مراحل میں ہے ،جس میں ایسے مرثیے بھی ہیں کہ چار مصرعے مربع کے اور دو مصرعے فارسی میں ہیں۔ کبھی ان کی بحور بھی تبدیل ہوگئی ہیں۔ مسکینؔ کے ہم عصر محبؔ نے مسدس کی ہیئت کو ایک قدم آگے بڑھایا۔ انھوں نے مربع کے چار مصرعوں کی بیت بھی برج یا فارسی کی بجائے اردو ہی رکھی۔ خان دوراں درگاہ قلی خان کا مرثیہ بھی مسدس کی ہیئت میں ملتا ہے۔ مسدس کی ہیئت سوداؔ اور میرؔ کے فنی تکمیل کی مظہر ہے۔

اودھ کے مرثیہ نگاروں میں مسدس کی ہیئت میں حیدریؔ کے کئی مرثیے ملتے ہیں ۔ حیدریؔ کے بارے میں کئی طرح کے بیانات ملتے ہیں لیکن استاذی مسیح الزماں نے تمام بیانات کا معروضی تجزیہ کر کے عہدِ شجاع الدولہ (۷۶-۱۷۵۴ئ) کے مرثیہ نگاروں میں شامل کیا ہے۔۳۸؎ سکندرؔ (م:۱۸۰۰ئ) پنجاب کے رہنے والے تھے، پرورش دہلی میں پائی، اوائل عمر سے ہی فیض آباد اور لکھنؤ میں رہے۔ ان کا ذکر بحیثیت مرثیہ گومختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ ان کے بیشتر مراثی مسدس میں ہیں۔ سکندرؔ کا سب سے مشہور مرثیہ' ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول' کئی بار چھپ چکا ہے اور آج بھی پڑھا جا تا ہے۔ان کی اردو میں پوربی بولی کا بہت اثر ہے۔ انھوں نے کئی بار مسدس میں بیت کے مصرعے بھی پوربی بولی میں لکھے ہیں ۔ اسی طرح گداؔ جو سکندرؔ کے ہم عصر تھے، سکندرؔ کے برعکس ان کے مراثی میں فارسی الفاظ وتراکیب زیادہ ہیں بلکہ ضرورتِ شعری کے ایسے استعمال بھی ہیں جو بعد میں جائز نہیں رہے۔ مسدس میں گداؔ اور سکندرؔ کے مراثی کا ذکر مسیح الزماں نے کیا ہے: ''گداؔ اور سکندرؔ دونوں کے کچھ مرثیوں پر سال کتابت ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ئ) درج ہے، اور

کاتب کا نام 'بدرعالم ۹۳ ۔متوطن موضع ملاواں بزرگ پرگنہ جھونسی ضلع الہ آباد' لکھا ہے ۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں مرثیہ گو اس وقت تک اتنی شہرت ضرور حاصل کر چکے تھے کہ ان کے مرثیے الہ آباد کے مضافات میں نقل کر کے رکھے جائیں۔'' ۴۰۔ان کی اردو میں پوربی بولی کا بہت اثر ہے۔ انھوں نے کئی بار مسدس میں بیت کے مصرعے بھی پوربی بولی میں لکھے ہیں۔ ان کے معاصرین میں پھلواری شریف کے شاہ محمد آیت اللہ جوہریؔ (م : ۱۷۹۵ ئ) ، شاہ ظہور الحق ظہور پھلواری (م : ۱۸۱۸ ئ) ، شاہ امان علی ترقیؔ (م: ۱۸۳۸ ء) اور شاہ ابوالحسن فردؔ (م : ۱۸۴۸ ء) کے مراثی مسدس کی ہیئت میں ملتے ہیں۔یہی صورتِ حال دیگر معاصرین اورخصوصاً احسانؔ اور افسردہؔ کی ہے، جن کے بیشتر مراثی مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ حیدریؔ، گداؔ، احسانؔ اور افسردہؔ یا ان کی طرح کے کتنے ہی مرثیہ نگار ہوں گے جن کے مراثی کبھی شائع نہیں ہوئے لیکن ان کے مراثی اپنی عام مقبولیت کی بنا پر اودھ یا الہ آباد کے مضافات میں ہی نہیں بلکہ برصغیر ہند میں چہارسمت پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے مخطوطے آج بھی تمام بڑے ذخائر میں دستیاب ہیں۔

ہفتم، شمال کے مراثی میں ہندوستانی رسم ورواج کا بالالتزام اہتمام سوداؔ سے شروع ہوتا ہے۔سوداؔ نے اردو مرثیہ کی فنی وفکری اساس ہندوستان کے معاشرتی رجحان اوراس کی عمرانی قوت میں تلاش کی جس میں صدیوں سے وسیع مشربی تہذیبی و ثقافتی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کی جڑیں تلاش کر کے ان سے اپنے موضوع بیان کو جوڑ دیا۔ ایک چابک دست کمھار کی طرح یہاں کی مٹی میں باریکی سے گوندھ دیا اور کمالِ صناعی سے فنی نمونے پیش کر دئے۔ سوداؔ نے اردو مرثیہ میں خالص ہندوستانی رسمیں حضرت قاسم کی شادی کے تناظر میں بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔لگن ، منہدی، ساچق، برات، جلوہ، شربت پلائی ، آرسی مصحف وغیرہ کی رسموں میں شادی بیاہ کی گہما گہمی میں مرادوں بھری دعائیں کے درمیان موت کا سایہ، جن میں خوشی کلیجے میں چھری کی طرح چبھتی ہے۔ میرؔ نے ایک پورا مرثیہ ہی 'قاسم کی شادی اس دن رچائی' اسی موضوع پر لکھا ہے، جس میں شادی کی تمام رسموں کا ذکر ہے۔سکندرؔ کے مراثی میں عورتوں کے بین مقامی رسم ورواج کے اشاروں کے ذریعہ درد والم کی کیفیتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔

ہشتم ، شمالی ہند میں دکن کے برعکس بہت عرصے تک مرثیہ کو مذہبی تقدس حاصل ہونے کے باوصف مرثیہ نگار کوشعراء کے درمیان نابرابری حائل تھی۔ اس اغماض کا عالم یہ ہے کہ جہاں

تذکروں میں معمولی درجہ کے شعراء کے ذکر سے صفحات بھرے پڑے ہیں، اہم مرثیہ نگاروں کا ذکر خال خال ہی نظر آتا ہے اور اگر کہیں کسی کا ذکر ہے تو بحیثیت غزل گو یا مثنوی نگار۔ مرثیہ کے لیے پھبتی زباں زد رہی ؛ ' بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں'۔ پہلی بار سوداؔ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اہل نظر کے گوش گزار کیا کہ میں چالیس برسوں تک ' مشکل گوئی ' کو' دقیقہ سنجی' قرار دے کر مشق کرنے کے بعد ہی' مشکل ترین دقائق ِ طریقِ مرثیہ' معلوم کر سکا، اس کے فنی وعلمی تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرو، اس کے مرتبہ پر نگاہ رکھو۔ سوداؔ کے الفاظ دیکھیے : ''مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا ہوا ہے کہ گو ہرِ سخن ِ عاصی زیب گوشِ اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سدا اس مرغِ معنی آشیاں کے گرفتارِ دام رہا ہے باوصف اس کے قول

''خذ ماصفاودع ماکدر پر عمل کیا ہے بلکہ تمام عالم کے سخن انصاف پر تلمیذانہ گوش دیا ہے جس کی زبان پر قبیل اعداء سے حرف واقعی اور منصفانہ جاری ہوا ہے۔ باللہ کہ مرتبہ من تعلیم حرفاً فہو مولاً طاری ہوا ہے--- لیکن مشکل ترین قائق طریق مرثیے کا معلوم کیا کہ مضمونِ واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔۔۔ پس لازم ہے کہ مرتبہ درنظر رکھ کر مرثیہ کہے، نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے''۔۱۴؎

نہم، شمالی ہند میں پھلواری شریف رشد و ہدایت اورعرفان و تصوف کے مرکز کی حیثیت سے ہی ممتاز نہیں ہے بلکہ صوفی مرثیہ نگاروں کے' سلکِ مروارید' ہونے کا امتیاز بھی ہے۔ ان کے سرخیل شاہ محمد آیت اللہ جوہریؔ ہیں۔ دیگر اہم مرثیہ نگاروں میں شاہ ظہور الحق ظہور پھلواری، شاہ امان علی ترقی، شاہ ابوالحسن فردؔ، مفتی غلام مخدوم ثروتؔ، شاہ نور الحق طپاںؔ وغیرہ شامل ہیں۔اختر اورینوی ان کو دکنی مراثی کی روایت کی توسیع قرار دیتے ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جہاں دکنی صوفیوں نے اپنے مرثیوں میں مسائلِ تصوف پیش کیے ہیں، پھلواری شریف کے صوفیوں کے مرثیوں میں سب کچھ ہے مگر تصوف کی رمق بھی نہیں ہے۔

دہم، شمالی ہند میں عزاداری معاشرتی رجحان اورعمرانی قوت ہوئی تو اس کے اثرات اس دور کے تمام تہذیبی و ثقافی مراکز میں نظر آتے ہیں۔''تذکرہ مسرت افزا''میں دہلی،فیض آباد اور لکھنؤ کے باہر کے مرثیہ نگاروں میں مرزا ہوشدارؔ، جنھوں نے دہلی میں بحیثیت مرثیہ نگار انتہائی شہرت کے

بعد مرشدآباد میں امام باڑہ بنوایا اور وہیں مقیم ہوئے۔۴۲۔ ان کے صاحبزادے مرزا ظہور علی خلیقؔ جنھیں علی جواد زیدی پہلا مسدس نویس مرثیہ نگار کہتے ہیں۔۴۳۔ بھیر بھوم نزد مرشدآباد کے سید حیدرعلی خادمؔ ۴۴۔ راجہ کلیان سنگھ عاشقؔ، ناظم آباد میں تعزیہ رکھتے تھے اور مرثیہ کہتے تھے۔۴۵۔ غلام حسین خان جو الہ آباد کے ناظم منیر الدولہ کے ساتھ رہے پھر ناظم بنارس راجہ بلونت سنگھ کے۔ ۴۶۔ محمد حسین محزونؔ، جو پہلے الہ آباد میں دائرۂ اجمل میں اپنی عقیدت کی بنا پر شاہ غلام قطب الدین مصیبؔ کے ساتھ رہے، پھر ایک مکان خرید کر الہ آباد میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔۴۷۔

اگر ان مرثیہ نگاروں کا ذکر آگے بڑھایا جائے، میر انیس اور ان کے معاصرین کے ذکر کو بھی شامل کیا جائے، تو گفتگو بہت طویل ہوسکتی ہے، لہٰذا بس یہیں تک !

حواشی

۱۔ المنجد، ص ۶۵۰

۲۔ ملا باقر مجلسی: بحار الانوار (اردو ترجمہ، مفتی سید طاہر آ گا الجزائری) جلد ۲/۱، ص ۱۱۵، نظامی پریس لکھنؤ

۳۔ المنجد، ص ۳۹۶

۴۔ مہذب اللغات، ج ۱۲، ص ۵۷۔۵۸

۵۔ گوپی چند نارنگ: سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، ص ۲۳۔۲۴، دہلی ۱۹۸۶ء

۶۔ تفصیلی ذکر کے لیے دیکھیے:

Sir Denzil Ibbetson,SirEdward Maclagan &H. A. Rose:Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and North- West Province, Vol. I & II , 2nd Edition Patiala 1970

۷۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج ۱۴، (۲) ص ۲۶۴

۸۔ اختر وحید: در گوہر (ملتانی زبان کے قواعد اور فرہنگ) ص ۹۔ میر حسان الحیدری: بلوچوں کی تاریخ، قبائل کے آئینہ میں، ج ۱، ص ۱۵۰

۹)۔ Observation on the Musalman of India pp 17-28, (1832) Mrs. Mir Hasan Ali :

۱۰۔ مسعود حسین خان: مقدمہ 'عاشور نامہ'، اردو قدیم، علی گڑھ ۱۹۷۲ء

۱۱۔غالب : اردوئے معلّیٰ حصہ اول،ص ۲۶ (دہلی ۱۸۶۹)

۱۲۔سید امجد حسین (مرتب): اودھ،آئینۂ ایام میں،ص ۸۲۔۲۷۷

۱۳۔شہید مرتضیٰ مطہری: تحریفاتِ واقعاتِ کربلا،ص ۵۷ لکھنوٴ ۱۹۸۸ئ)

۱۴۔مرزا محمد رفیع سوداؔ: سبیل ہدایت،مشمولہ کلیات سوداؔ جلد دوم ،مرتبہ محمد حسن، نئی دہلی ۱۹۸۴ء

۱۵۔ سید مسعود حسن رضوی: ایران میں عزاداری،ص ۱۶۲

۱۶۔محمد چراغ علی : اردو مرثیے کا ارتقاء،ص ۳۵

۱۷۔ایضاً،ص ۲۹۷

۱۸۔تفصیل کے لیے دیکھیے :محمد چراغ علی : اردو مرثیے کا ارتقائ، رشید موسوی : دکن میں مرثیہ اور عزاداری، سیدہ جعفر، گیان چند :تاریخ ادب اردو،محی الدین قادری زورؔ: داستانِ ادب حیدرآباد،عبدالقادر سروری : اردو کی ادبی تاریخ ، رفیعہ سلطانہ : اردو نثر کا آغاز و ارتقاء،نصیر الدین ہاشمی : دکن میں اردو، Sadiq Naqvi : Muslim Religious Institutions and Thei Role in the Qutub Shahis

۱۹۔محی الدین قادری زور: داستانِ ادب حیدرآباد ص ۵۳

۲۰۔ایضاً ص ۵۳

۲۱۔جمیل جالبی : تاریخ ادب اردو ،ج ۱،ص ۴۲۲

۲۲۔نصیر الدین ہاشمی: یوروپ میں دکنی مخطوطات،ص ۷۶

۲۳۔عروض سے متعلق مسائل و مباحث میں متعلقہ کتب کے علاوہ ڈاکٹر شبیب رضوی (سری نگر) کی امداد حسب سابق شامل حال رہی ہے۔ (ج،ر)

۲۴۔مسیح الزماں:ردو مرثیے کا ارتقا،ص ۶۰

۲۵۔میر تقی میرؔ: نکات الشعراء

۲۶۔ذخیرۂ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

۲۷۔سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ : شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں،ص ۲۵

۲۸۔ راقم کے ذاتی استفسار کے جواب میں موصوف نے تحریر کیا۔

۲۹۔ خیر الدین عابدی : تاریخ عزاداری جون پور، ص ۲۱

۳۰۔ خواجہ احمد فاروقی : مقدمہ کربل کتھا، دہلی یونیورسٹی

۳۱۔ سید مسعود حسن رضوی : شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں، ص ۴۲

۳۲۔ اختر اورینوی: بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۲۰۱۔۱۹۹

۳۳۔ مسیح الزماں : اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۸۴

۳۴۔۔ محمد حسین آزادؔ: آب حیات

۳۵۔ مردان علی خان : گلشن سخن مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، ص ۲۴۴

۳۶۔ درگاہ قلی: حالاتِ سفر دہلی، ص ۱۱۱

۳۷۔ مسیح الزماں : اردو مرثیے کا ارتقا، ص ۱۰۲

۳۸۔ مسیح الزماں : اردو مرثیے کا ارتقا، ص ۱۴۸

۳۹۔ راقم کی والدہ کلثوم سابعہ کے جد امجد تھے۔ (ج،ر)

۴۰۔ مسیح الزماں : اردو مرثیے کا ارتقا، ص ۱۴۸

۴۱۔ سبیل ہدایت ، مذکورہ بالا

۴۲۔ ابوالحسن امیر الدین : تذکرۂ مسرت افزا مرتبہ قاضی عبد الودود، ص ۱۴۸

۴۳۔ علی جواد زیدی : دہلوی مرثیہ گوئی

۴۴۔ تذکرۂ مسرت افزا، ص ۷۶

۴۵۔ ایضاً ص ۱۴۳

۴۶۔ ایضاً ص ۱۴۷

۴۷۔ ایضاً ص ۱۸۸

]ب[

کربلا اور اخلاقی اقدار

(مراثی انیسؔ میں اخلاقی اقدار کی عکاسی)

وسیم حیدر ہاشمی

اُردو میں اخلاقی شاعری کے تعلق سے یہ بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اُردو شاعری سے میر انیسؔ کے مراثی کو حذف کر دیا جائے تو اردو میں اخلاقی شاعری نظر ہی نہیں آئے گی۔ درحقیقت میر انیسؔ واحد اردو شاعر ہیں جن کا کلام درس اخلاقیات سے لبریز ہے۔اور ان کے اخلاقی اشعار ہماری غور وفکر کی صلاحیت پر حاوی ہوکر فہم و ادراک کے نئے نئے باب کھول دیتے ہیں۔ اخلاق فاضلہ کی تعلیمات ہر مذہب میں مؤثر طریقے سے دی گئی ہیں۔ ان اخلاق فاضلہ کی تعلیمات نثر کے مقابلے نظم میں زیادہ موثر پیرائے میں پیش کی گئی ہیں۔ اگر کسی قوم کے اخلاقی جذبات صحیح معنی میں بیدار ہوں تو وہ قوم دنیا کی تمام قوموں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی جبکہ اخلاقیات سے دور اور نا آشنا قومیں بڑی سے بڑی سلطنت کے باوجود دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہی رہتی ہیں۔ اس کی مثال بنی ہاشم اور بنی امیہ سے بہتر بھلا اور کہاں مل سکتی ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ اپنی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بدولت ہی اہل بیتؑ اطہار روز حشر تک کے لیے سرخرو ہیں اور دنیا پرستی و دنیا داری پر مشتمل

اپنے کردار کی بدولت بنی امیہ ذلیل وخوار ہیں۔

جدید وقدیم نظام حیات میں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ اعلیٰ اخلاقی زندگی کی تلقین کے مترادف ہے۔ میر ببرعلی انیسؔ کے یہاں بھی جو نظام اخلاق پایا جاتا ہے اس میں انھوں نے دنیا میں بہتر اخلاقی زندگی بسر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے اپنے کلام میں کہیں کہیں بالواسطہ اور کہیں کہیں بلا واسطہ بے ثباتی عالم کا تذکرہ بڑے پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے بے ثباتی عالم کے حوالے سے جس حسن وخوبی سے اعلیٰ اخلاق کو پیش کیا ہے اس کی جانب کچھ اشارے اس مضمون میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاں ایک طرف اردو میں اخلاقی شاعری بہت کم نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف اخلاقی شاعری پر مشتمل مضامین اور مقالے کا فقدان بھی ایک فطری امر ہے۔ اردو شاعری میں اگر اخلاق فاضلہ پر کوئی مضمون لکھنا ہوتو ''میر انیسؔ کی شاعری میں اخلاقیات'' کو ہی عنوان قرار دینا ہوگا جو ہر ادیب کا پسندیدہ موضوع ہرگز نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ انیس کے یہاں یہ اخلاقی پہلو ان کے مرثیوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں جن کو جمع کرنا خصوصی حوصلہ کا متقاضی ہے۔

اخلاقیات کے زمرے میں شجاعت وجواں مردی، حب الوطنی، سخاوت، غیرت، شرم و حیا، آزادی، استقلال، صبر وشکر، قناعت، انسان دوستی، وفاداری، انسانی جذبات اور اس کے محسوسات، حفظ مراتب اور اعلیٰ کردار کے مختلف مظاہر شامل ہیں اس لیے اردو شاعری میں اخلاقیات کے مظاہر ومناظر سے واقفیت کے لیے مراثی انیسؔ سے بہتر کوئی اور ذریعہ اتنی تعداد اور مقدار میں یکجا موجود نہیں ہے۔ انیسؔ کے مراثی ہی اعلیٰ شاعری کے اعتبار سے ہر میزان پر کھرے اترے ہیں کیوں کہ انیسؔ نے اپنی شاعری کے لیے کربلا کو عنوان بنایا۔ چونکہ کربلا کا مقصد اور اس کا ہیرو دونوں ہی ہر نقطۂ نظر سے بلندیوں پر نظر آتے ہیں اس لیے انیسؔ نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ انیسؔ کے مراثی طوالت کی بنا پر نہیں بلکہ واقعات کربلا اور اس کے کرداروں میں پائی جانے والی اخلاقی بلندی اور شرافت اور نجابت کی بنا پر ہر دل عزیز ہوئے۔ انیسؔ کے کلام میں موجود اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہی ان کی شاعری میں عظمت پیدا ہوسکی ہے۔ انیسؔ کی تمام شاعری جو کہ رحم، خوف، شرافت نفس اور حقانیت کے جذبات پیدا کرتی ہے وہیں ہمارے ذہنوں کو اعلیٰ اخلاق کی طرف مائل کرتی ہے۔ یوں تو میر انیسؔ نے اپنے مختلف کرداروں کے ذریعے حسن اخلاق کے بہترین نمونے

اپنے کلام میں پیش کیے ہیں مگر خاص طور پر جب وہ حضرت امام حسینؑ کی سیرت پیش کرتے ہیں تو اخلاق حسنہ اپنی انتہائی منزل پر نظر آتا ہے۔ وہ حسن اخلاق کے محض خیالی مرقعے پیش نہیں کرتے بلکہ اہل دنیا کے لیے ایسے قابل تقلید نمونے بھی پیش کرتے ہیں جن سے جملہ اقوام و ملل مستفیض ہوسکتی ہیں۔ انیسؔ نے اپنے کلام کی جادوگرانہ تاثیر سے تمام اخلاقی پہلوؤں کو عوام سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ انسانی محبت اور ہمدردی کا جذبہ ان کے اندر از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ عوام کو ان کے کلام میں بلند پایگی اور وقار کی ایک خاص شان نظر آتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں ذیل کے صرف تین بند ہی کافی ہیں:

استغاثہ یہ کیا حر نے جو بادیدۂ نم جوش میں آ گیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ اُمم حر کو یہ ہاتف غیبی نے ندا دی اُس دم
شکر کر سبط رسولؐ الثقلین آتے ہیں
لے بہادر، تیرے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
شہؑ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے باتوقیر میں نے بخشی، مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضامند ہوں، کس واسطے مضطر ہے تو؟
مجھ کو عباسؑ دلاور کے برابر ہے تو

کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ اُمم ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا، اللہ رے کرم
راس و چپ قاسم و اکبر تھے رہے شان و حشم سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباسؑ علم
دور سے اہل خطا، تیر جو برساتے تھے
رفقا سائے میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے

کربلا کی تاریخ میں حر اور حضرت امام حسینؑ کی ملاقات کا یہ واقعہ اظہر من الشمس ہے کہ روز عاشورہ حر کے حسینؑ سے آ ملنے سے قبل بھی اس کی ایک ملاقات سفر کربلا کے دوران اس وقت ہوئی تھی جب حر حضرت امام حسینؑ کے قتل کی غرض سے ایک بڑا رسالہ لے کر کربلا کے لیے نکلا تھا۔ راہ میں حر کے لشکر کے پاس پانی ختم ہو جانے کے بعد سورج کی تمازت اور گرمی کی شدت میں اپنی فوج کے ساتھ پیاس سے بیقرار اور جاں بلب مارا مارا پھر رہا تھا۔ اسی عالم میں حر کی ملاقات حضرت

امام حسینؑ سے ہوتی ہے تو وہ حسینؑ کو اپنی اور اپنے ساتھیوں کی پیاس سے شدت کا حوالہ دے کر پانی کی درخواست کرتا ہے۔ ہر چند کہ حسینؑ، حر اور اس کے ناپاک ارادوں سے بخوبی واقف تھے مگر حر کا حال زار دیکھ کر انھیں اس پر رحم آجاتا ہے اور وہ اپنے پاس جمع تمام پانی صرف حر اور اس کے لشکر کو ہی نہیں پلاتے بلکہ اس کے ساتھ کے تمام جانوروں اونٹ، گھوڑے اور خچر وغیرہ تک کو بھی سیراب کرتے ہوئے خلق محمدیؐ کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ سیراب ہو جانے کے بعد حر امام حسینؑ کا شکر گزار ہونے کے بجائے یزید کا نمک خوار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت سفاک انداز میں حسینؑ کو گرفتار کرنے کے ارادے سے ان کے گھوڑے کی لگام پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اس موقع پر بھی حسینؑ نے اخلاق کا درس دیتے ہوئے اسے صدق دل سے معاف کر دیا۔

حر وہی خطاکار ہے جس نے ایک روز حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کی لگام پر بڑی ڈھٹائی سے ہاتھ ڈالا تھا۔اللہ رے اخلاق حسینؑ! ''ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا، اللہ رے کرم''۔ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ یہ سلسلہ حضرت حر کی شہادت کے بعد تک اسی خلق و کرم کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ جنگ کے دوران حر کے سر پر آئے زخم پر امامؑ کا رومال باندھنا اور اس کے گھوڑے سے گرنے کے بعد:

گِر کے لاشے کے برابر یہ پُکارے سرورؑ میرے مہمان و مددگار و معین و یاور
گُرز کیا تم کو لگا، ٹوٹ گئی میری کمر گر پڑے گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھکو خبر

دوست کے ہجر میں کب دوست کو چین آیا ہے
کھول دے چشم کو بھائی کہ حسینؑ آیا ہے

واہ، اے حر جری میں تِری ہمت کے فدا اس کو کہتے ہیں محبت، اسے کہتے ہیں وفا
ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تونے کیا

حق تعالیٰ چمن خلد میں گھر دے بھائی
اِس ریاضت کا خدا تجھ کو ثمر دے بھائی

لاش اُٹھائے شہِ دیں خیمے کے در پر آئے پائوں مہماں کا سنبھالے علی اکبر آئے
غُل ہُوا خیمۂ اقدس میں کہ سرورؑ آئے پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوئے سر آئے

دخترِ فاطمہؑ سامان عزا کرنے لگی
فضہ پردے کے ادھر آکے بُکا کرنے لگی

حق مہمان کی ادائیگی کے سلسلے میں خلق حسینؑ کی یہ ایک زبردست مثال ہے جہاں زبان مبارک پر یہ کلمہ بھی ہے کہ:

''ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا''

خلق وکرم کی اب اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہاں اس پیاسے پر رحم وکرم کی بارش ہورہی ہے۔

امام وقت کے خلق وکرم کی دوسری مثال اس مقام پر پیش ہے جب امام کے بچپن کے ساتھی حبیب ابن مظاہر امام حسینؑ کے ساتھ پاپیادہ چلنے کو مصر ہیں۔ امام گھوڑے کی باگ کو کھینچ کر فرماتے ہیں:

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار یہ کس لیے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اُتر پڑوں گا نہ ہو گے جو تم سوار کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہرچند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم
فرمایا تم کو دیتا ہوں اس سر کی میں قسم جو بعد عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم
میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے اب قدم اچھا تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پہنچیں جناں میں بحر مصیبت کو جھیل کے
ہم تم تو ایک گھر میں پلے، ساتھ کھیل کے

درج بالا بند کے ایک مصرعے پر غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ مساوات کی اس سے بہتر مثال اور کہیں ملنا مشکل ہے:

''اچھا، تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم''

اسی ضمن میں ایک اور مقام ملاحظہ ہو جب ایک شخص نے امام حسنؑ کے ساتھ گستاخی کی تو بجائے اس شخص سے کبیدہ خاطر ہونے کے، اس مقام پر بھی آپ نے خلق محمدی □ کا ثبوت فراہم کیا۔ امام حسنؑ کے اس سلوک پر وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور ان سے فوراً معافی مانگی تو امام حسنؑ نے نہ

صرف اسے صدق دل سے معاف فرمایا بلکہ خلق محمدی ﷺ کا تعارف کراتے ہوئے اسے گلے بھی لگایا۔

ناگاہ آیا سامنے اک مرد خیرہ سر اور جانب امام درشتی سے کی نظر
منھ سے کلام سخت کہے اس نے بیشتر ترک ادب ہے لاؤں اسے کس زبان پر
سمجھا نہ رتبۂ شہ عالی مقام کو
دشنام دی امام علیہ السلام کو

جب کر چکا وہ بے ادبانہ یہ سب کلام حضرت نے اس کا دیکھ کے منھ روک لی لگام
اور مسکرا کے آپ نے کی سبقت سلام فرمایا کیوں ہے غیظ میں اے مردِ نیک نام
شاید اسیر دام و بلا و محن ہے تو
مجھ کو گماں یہ ہے کہ غریب الوطن ہے تو

مجھ سے سوال کر کہ میں حاجت روا کروں اور دردِ مفلسی ہو تو اس کی دوا کروں
گر تو مریض ہے تو شفا کی دعا کروں مقروض گر تو ہوے تو اس کو ادا کروں
تنہا ہے گر تو آکے مِرا غمگسار ہو
پیدل ہے گر تو گھوڑے پہ میرے سوار ہو

سن کر کلام بادشہ آسماں سریر کانپا مثالِ بید سراپا وہ مرد پیر
بے اختیار رو کے پکارا کہ اے قدیر تیرا کوئی عدیل نہ اس کا کوئی نظیر
شیرِ خدا وصی نبیؐ لا کلام ہے
حقاّ کہ تو امامؑ ہے، ابن امامؑ ہے

حیدرؑ سے بغض تھا مجھے اور آپ سے عناد مانند روح و جسم ہُوا آج اتحاد
دل سے تمام محو ہوے باطنی فساد اب بخشیے خطا کو، یہی ہے مری مُراد
تعزیر دیجے تیغ دوپیکر نکالیے
تقصیروار ہوں میں زباں کاٹ ڈالیے

چھاتی لگا کے کہنے لگا وہ خدا کا نور بے تاب کس لیے ہے ترا کچھ نہیں قصور
ایمان لایا تو مرے دل کو ہوا سرور نزدیک تو بہشت سے ہے اور سقر سے دور

آلِ نبیؐ کی تجھ سے محبت زیاد ہو
تجھ سے حسنؑ خوشی ہے خدا تجھ سے شاد ہو

واضح رہے کہ حضرت امام حسنؑ ہر کس و ناکس، یہاں تک کہ کافروں سے بھی نہایت نرمی اور عزت سے پیش آتے تھے اور ہر کسی کی مدد بغیر تفریق ملت کیا کرتے تھے۔ اپنے اسی اخلاق فاضلہ کی وجہ سے ان کا خلق ''خلق حسنیٰ'' کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسجد کوفہ میں امام اوّل اور وصی محمدؐ جب عبدالرحمن ابن ملجم کی زہر آلود تلوار سے بری طرح زخمی ہو گئے اور لوگوں نے قاتل کو گرفتار کر کے حضرت علیؑ کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر حضرت علیؑ کا اخلاق قابل غور ہے۔ وہ اپنے قاتل کے ساتھ کس قدر نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ اخلاقی درس کی ایسی مثال کہیں اور عنقا ہے۔ (مرثیہ ''خورشید حقیقت رخِ زیبائے علیؑ ہے''):

قاتل کو محبّان علیؑ لائے پکڑ کر مشکیں تھیں بندھی سر کو جھکائے تھا ستمگر
جس دم پڑی اس پر نظرِ خویش پیمبرؐ قاتل سے یہ فرمانے لگے حیدرؑ صفدر
کیا میری خطا تھی جو ستایا مجھے تونے
کس جرم پہ یہ وار لگایا مجھے تونے

رونے لگا سر شرم سے نیہوڑا کے ستمگار چاہا یہ حسنؑ نے کہ لگا دیں اُسے تلوار
کیا رحم ہے فرمانے لگے حیدرؑ کرار مارو نہ اسے قید کرو، اے مرے دلدار
یہ چاہتا ہے بند سے رسّی کے رہا ہوں
تم کھول دو ہاتھ اس کے کہ میں عقدہ کشا ہوں

بازو ہیں بندھے اس کے ہے بیچین مرا دل ہم وہ ہیں کہ حل کرتے ہیں ہرایک کی مشکل
دشمن نہیں میں اس کا گو ہے یہ مرا قاتل دیوے گا سزا اس کی اسے خالق عادل
کی اس نے برائی تو ضرر کیا ہے ہمارا
دشمن پہ کریں رحم یہ شیوہ ہے ہمارا

اے لال قسم ہے تمھیں غصے میں نہ آنا جب تک کہ میں زندہ ہوں نہ ہاتھ اس پہ اٹھانا
جس وقت میں ہوں عالم فانی سے روانا اک وار سے تم اس پہ زیادہ نہ لگانا

جو کھاؤں میں کھانا وہی پہنچائیو اس کو
پیاسا ہو تو پانی سے نہ ترسائیو اس کو

اپنے قاتل کے لیے ایسے محبت اور ترحم آمیز جذبات دنیا کی کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتے۔ اسلام سے تعلق نہ رکھنے والے بھی اگر ان حالات پر غور فرمائیں اور اپنی ہستی کا سچا جائزہ اس تاریخی حقائق کی روشنی میں لیں تو وہ محسوس کریں گے کہ عام انسانی وجود میں کس قدر خامیاں موجود ہیں اور عام انسان اخلاقی معاملات میں نہ صرف پست ہی ہے بلکہ کس قدر دورافتادہ اور چشم پوش بھی ہے۔

میر انیسؔ نے بالواسطہ بھی بے ثباتی عالم کی تلقین کی ہے۔ ایک مقام پر پسر سعد کے سوال کے جواب میں کیا خوب فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

نازاں نہ ہو اے بانیٔ ظلم و ستم و جَور — مٹ جاتا ہے اک گردش افلاک میں یہ دَور
تو آج جو حاکم ہے تو کل ہوگا کوئی اور — کیا ہو گئی، کر دولت قاروں پہ ذرا غور
نمرود نہیں، حشمت ضحاک نہیں ہے
ڈھونڈو جو خزانے میں تو اب خاک نہیں ہے

ایک اور مقام پر اعدائے دیں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :(مرثیہ ''جب تیغ یداللہ کھنچی دشت وغا میں'')

تولے ہوئے شمشیر کو پڑھتے ہیں یہ اشعار — دنیا بھی ہے بے مہر، زمانہ بھی ہے غدار
تف تجھ پہ ہے اے دہر ستمگار و جفاکار — بے دل تری اس سفلہ پرستی سے ہیں دیندار
زہراؑ سے، محمدؐ سے، علیؑ سے، نہ وفا کی
شاکی رہے سب تونے کسی سے نہ وفا کی

تونے غم فرزند میں آدمؑ کو رلایا — عیسیٰؑ نے جہاں میں کوئی دم چین نہ پایا
خنجر سے لہو حضرت یحییٰ کا بہایا — کس چاہ میں یعقوبؑ سے یوسفؑ کو چھڑایا
وہ کون سے دکھ تھے جو دکھائے نہیں تونے
کیا کیا کنویں پیری میں جھنکائے نہیں تونے

توڑے دُرِ دندان نبیؐ سنگ جفا سے — مسجد ہوئی تر خون سر شیر خدا سے
فرصت نہ ملی فاطمہؑ کو رنج و بلا سے — ٹکڑے ہوا شبرؑ کا جگر زہر دغا سے

باقی تھا فقط میں، سو عزیزوں سے چھٹا ہوں
پانی کو ترستا ہوں، غریبی میں لٹا ہوں

اخلاقیات کے ہمراہ بے ثباتی عالم کی تلقین صرف غیروں کیلئے نہیں بلکہ جابجا اپنوں کیلئے نظر آتی ہے۔ میدان جنگ میں جانے سے قبل حضرت امام حسینؑ شہربانو کے پاس جب آخری رخصت کو تشریف لاتے ہیں تو کس انداز سے صبر کی تلقین فرماتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس کا اخلاق جتنا بلند ہوگا اس پر فانی دنیا کی حقیقت اتنی ہی زیادہ روشن ہوگی اور وہ اسے ایک منزل سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ دیکھیے میر انیسؔ امام حسینؑ کی زبانی اس سرائے فانی کی کیسی کیسی تعبیریں پیش کرتے ہیں جس میں دل جوئی اور تسلی کا پہلو بھی ساتھ ساتھ موجود ہے۔ ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔ (مرثیہ ''کیا بحر ہے وہ بحر کنارا نہیں جس کا'')

جیتا ہے ہمیشہ کوئی اس دار محن میں؟　یہ روح ہے مہماں کوئی دم خانۂ تن میں
ہے آج بہار اور خزاں کل ہے چمن میں　ہم سے بہت ایسے ہیں کہ سوتے ہیں کفن میں
ہر شام کو دس بیس چراغ سحری ہیں
ہر صبح کو دس آتے ہیں اور دس سفری ہیں

شادی ہے کسی شخص کو، غم کھاتا ہے کوئی　خلعت کوئی پاتا ہے، کفن پاتا ہے کوئی
آتا ہے جہاں میں کوئی اور جاتا ہے کوئی　کھلتا ہے کوئی پھول تو مُرجھاتا ہے کوئی
گر غور سے دیکھا تو بھروسہ نہیں دم کا
دنیا بھی مرقع ہے عجب شادی و غم کا

گہہ تختۂ تابوت ہے گہہ مسند شاہی　اک آتا ہے دنیا میں تو اک ہوتا ہے راہی
بس خیر ہے جب تک کہ رہے فضل الٰہی　کچھ بن نہیں پڑتا ہے جب آتی ہے تباہی
سلطاں بھی کفن کے لیے محتاج ہوئے ہیں
لاکھوں گھر اسی طرح سے تاراج ہوئے ہیں

بس جیتے ہی جی تک ہیں برادر ہو کہ فرزند　ہر شخص پہ کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
کیا رشتہ پھر اس سے جو ہوا خاک کا پیوند　پر ہم سے تو پہلے ہی جدا ہو گئے فرزند

کیا قبر میں ہویگا خبر آہ نہیں ہے
زندہ ہیں ابھی اور کوئی ہمراہ نہیں ہے

ان خیالات کے بعد اب اردو ادب کے چند مایۂ ناز ناقدین و محققین کے خیالات بھی اس ضمن میں جان لینا ضروری ہے کہ اردو شاعری میں اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ان حضرات کے خیالات کیا ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالیؔ کے خیالات کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کو مرثیے کے بعض اجزا پر اعتراض ہے اور انھوں نے مرثیہ پر بھی سخت تنقید کی ہے پھر بھی میر انیسؔ کی اخلاقی شاعری پر نقد کرتے ہوے انھوں نے ایک منصف کی حیثیت سے نہایت دیانت داری کے ساتھ لکھا ہے کہ ''۔۔۔اسی خاص طرز کے مرثیے کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جاے تو بھی ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انھیں لوگوں (میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ) کا کام ٹھہرتا ہے۔ بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔۔۔''۱؎

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ جن دیگر محققین نے میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری پر تنقید کی ہے، بے شک ان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ صاحب کا نام سرفہرست ہے اور ان کی راے میر انیسؔ کے معاملے میں مستند سمجھی جاتی ہے۔ میر انیسؔ کی اخلاقی شاعری کے ضمن میں وہ ''روح انیس'' میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں ''اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیسؔ کے مرثیوں کا پایا بہت بلند ہے۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاق کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیسؔ کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب سے یا وعظ و پند کے ذریعے ممکن نہیں۔ نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں۔''۲؎۔

اردو شاعری میں جب بھی اخلاقی قدروں کا ذکر ہوتا ہے متعدد شعراء کے نام سامنے آتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کس شاعر نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اخلاقی قدروں کو برتنے کے سلسلے میں ہر ناقد اور مبصر کے غور وفکر کا نہج جدا ہوتا ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے ''جدید اردو شاعری'' میں اپنی راے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ ''فارسی کے اتباع میں اردو نے بھی بہت سے اخلاقی شاعر پیدا کیے لیکن میر دردؔ کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہو سکا۔''۳؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ میر دردؔ کے کلام میں جابجا اخلاقی شاعری کے بہترین

نمونے ملتے ہیں مگر یہ کہنا کہ اخلاقی شاعری کے سلسلے میں ''دردؔ کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہو سکا'' میر انیسؔ کے کلام میں اخلاقی شاعری کے پیش نظر، راقم الحروف کی دانست میں درست نہیں۔

ہر چند کہ خواجہ میر دردؔ کا شمار ان معیاری شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت کم لکھا۔ بمشکل ڈھائی ہزار اشعار اردو میں اور تقریباً اتنے ہی فارسی میں ہیں۔ اپنے کلام کے آئینے میں وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے جو کچھ بھی لکھا، معیاری لکھا۔ ان کی مختصر سے مختصر یا طویل سے طویل غزل کا ایک بھی شعر کمتر درجے کا نہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ عام طور پر بڑے بڑے شعراء کے یہاں بھی ہلکے اور کم معیاری اشعار مل ہی جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے بھی کم معیاری یا غیر معیاری اشعار کہے ہوں گے۔ مگر جہاں تک اخلاقی شاعری کی بات ہے دردؔ کا پلّہ کسی بھی صورت میر انیسؔ سے گراں نہیں۔

مراثی کے علاوہ میر انیسؔ نے قطعات وسلام کو بھی درس اخلاق کا ذریعہ بنایا ہے۔ مراثی میں یہ قدریں میر انیسؔ بالواسطہ حضرت امام حسینؑ اور اہل بیتؑ اطہار کے ذریعہ پیش کرتے ہیں مگر بے ثباتی عالم کے ساتھ اخلاقی اقدار کو بلا واسطہ بھی اس حسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ درس عبرت نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند بند پیش خدمت ہیں۔

اے مومنو! مصروف رہو یادِ خدا میں جینے کا بھروسہ نہیں اس دارِ فنا میں
اوقات کرو صرف، عزائے شہداء میں سرگرم رہو نالہ و فریاد و بکا میں
غافل نہ ہو مل جائے جو وقفہ کوئی دم کا
دنیا سے ہے نزدیک سفر ملک عدم کا

اس منزل فانی میں نہ دل اپنا لگاؤ اُلفت نہ کرو اس سے جسے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے، یہاں گھر نہ بناؤ پابندئ دنیا سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ
چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا
ہمراہ کچھ اسبابِ جہاں جا نہ سکے گا

یاں رخت اقامت کا سرانجام ہے بے جا اس منزل پُر خوف میں آرام ہے بے جا
عقبیٰ کے سوا یاں کا ہر اک کام ہے بے جا مانند نگیں آرزوے نام ہے بے جا

سنیے یہ دم مثل چراغ سحری ہے
کر لو عمل خیر، یہی ناموری ہے
امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لب بام
یاں کام کرو ایسے کہ آئے جو وہاں کام آپہنچے خدا جانیے کب موت کا پیغام
اپنی نہ کوئی ملک، نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمھیں خاک، یہ سب خاک سمجھنا
دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال ادبار ہے انساں کا کبھی اور کبھی اقبال
اندوختہ کرتے جسے لگتا ہے مہ و سال آ جاتا ہے وہ غیر کے قبضے میں زرو مال
خالی رہیں گے بعد فنا ہاتھ تمہارے
کچھ جمع ہو ایسی کہ چلے ساتھ تمہارے
بھائی نہ تو کام آئے گا اس وقت نہ فرزند عرصہ نہیں کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہوئے رضامند ہشیار کہ ہونا ہے تمھیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے، جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہہ شاہ و گدا، کنج لحد ہے

اس کے بعد بھی مسلسل پانچ بند اسی موضوع پر اور ہیں مگر طوالت سے گریز کے پیش نظر انھیں نقل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر زوجہ حضرت امام حسنؑ کا بیان ملاحظہ ہو۔ یہ وہ موقع ہے جب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ کہیں قاسمؑ کے قبل امام حسینؑ اپنے بڑے بیٹے علی اکبرؑ کو جنگ کی اجازت نہ دیدیں:

باہر امامؑ لے گئے لاشے اٹھا کے جب غیرت کا جوش آ گیا قاسمؑ کی ماں کو تب
مَل مَل کے ہاتھ کہتی تھی دل سے کہ ہے غضب ہمشکل مصطفیٰؐ کہیں مرنے نہ جائے اب
اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
میں فاطمہؑ کو حشر میں کیا منہ دکھاؤں گی
دل میں یہ سوچتی ہوئی اٹھی وہ خوش خصال قاسمؑ کو اپنے پاس بلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسنؑ مجتبیٰ کے لال کچھ اس ضعیف ماں کی بھی غربت کا ہے خیال

جاری ہے اشک خوں مری چشم پُر آب سے
زینب کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے
گھر لٹ رہا ہے فاطمہ زہراؑ کا ہائے ہائے دشمن وہ دوست ہے جو نہ اس دکھ میں کام آئے
غیروں نے یاں حسینؑ کے قدموں پہ سر کٹائے کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے جائے
گھیرا ہے بے وطن کو عدو کی سپاہ نے
منہ دیکھنے کو کیا تمھیں پالا ہے شاہ نے
سب مر چکے امام دو عالم کے اقربا باقی ہے کون اکبرؑ و عباسؑ کے سوا
حضرت کے تن کی جان ہیں وہ دونوں مہ لقا سر ان کے کٹ گئے تو قیامت ہوئی بپا
تم بھی خجل رہو گے صدا جد کے سامنے
شرمائیں گے حسنؑ بھی محمدؐ کے سامنے
جو مرد ہیں وہ دیتے ہیں مردانگی کی داد کچھ اپنے باپ کی بھی وصیت ہے تم کو یاد
جلدی دلہن سے مل کے سدھارو پئے جہاد قربان ہو چچا پہ، یہی ماں کی ہے مراد
بیاہا تمھیں بر آئی ہر اک آرزو مری
اب وہ کرو کہ جس میں رہے آبرو مری
مادر کے منہ کو دیکھ کے بولا وہ گلعذار ایسے ہیں ہم کہ بیٹھ رہیں وقت کارزار
جانیں ہزار ہوں تو چچا پر کریں نثار رخصت ہی وہ نہ دیں تو ہے کیا اپنا اختیار
رن میں چلے تھے مرنے کو پہلے ہی سب سے ہم
روکا چچا نے کہہ نہ سکے کچھ ادب سے ہم

بیگم صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں کہ ''یہ قدریں ہیں خدا شناسی، عقیدہ و ایمان، دیانت و شرافت، حق پرستی وعفو و کرم، ایثار و قربانی، جرأت و جاں بازی، وفا و جاں نثاری، صبر اور استقلال، راضی بہ رضا رہنے کا حوصلہ، رشتوں کی پاسداری اور انسانیت کا درس، خلوص ومحبت اور پھر حق کی راہ میں جان قربان کر دینے کا وہ جذبہ جو شہادت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ شہادت یعنی سر دار بھی حق کا نام لینا اور حق کے لیے جان تک قربان کر دینا۔ یہ وہ قدریں ہیں جن کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ جو دب دب کر ابھرتی ہیں اور اپنی سچائی منوا لیتی ہیں، جس کو انیسؔ نے زیادہ تر بالواسطہ یعنی اپنے کرداروں

کی سیرت اور اخلاق میں اجاگر کر کے اور کہیں کہیں بلا واسطہ پیش کیا ہے۔''۴؎

اگر ہم ان بزرگان دین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں تو دنیا میں ہم ایک الگ امتیازی حیثیت اور وقار حاصل کر سکیں گے۔ ہم دوسروں کے لیے بھی شمع ہدایت بن کر زندگی کی تاریک راہوں سے ان کو نجات دلانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور یہی انسانی اور اسلامی زندگی کا بلند ترین معیار اور زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہوگا۔جس کی پیش کش میں بالعموم اردو مرثیے اور بالخصوص میرانیسؔ کے مرثیے ہر اعتبار سے لائق اعتنا ہیں۔ ان کے مطالعے سے بھی انسانی زندگیوں میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں جس کے اثرات ہماری اجتماعی اور ملکی صورت حال پر پڑنا ناگزیر ہیں۔

حوالے:

۱۔مقدمہ شعر و شاعری،صفحہ ۱۸۳ ،سلسلۂ مطبوعات ۱۱۴/اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنؤ،بار پنجم ۲۰۰۲ء

۲۔کلام انیسؔ پر مختصر تبصرہ، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ

۳۔ اُردو مرثیہ نگاری، امّ ہانی اشرف صفحہ ۱۸، ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ ۱۹۹۲ئ

۴۔انیس شناسی، گوپی چند نارنگ،صفحہ ۴۶

کربلا: احتجاج وانقلاب کی لافانی آواز

پروفیسر شاہ محمد وسیم،علی گڑھ

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ظلم و جبر سے اپنی حکومتوں کو قائم ودائم رکھنے میں، مافیہا سے بے خبراس دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں ڈوبے ہوئے حریص حکمرانوں نے تاریخ سے فائدہ نہ اٹھایا،اگر تاریخی حقائق کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں پتہ چلتا کہ کوئی نمرود وقت بچا، نہ کوئی شداد زمانہ۔ تاریخ نے انہیں حرف غلط کی طرح محو کر دیا، یا یوں کہا جائے کہ مظلوموں مفلسوں، اپاہجوں اور مجبوروں کی آہوں تلے ، ان کی شہرت، ان کے حرکات وسکنات، ظلم اور تشدد سب کے سب دب کر خاک میں مل گئے۔ ان کا ذکر باقی ہے، لیکن نفرت اور حقارت کے سایۂ تلے۔ظلم تو ظلم ہے کہ بڑھتا ہے تو ظالم کو مٹادیتا ہے۔ در اصل ظالم اپنا کام خود تمام کر لیتا ہے۔قتل وخون اور غارتگری کو اپنا شیوہ بنا تو لیتا ہے اپنے تسلط بے جا کے لئے ،مگر رفتار زمانہ کو کیا کیجئے کہ وہ ظالم کے ظلم پر سوچنے سمجھنے والوں کے

ضمیروں کو جھنجوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔مقتولین کا خون پرچم انقلاب بن کر ابھرتا ہے۔ اور مظلوم وستم رسیدہ افراد کا نالہ وگریہ نعرۂ انقلاب بن جاتا ہے۔صحن عالم میں خدائے بزرگ وبرتر کا پیغام عدل سوئے ہوئےضمیروں کوحق وصدق وصفا اور ان کے مقاصد کوعیاں کرتے ہوئے جگاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں دنیا کے انصاف پسند اور انسان دوست افراد کو سانحۂ کربلا اور اس کے مابعد کے اثرات پرنظرکرنا چاہئے، کہ جب ایک ایسے ظالم شخص نے نواسۂ رسول □ حسین ؑ ابن علیؑ سے سوال بیعت کیا تھا ، جو اسلامی قوانین، سنّت اور احادیث رسولؐ کی خلاف ورزی کررہا تھا۔تونواسۂ رسول وجگر گوشۂ بتول حسین مظلوم یزید کے مطالبہ بیعت کا کیا جواب دیتے یزید کے تعارف میں ابن احنف کا قول سننے کے قابل ہے۔جب ان سے معاویہ نے پوچھا کہ تم نے اپنے بھتیجے (یزیدلعن) کو کیسا پایا؟ تو انھوں نے جواب دیا:

اِنَّا نَخَافُ اللّٰہَ اِنْ کَذَّبْنَا وَ نَخَافُکُمْ اِنْ صَدَّقْنَا

اگر ہم جھوٹ بولیں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ بولیں تو تمہارا ڈر ہے ۔ ا؂

یزید کی ولیعہدی کا اعلان جس طرح کیا گیا، اسکو ابن کثیر نے معاویہ کے ایک کارندے ابن مقنع کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: اس (ابن مقنع) نے حاضرین مجلس سے مخاطب ہوکر کہا: ''اَمیر المومنین ھٰذا وَاِنْ ھَلَکَ فَھٰذا وَمن ابی فھذا۔۔ امیر المومنین یہ ہیں (معاویہ) اور اگر یہ مرجائیں تو اس (یزید) کی خلافت سے جو انکار کرے گا، اس کے لئے یہ ہے۔(تلوار کی طرف اشارہ کرکے کہا) ۲؂

یہ اعلان جانشینی اس معاہدہ کی خلاف ورزی میں تھا، جو معاویہ، نے امام حسنؑ سے کیا تھا، جبکہ قرآن کا اعلان ہے اوفوا بالعقود۔یعنی اپنے وعدوں کو وفا کرو۔

جب یزید(لعن) کےفسق وفجور کی باتیں عام ہوئیں،تو اشراف مدینہ کا ایک وفد یزید کی طرف روانہ ہوا، جس میں عبد اللہ بن حنظلہ انصاری، منذر بن زبیر اور دوسرے حضرات شامل تھے، دمشق میں یزید(لعن) نے ان کی بہت تعظیم وتکریم کی اور کثیر مال وزرعطا کیا۔لیکن ان باتوں کے باوجود اس کی سیاہ کاریاں چھپ نہ سکیں، اور انہوں نے طے کرلیا کہ ہم مدینہ پہونچ کر اس کی بیعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں گے، ان کے الفاظ یہ تھے:

''ہم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں ،جس کا کوئی دین نہیں، جو شراب پیتا ہے، اور جس

کے سامنے کنیزیں باجے بجاتی ہیں۔ ہم تمہیں گواہ کرتے ہیں کہ ہم نے اس کی اطاعت ترک کی۔''
۳۔

یہی یزید (لعن) نواسۂ رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ سے بیعت کا طلبگار تھا' انہیں حسینؑ سے جن کے بڑے بھائی امام حسنؑ کے لئے اور خود ان کے لئے ان کے نانا رسول اللہ محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ''اَلْحَسَنُ عَلَیْہِ السَّلَام وَ الْحُسَینُ عَلَیْہِ السَّلَام سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ (حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں ۴۔ اور یہ بھی کہ هٰذَا اِنَّ اَبنائی وَ ابناءَ اِبنَتِی، اَللّٰهُمَّ اِنی اَحِبّها فَاَحَبَّهُمَا وَ اَحَبُّ مَنْ یَّحَبُّهُمَا یعنی (یہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ اے اللہ ! میں ان سے محبت کرتا ہوں، پس تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے (بھی) جو ان سے محبت کریں۔ ۵۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے والے ان احادیث کو بھلا بیٹھے تھے اور اس کو بھی کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وَمَنْ اَبْغَضَهُمَا فَقَدْ اَبْغَضَنِی ۶۔ اور قرآن کی اس آیت کو بھی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا۔ ۷۔

رجب کا مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ ۶۰ھ تھی۔ یزید نے ولید ابن عتبہ گورنر مدینہ کو لکھ بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لو۔ ولید نے امامؑ کو رات میں طلب کیا۔ امام حسینؑ نے اس وقت ولید سے جو گفتگو کی، اس پر مروان نے کہا اگر حسینؑ اس وقت بلا بیعت کیے چلے گئے، تو تم ان پر اس طرح قابو نہ پاسکو گے، جب تک کہ تمہارے اور ان کے درمیان کشتوں کی کثیر تعداد نہ ہوگی ! اس شخص کو مقید کرلو، اور اسے یہاں اپنے پاس سے نہ جانے دو، جب تک یہ یزید کو خراج تحسین نہ ادا کرے، یا تم اسے قتل نہ کردو۔'' ۸۔ یہ سن کر امام حسینؑ کھڑے ہوگئے اور اظہار ناراضگی کیا، اور پھر آپ اپنے جانثاروں کے ساتھ بیت الشرف پہنچ گئے۔

'' تم نے میرا کہنا نہ مانا'' مروان نے ولید سے کہا ''نہیں! قسم اللہ کی اب تمہیں ان پر دسترس کا ایسا موقع کبھی بھی فراہم نہ ہوگا۔''

اس کے دوسرے روز، جب دن رات کی طرف بڑھ رہا تھا، ولید کی طرف سے لوگ آئے اور امام حسینؑ سے کہا کہ ولید نے آپ کو بلایا ہے۔ چونکہ امامؑ کے پیش نظر کل کا واقعہ تھا، جو دہشتگر دی کی نشاندہی کررہا تھا، لہٰذا امام حسینؑ نے رات کے وقت وہاں جانے سے انکار کردیا۔ اور دوسرے دن رات کے وقت مع اپنی بہنوں ، بھائیوں ، بھتیجوں ، بھانجوں اور اہل خاندان وغیرہ کے

ساتھ مکہ کی طرف چلے گئے کہ ایام حج قریب تھے۔ نانا کے مدینہ کو خیر باد کہتے وقت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

''میرے جہاد کا مقصد نہ تو ظلم ہے اور نہ بغاوت، اور نہ یہ کسی ذاتی مفاد وخودغرضی پر مبنی ہے۔ میں کسی طرح کی شرانگیزی یا کسی کے خلاف ظلم کو پھیلانا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے جارہاہوں، اور میں اپنے بزرگوں کے لائحہ عمل پر قائم رہوں گا۔'' ۹؂

امام حسینؑ شب جمعہ میں ماہ شعبان کی تیسری تاریخ کو مکہ پہونچ گئے ۔ مکہ میں امام حسینؑ سے ملنے کے لئے لوگ جوق درجوق آنے لگے۔ یہاں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ مدینہ میں طلب بیعت اور مروان کی غیر شریفانہ اور شرانگیز گفتگو کے باوجود امامؑ نے کوئی پر جوش تقریر کی ہو یا طلب بیعت کے خلاف لوگوں کو دنیا کے عام چلن کے مطابق اکسایا ہو بلکہ حج کو عمرہ میں بدل کر آپؑ نے مکہ کو خیر باد کہا، کیونکہ حاجیوں کے بھیس میں احرام میں تلواریں چھپائے ہوئے قاتل آ گئے تھے۔ ۷/ذی الحجہ کو آپؑ نے عازمین حج کے مجمع سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''۔۔۔جو بھی ہماری راہ میں اپنی جان دینے کو تیار ہے، اور جو اللہ سے ملاقات کی آرزو رکھتا ہے وہ ہمارے ساتھ کوچ کرے۔ ہم انشاء اللہ علی الصباح نکلیں گے۔'' چونکہ مقصد عظیم تھا، لہٰذا امام حسینؑ نے یہ بھی کہہ دیا (کہ) ''تم میں سے جو خیال کرتا ہے کہ اسے وہاں پہونچ کر سرکاری منصب ملے گا، اسے اپنی ان امیدوں کوختم کرکے اپنے گھر کولوٹ جانا چاہیئے۔'' ۱۰؂

امامؑ ۸/ذی الحجہ ۶۰ھ سے باہر نکل گئے، کوفہ جانا مقصود تھا۔ اثنائے سفر میں مقام ثعلبیہ پر آپؑ کو پتہ چلا کہ جناب مسلم ابن عقیل کو مع ان کے صاحبزادوں جناب محمد وابراہیم کے عبید اللہ ابن زیاد، گورنر کوفہ، نے قتل کروادیا ہے۔

امامؑ کا سفر جاری تھااور کوفہ دو منزل رہ گیا تھا کہ ابن زیاد کا سردار فوج حر ابن یزید ریاحی، اپنے دو ہزار سواروں کے ساتھ امام حسینؑ کے مقابلے میں خیمہ زن ہوا۔ اور کہا کہ میں آپ کو گرفتار کرکے کوفہ لے جانے کے لئے بھیجا گیاہوں۔'' اسی اثناء میں حر کو ابن زیاد کا اس مضمون کا خط ملا کہ حسینؑ کو ایسی جگہ روکو جہاں سبزہ نہ ہو! ''

امام حسینؑ مع اپنے قافلہ کے ۲/محرم ۶۱ھ کو وارد کربلا ہوئے۔ ۷ محرم سے مکمل بندش آب عمل میں لائی گئی۔ اشقیاء نے نواسۂ رسولؐ، حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے قافلہ پر پانی بند کردیا۔ ابھی کتنا

عرصہ گذرا ہے کہ رسول اللہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔۔'' کی سند دے کر گئے ہیں؟ صرف ۴۹ سال۔ یہ کیا ہوا کہ حسینؑ سے ایک فاسق وفاجر طلبگار بیعت ہے۔ ابھی تو سب کو یاد ہوگا کہ خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا: اَلْحَسَنعَلَیْہِ السَّلَام وَالْحُسَیْنعَلَیْہِ السَّلَام اَبْنَائِی، مَنْ اَحَبَّہُمَا اَحَبَّنِی وَمَن اَحَبَّنِی اَحَبَّہُ اللّٰہ، دَخَلَ الْجَنَۃ وَمَن اَبغَضَہمَا اَبْغَضَنی، وَمَن اَبْغَضَنی اَبْغَضَہ، وَمَن اَبْغَضَہٗ اَدْخَلہ النَّارْ یعنی حسنؑ اور حسینؑ میرے بیٹے ہیں، جس نے ان سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، اور جس نے مجھ سے محبت کی، اس نے اللہ سے محبت کی اور جنت میں داخل ہوا، اور جس نے ان سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے مجھ سے بغض رکھا، اس نے اس سے اللہ سے بغض رکھا پس وہ جہنم میں داخل ہوا (مستدرک حاکم)

عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا قتل گناہ کبیرہ ہے (اور) کفر، اور لعنت (تو) کافروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایسے کلام والوں کے حال پر افسوس ہے کہ بنی کریم □ کے کلام پاک پر ان کی نظر نہیں ہے کہ بغض واہانت وایذاء فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا اور ان کی اولاد کے ساتھ خود رسول اللہ □ کے ساتھ بغض واہانت وایذاء ہے، جو بے شک کفر ولعنت ہے اور وہ لوگ جہنم میں سزایاب ہوں گے۔ یہ آیہ کریمہ اس پر دال ہے:

اِنَّ الَّذِینَ یُؤْذُونَ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ وَأَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُھِینًا ؏ یعنی بیشک! جو لوگ خدا کو اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں، ان پر خدا نے دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی ہے، اور ان کے لئے رسوائی کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' ۱۱؎

امام حسینؑ نے کوئی لڑاکو فوج جمع نہ کی تھی، صرف ایمان والوں کو بلکہ راسخ العقیدہ ایمان والوں کو ساتھ لیا تھا۔

یزیدی فوج کی یلغار اور ظلم وجور امامؑ کے پیش نظر تھا۔ ایسے میں دنیا والے فوج اکٹھا کرتے ہیں، لیکن امامؑ معصوم کی قیادت میں یہ جہاد اللہ والوں کا جہاد تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور اولادوں، بھائیوں، اعزاء واقربا اور انصاران باوفا کو جمع کیا اور کہا:

''میں خدا کی حمد وثناء کرتا ہوں، جس نے ہمیں پیغمبری سے سرفراز کیا اور ہمیں قرآن اور دین کی تعلیم دی۔۔۔۔ میں اپنے اصحاب سے بہتر کسی کو نہیں جانتا، اور نہ اپنے خاندان سے زیادہ کسی کو دیندار ۔۔۔اللہ تم کو اے میرے اصحاب ! جزا عطا کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ کل ہمارا خاتمہ

ہوجائے گا۔۔۔۔میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ (یہاں سے) چلے جاؤ، میں تمہیں روکوں گا نہیں ! رات کا اندھیرا تمہیں ڈھانپ لے گا، اس کو سمند کی طرح کام میں لاؤ۔'' ۱۲؎

امامؑ نے صرف کہا ہی نہیں، چراغ بھی بجھا دیا کہ جانے والے چلے جائیں۔مگر کون جاتا اور کیوں جاتا؟ کہ امامؑ کی قیادت میں سب کے سب مشتاق جنّت تھے !حسینؑ نے بیعت اٹھائی تو سب سے پہلے جناب ام البنینؑ کا جری بیٹا۔عباسؑ جری ودلاورا ٹھا اور کہا: آقا ! ایک زندگی تو کیا، ستّر ستّر زندگیاں بھی ملیں گی تو آپ پر نچھاور کریں گے۔ پھر سب نے امامؑ کو چھوڑ کر نہ جانے کی بات کہی۔کربلا کے ایمان والے وفاداروں پر ہمارا سلام ! اے سید الشہداء آپؑ پر اور آپؑ کے انصار ان باوفا پر اور تمام شہدائے کربلا پر ہم سوگواروں کا سلام!

شب عاشورامامؑ نے مع اپنے ساتھیوں کےعبادت میں بسر کی۔صبح عاشور نمودار ہوئی۔آج اذان مولاؑ نے اپنے کڑیل جوان بیٹے حضرت علی اکبرؑ سے دلوائی، جوصورت وسیرت ورفتار وگفتار میں اپنے پدر بزرگوار امام حسینؑ کے نانا سے مشابہ تھے۔فوج یزیدی نے تیروں کی بارش کی۔اورقربانی کا دفتر کھل گیا۔ یکے بعد دیگرے امام حسینؑ کے سب ساتھی شہید ہوگئے۔ایک وقت وہ آیا کہ حسینؑ تن تنہا تھے، خیام میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ ان کے بیمار بیٹے، سید سجاد علی ابن الحسینؑ تھے۔ امام حسینؑ ان اشقیائ، ان نابکاروں کو تلقین حق کررہے تھے، اب بھی راہ راست پر آجاؤ۔امامؑ کے چہرہ پر گلوئے علی اصغرؑ سے نکلنے والا خون تھا،حرملہ کا تیر لگا،تو امامؑ نے وہ خون اپنے چلّو میں لے لیا تھا، اور جب زمین وآسمان نے اسے لینے سے انکار کیا،توانہوں نے اسے اپنے چہرہ پر مل لیا تھا۔امام حسینؑ عصر عاشور شہید ہوئے تو خیام میں آگ لگادی گئی۔اس شام غریباں میں زمین وآسمان روئے۔جلی ہوئی قناعتوں پر بیٹھی ہوئی بیبیوں اور بچوں کی آہیں اور آواز گریۂ فرش سے عرش تک جارہی تھی۔ سید سجّاد نے یہ ساری رات ایک سجدۂ شکر میں گزاردی۔۱۱رمحرم ۶۱ھ کو امام علیؑ ابن الحسینؑ، بچوں اور بیبیوں کو اسیر کرکے کوفہ اور کوفہ سے دمشق (شام) لے جایا گیا، جہاں انہیں قید کردیا گیا۔''حالانکہ امام حسینؑ نے جو احتجاجی پروگرام مرتّب کیا تھا' اس میں جنگ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وہ تصادم سے بچنے کی ہر امکانی کوشش کرتے رہے۔لیکن جنگ سے بچنے کی ان کی ہر امکانی کوشش ناکامیاب ہوگئی اور جب اموی فوجوں نے حسینؑ کو چاروں طرف سے نرغہ میں لے لیا اور ان سے بیعت کا مطالبہ کیا تو امام حسینؑ نے بڑے عزم وحوصلہ سے ان کا مقابلہ کیا،اور بڑے انوکھے انداز سے

انقلاب کے شعلہ کو فروزاں رکھا۔'' ۱۳؎

اسلام نے بنی نوع انسانی کی ہدایت کے لئے جو روحانی اور اخلاقی ومعنوی معیار پیش کئے تھے اور جن کی تعلیم محمد مصطفیٰ ﷺ نے دی تھی اور انہوں نے اور اہلبیتؑ نے جو عملی نمونہ پیش کیا تھا، اموی حکومت انہیں روندتی چلی جارہی تھی ، جو لوگ پایۂ تخت کے قریب تھے، وہ اس امتیاز کی وجہ سے ناجائز طور پر فائدے اٹھاتے ہوئے عیش کررہے تھے ، جب کہ عام آدمی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا شکار تھا، اسی لئے قانون الٰہی کے استحکام کے لئے امام حسینؑ نے بیعت یزید سے انکار کردیا تھا۔

''ایک طرف حسینؑ نیکیوں اورحسن اخلاق کا عملی نمونہ پیش کررہے تھے، تو دوسری طرف یزید (اپنے کردار میں) موروثی برائیوں کا بدترین نمونہ تھا۔ اگر حسینؑ لوگوں سے اسی طرح ہمدردی رکھتے تھے، جس طرح کہ دنیا میں عظیم المرتبت لوگ عام طور پر رکھتے ہیں، تو یزید انسانی جذبات سے بالکل عاری اور شرم وحیا سے مبرا تھا۔'' ۱۴؎

نواسۂ رسولؐ امام وقت حسینؑ ابن علیؑ نے یزید کی حکومت میں سیاسی ، سماجی ، معاشی اور اخلاقی صورتحال کو بگڑتے ہوئے دیکھا ، اور یہ بھی سب کچھ اسلامی قانون،احادیث رسولؐ اور سنت کے خلاف ہورہا تھا۔ اسلامی اقدار روندی جارہی تھیں اور تقسیم زر اور مواقع میں مساوات وعدل معدوم ہورہے تھے۔ جو لوگ اثر رسوخ رکھتے تھے یا سازشوں اور ترکیبوں کا سہارا لے سکتے تھے، پھل پھول رہے تھے اور جو لوگ اپنی سیدھی سچی محنت ومشقت کے ساتھ جینا چاہتے تھے،وہ محرومیوں اور صعوبتوں کا شکار تھے۔''جس وقت ہزاروں لوگ بھوک سے مررہے تھے ، اس وقت بنو امیہ کے خلیفہ نے معبد نام کے مغنّی کو بارہ ہزار دینار بخش دیئے، کیونکہ اس نے اپنی موسیقی سے خلیفہ کو خوش کردیا تھا۔حکومت کے امراء لاتعداد غلام اور کنیزیں رکھتے تھے۔ صرف عبدالملک کے بیٹے سلیمان نے ان میں سے ستّر ہزار کو آزاد کیا تھا۔نسل، خاندان اور پارٹی کی بنیادوں پر طرف داری اور تعصّب بنو امیّہ کے دور خلافت میں عام بات تھی ۱۵؎، حالانکہ اسلام نے اس تعصب کو ختم کردیا تھا اور امام علیؑ نے اس کی کوئی اجازت نہیں دی تھی۔'' ۱۶؎ ایسے میں بیعت کا مطالبہ، وہ بھی نواسۂ رسول سے!

جیسا کہ بیان ہوا، ۱۱ محرم کو یزیدی فوج نے امام علیؑ ابن الحسینؑ سید سجاد ، خواہران حسین مظلوم حضرت زینبؑ وامّ کلثومؑ ، اور ننھی سکینہ بنت الحسینؑ کو اسیر کیا اور کوفہ کی جانب روانہ کردیا، پھر وہاں سے دمشق (شام) کے لئے کوچ کیا۔ رسن بستہ بی بیاں تھیں اور طوق وسلاسل میں بندھے ہوئے

سید سجادؑ۔ ان لوگوں نے حالت اسیری میں اپنے خطبوں سے نہ صرف حسین مظلوم کی شہادت سے لوگوں کو روشناس کیا بلکہ عوام الناس کو وحشیانہ یزیدی مظالم سے بھی آگاہ کردیا۔حق وباطل کے درمیان حد فاصل کھنچ گئی۔ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ خود یزید کے بیٹے معاویہ ابن یزید نے بعد یزیدتخت وتاج پرٹھوکر مار کر اپنے باپ کےظلم اور سید الشہداءحسینؑ ابن علیؑ کی مظلومیت کا اعلان کیا۔

''مظلوم کربلا کی فتح پر فتح خود نازاں ہے۔کربلا ہمیں آواز دے رہی ہے کہ اگر زندگی کو بامقصد اور باہدف بنانا چاہتے ہوتو عزت ووقار کے ساتھ جینا سیکھو۔کربلا ۔۔۔ظلم وجور کے خلاف ایک روشن مشعل ، انقلابیوں کے لئے ایک علامت جہاد واحتجاج اورغم اور گریہ کرنے والوں کے لئے ایک اساس ہے،حسینؑ ہر شریف النفس اورحریت پسند انسان کے دل میں محبت اور وفاداری کی کسوٹی ہیں۔وہ خودشناس اٹل انقلابی کے لئے ایک نمونۂ عمل ہیں، جنہوں نے مظلوموں کےحق کی بات کی ، وہ پیغمبرؐ کے ان قریب ترین عزیزوں میں سے ایک ہیں،جن سے محبت کاحکم ہمیں اللہ نے دیا ہے۔'' ۱۷؎

''کربلا میں خون کے بادل برسے اورشہیدوں اور انقلابیوں کی نسلوں نے استحکام پایا اور بار آور ہوئے۔ امام حسینؑ کی بے خوف آواز آج بھی عالمی فضامیں گونج رہی ہے اور گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران نسل انسانی کوآزادی واستقلال کا درس دے رہی ہے۔کربلا ایک طوفان ہے جو ستمگروں کو ناامید کرتی ہے اور (انہیں) ہلا ڈالتی ہے۔'' ۱۸؎

کربلا بربریّت کے خلاف انسانیت کے اعلیٰ نظام کو آشکار کرتی ہے ۔کربلا باغیانہ طرزفکر کے خلاف رضائے الٰہی کے لئے خودکو پوری طرح سونپ دینے اور ناحق کے مقابلہ میں حق پر جمے رہنے کا نام ہے۔سخت ترین امتحان کی گھڑی میں امام حسینؑ نے جس یقین محکم کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ انسانی میں یکتا، لامثال اورلازوال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں۔

''کربلا۔۔۔، بنیادی طورپر انسانی وقار کی کہانی ۔۔۔ (اور) انسان کی حقیقی شرافت،عظمت کی اعلیٰ ترین چوٹی تک انسانی سفر کی داستان ہے۔ یہ فرد واحد اور اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین اصولوں کو پیش کرتی ہے۔ یہ وحشیانہ غلامی سے

آزادی تک کے سفر میں سنگ میل ہے۔ یہ اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ اس آزادی کا بنی نوع انسان میں قائم ہونا عین ممکن ہے۔ یہ کربلا روشنی کا وہ مینار ہے جو انسانیت کی رہنمائی منزل کمال تک کرتا ہے۔ جب کبھی بدی کی طاقتیں اس نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کے لئے اٹھتی ہیں، تو حسینؑ کا کارنامۂ عظیم اس کی درخشانی کو دوبالا کردیتا ہے۔ جس وقت انسانیت کے قدم راہ حق وحریت میں ڈگمگانے لگتے ہیں تو حسینؑ اس کا سہارا بن کر اسے بچالیتا ہے ۔۔۔ جب ظالموں کی طاقت کا طوفان چڑھ کر کسی فرد کو خوفزدہ اور دل شکستہ کردیتا ہے، اس وقت حسینؑ کی شخصیت کی مثال اسے یاد دلاتی ہے کہ وحشیانہ طاقت وجبر کی متحرک مدافعت کی مسؤلیت خود عائد ہوتی ہے ۔۔۔ حسینؑ دنیا والوں پر یہ سچ آشکار کرتے ہیں کہ زندگی کا مطلب جیسے بھی بن پڑے صرف جیتے رہنا ہی نہیں ہے۔'' ۱۹؎

سچ ہے، امام حسینؑ کا مایۂ نازعمل اور ان کی قربانی بے مثال ہے۔ بنی نوع انسان کو غنودگی کی کیفیت سے باہر تو نکل لینے دیجئے اور اسے صعوبتوں اور پریشانیوں کی وجہ سمجھ تو لینے دیجئے، تب تمام دنیائے انسانیت جوش ملیح آبادی کی ہمنوا ہوکر کہے گی:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

حوالے:

۱۔بحوالہ مولوی ضیاء احمد بدایونی، قول سدید یعنی رد خلافت معاویہ ویزید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۰

۲۔(ابن اثیر)، ایضاً، صفحات ۳۵۔۳۶

۳۔(طبری)، ایضاً، صفحہ ۶۸

۴۔الترمذی

۵۔ایضاً

۶۔مستدرک حاکم

۷۔سورۂ احزاب، آیت ۵۷

۸۔شیخ مفید، الارشاد(انگریزی)، صفحات ۳۰۱۔۳۰۲، ترجمہ مصنف مضمون ہذا

۹۔علامہ مجلسی ، بحار الانوار، جلد ۴۴، صفحہ ۳۲۹
۱۰۔شیخ مفید،الارشاد،صفحہ ۲۲۳، ازمقتل مطہری (انگریزی)،صفحات ۱۲۱۔ ۱۲۲،ترجمہ مصنف مضمون ہذا
۱۱۔پیر محمد عبدالصبور،شہوار کربلا، آستان عالیہ نقشبندیہ، اٹک ، ۱۹۷۹ء
۱۲۔الطبری ۱۱،۲۰۳۱۳ ایف ، بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد ۳، ای ۔ جے۔برل،لیدن،ہالینڈ،۱۹۷۱
۱۳۔پروفیسر سید احتشام حسین رضوی ،کربلا کا تاریخی منظر: انقلابی طاقتوں کا ماڈی تجزیہ، سرفراز، محرم نمبر ۱۳۹۶ھ،لکھنؤ،ص ۱۷۶
۱۴۔جارج جرداق صوت العدالۃ الانسانیہ (Voice of Human Justice) ترجمہ:ایم۔فضل انصاریان پبلیکیشن ،تہران،ایران،ص ۲۹۹، ۱۹۹۰ء
۱۵۔اس سلسلہ میں مورخین نے عمرو بن العاص،عبد الرحمن بن عوف (مسعودی مروجہ الذہب، ج ۳ ص ۳) مروان بن الحکم (ابن اثیر،تاریخ کامل، ج ۲،ص ۹) کا ذکر کیا ہے۔
۱۶۔جارج جرداق، مذکورہ بالا کتاب،ص ۲۴۶
۱۷۔ Imam Husain and the Day of Ashura,Tehran.I R Iran p.14
۱۸۔ایضاً ،ص ۱۰
۱۹۔دی مارٹرڈم آف کربلا، ترجمہ محمد اقبال صدیقی،نور پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ئ،ص ۶۱

]ب[

اصحاب حسینؑ کا ثبات قدم

ڈاکٹر ریحان حسن

بنی نوع انسان کا باہم میل جول رکھنا دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کیونکہ ہر انسان امور معاش و معاد میں ایک دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔اس بنا پر انسان کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنے لئے ایسے ہم نشین اور ساتھی کی جستجو کرے جس کی مصاحبت ودوستی سے دنیوی زندگی میں نیکی اور (اس کی ہم نشینی سے) اپنے امور معاد کی اصلاح کرسکے، چنانچہ جب حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں نے سوال کیا کہ ہم کسے اپنا رفیق اور ساتھی بنائیں تو فرمایا کہ اپنا رفیق اور ساتھی بنانے کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرو جس کے عادات واطوار کو دیکھ کر پروردگار یاد آجائے۔

تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ صحابی میں عظمت ووقار کی آمیزش اس وقت ہوئی جب کہ یہ لفظ حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں اور اصحاب کہف کے لئے استعمال ہوا لیکن لفظ صحابی کوعظمت ووقار کی معراج نواسہ رسولؐ کے باعظمت ساتھیوں سے ملی جیسا کہ سرکار امام حسینؑ نے میدان کربلا میں اپنے صحابیوں کے لئے فرمایا ''وَاللّٰہِ انّی لاَ اَعْلَم اَصْحَاباً اَوْفیٰ مِن اَصْحَابِی'' خدا کی قسم میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے اصحاب سے زیادہ وفاشعار نہیں پاتا۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت امام حسینؑ اثناء راہ مسلسل اپنی شہادت اور نت نئے شدائد ومصائب کا یقین دلاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ ہم تم سے اپنی بیعت کو اٹھائے لیتے ہیں تم لوگ واپس چلے جاؤ مگر اصحاب حسینؑ کے ثبات قدم میں مصائب و شدائد کو دیکھ کر ذرہ برابر بھی لغزش پیدانہیں ہوتی۔ اصحاب امام حسینؑ تو کربلا کے میدان میں قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ کی عملی تفسیر لکھ رہے تھے جس میں ارشاد خداوندی ہوتاہے ''وَ کَأَیِنْ مِنْ نَبِیٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِیُّونَ کَثِیرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَکَانُوا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصَّابِرِینَ''[۱۲] ''یعنی ایسے پیغمبر بہت سے گزر چکے ہیں جن کی معیت میں اللہ والوں نے جہاد کیا اور پھر ان کو خدا کی راہ میں جومصیبت پڑی ہےتو انہوں نے نہ ہمت ہاری اور نہ کمزوری دکھائی اور نہ گڑگڑائے اورصبر کرنے والوں کوخدادوست رکھتا ہے۔''

ضعف وکمزوری کے کون سے ایسے اسباب ہیں جو میدان کربلا میں یکجا نہ ہوگئے ہوں۔ تین دن کی بھوک اور پیاس کے ساتھ ساتھ اعداء دین کی ایسی سخت کلامی سے بھی اصحاب حسینؑ کا مقابلہ تھا جو زہر آلود تلواروں سے بھی شدیداذیت رساں تھی مگرتشنگی وگرسنگی کے ساتھ ساتھ بے انتہا شدائد وتکالیف کے باوجود اصحاب حسینؑ نے غنیم کے آسودہ سورماؤں سے جس بے جگری سے مجادلہ ومقابلہ کیا ہے اس کی تاریخ میں نظیرنہیں ملتی۔

امام حسینؑ نے شب عاشورا اپنے اعزاء اور اصحاب کو جمع کرکے فرمایا کل کے دن میں قتل کیاجاؤں گا اور کل جوبھی میرے ساتھ ہوگا وہ ضرورقتل کردیا جائے گا لہٰذا میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتاہوں اورتمہیں بخوشی اجازت ہے کہ تم لوگ پروہ شب میں جہاں چاہو چلے جاؤ اس ہمت شکن تقریر کے بعد بھی اصحاب امام حسینؑ نے اپنے دل میں یہ خیال بھی نہیں آنے دیا کہ اپنا تحفظ کریں بلکہ اس کریمانہ اور رحیمانہ تقریر کے بعد مسلم بن عوسجہ اسدی نے کھڑے

ہوکر یوں عرض کیا:

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے نازک وقت میں ہملوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں ہمیں تو پروردگار عالم کے سامنے آپ کے حقوق کو ادا کرکے جواب دہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ بخدا مجھ سے یہ ہوہی نہیں سکتا۔ خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ چھوڑ کر نہ جائیں گے تاکہ علم ہوجائے کہ آپ کے حقوق کو ادا کرنے میں رسول خداؐ کے حقوق کا خیال رکھا ہے۔''

حضرت سعید بن عبد اللہ الحنفی نے عرض کیا۔

''بخدا اگر آپ کے تحفظ کے حق میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر جلایا جاؤں اور میری خاک ہوا میں اڑادی جائے اور یہی برتاؤ میرے ساتھ ستّر مرتبہ کیا جائے تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا۔'' ۲؎

ہر انسان کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے لیکن اصحاب امام حسینؑ میں ایسے افراد بھی تھے جو امام کے مقابلے میں اپنی اولاد تک کو بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں درندوں کا لقمہ بننا پسند تھا لیکن امام عالی مقام کو تنہا چھوڑ کر جانا گوارہ نہ تھا۔ ابو الفرج اصفہانی ناقل ہیں کہ ایک شخص باہر سے آیا اور لشکر گاہ امام حسینؑ میں جاکر حضرت کے ایک صحابی محمد بشیر خضری سے کہا کہ تیرا بیٹا گرفتار ہوگیا ہے۔آؤ ہمارے ساتھ چلو اور ہم لوگ اس کی رہائی کے لئے کوشش کریں۔صحابی امام نے جواب میں کہا کہ ہم صبر کرتے ہیں، خدا سے اس کا اور اپنی شہادت کا اجر پائیں گے۔ امام نے سن کر فرمایا نہیں نہیں تم جاؤ ہم نے بیعت تم سے اٹھالی ہے بلکہ ہم تم کو مال بھی دیتے ہیں تاکہ اسے فدیہ دے کر اپنے بیٹے کو قید سے چھڑالو۔صحابی نے عرض کیا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور پھر لوگوں سے آپ کی خبر پوچھتے پھریں۔ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوسکتا نہ آپ کو چھوڑ سکتا ہوں یہ کہہ کر رخصت ہوئے اور میدان کارزار میں آکر جہاد کیا شہادت کے منصب اور پر فائز ہوگئے۔

صبح عاشور جب نمودار ہوئی تو حسینؑ کے پروانے امام عالی مقام سے اجازت لے لے کر میدان کارزار میں داد شجاعت دیتے یہاں تک کہ وقت نماز ظہر آپہنچا چنانچہ ابوثمامہ صیداوی نے کہا:

''فرزند رسول نماز ظہر کا اوّل وقت آ گیا۔ دل یہ چاہتا ہے کہ نماز ظہر آپ کی اقتدا میں پڑھ کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو امام نے بے ساختہ فرمایا۔'' ہاں یہ اوّل وقت نماز ہے، تم نے نماز کو یاد کیا خدا تمھیں نماز گزاروں اور نماز کے یاد رکھنے والوں میں شامل کرے۔''۳؎

ایسے پر ہول ماحول میں جب کہ انسان اپنے ہوش وحواس بھی بجا نہیں رکھ پاتا نماز کے اوّل وقت کا خیال رکھنا محض اصحاب حسینؑ ہی کے بس کی بات تھی۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب امیر المومنین حضرت علیؑ نے جنگ صفین میں تیروں کی بارش کے درمیان باطمینان مصلّے بچھا کر نماز اور وظائف پڑھنا شروع کیا تو آپ کے صحابیوں نے آپ کو روکنا چاہا لیکن حسینؑ کے اصحاب ایسے تھے جو جنگ میں تیروں کی بارش کے دوران اوّل وقت نماز کی یاددہانی کر کے فریضہ کو ادا کرنا چاہتے تھے میدان جنگ میں نماز قائم رکھنے کا عزم صرف حسینؑ ہی کے اصحاب کے بس کی بات تھی۔ ان کے طریقہ عمل سے آج بھی دنیا کو ایثار وقربانی خیال آخرت اور پاس امام کا درس ملتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے لشکر یزید سے نماز پڑھنے کی مہلت طلب کی لیکن نماز پڑھنے کی مہلت نہ دی گئی ۔حصین ابن نمیر نے کہا بھلا تمہاری نماز بھی قبول ہوگی۔ حصین بن تمیم کی بے ادبی اور اسلام سوز حرکت کا جواب دینے کے لئے امام حسینؑ کے بچپن کے دوست حضرت حبیب ابن مظاہر نے غضبناک ہوکر فرمایا:

''اے فاجرہ ماں کے بیٹے فرزند رسول کی نماز قبول نہیں ہوگی تو کیا تیری قبول ہوگی یہ کہہ کر حصین پر حملہ کردیا حصین کے گھوڑے پر وار کیا چنانچہ گھوڑا بدک گیا اور حصین گرگیا۔ حبیب نے چاہا کہ قتل کردیں مگر یزید کے سپاہیوں نے حصین کو آکر اٹھالیا اس وقت امامؑ نے زہیر ابن قین اور سعید بن عبد اللہ سے فرمایا کہ تم دونوں آگے کھڑے ہوجاؤ تا کہ میں نماز ظہر ادا کرلوں پس وہ دونوں بہادر سینہ سپر ہوکر کھڑے ہوگئے اور تیروں کو اپنے جسم پر روکنے لگے' اس طرح امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ بعنوان صلوٰۃ خوف نماز کو با جماعت ادا کیا۔'' ۴۔

امام حسینؑ نے سلام پڑھا تو سعید ابن عبد اللہ تیروں، نیزوں اور تلواروں سے زخمی ہوکر آپ کی آغوش مبارک میں آگرے دم توڑتے ہوئے عرض کیا یاَ بنَ رَسوُلُ اللہ ھَلْ وَفَیتُ یعنی اے فرزندرسول! کیا میں نے وفا کی ؟ آپ نے پیشانی کا بوسہ لے کرفرمایا اے سعید پروردگار تمہیں جزائے خیر دے۔ ایک روایت میں ہے کہ زہیر وسعید کی شہادت بہت زیادہ تیر لگ جانے کی وجہ سے نماز ختم ہونے کے فوراً بعد ہوگئی تھی۔ بیشک ابو ثمامہ صیداوی مہلت نماز طلب کرنے کے درمیان نصرت امام عالی مقام کرتے کرتے شہید ہوگئے، مگر فضیلت نماز کی وہ عظمت بتاگئے جو عبادت کے

شوقین بندوں کے قلوب سے ہرگز معدوم نہیں ہوسکتی۔

کتب تاریخ شاہد ہیں کہ وہ تیروں کی بارش میں بھی باہم مذاق کررہے تھے۔وہ تلواروں کے سائے میں بھی انگڑائیاں لے رہے تھے، وہ پتھروں اور تیروں کی بارش کو پھولوں کی بارش سمجھتے تھے، ان کے اٹھتے ہوئے قدم کو نہ تلواروں کی دھار روک پائی، نہ سنانوں کی دھاردارنوک۔ وہ میدان میں زخم پر زخم کھاتے رہے اپنی جان کو حسینؑ پر نثار کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے رہے لیکن اپنے آقا ومولا کر نرغہ اعداء میں چھوڑ کر پلک جھپکنے کے لئے بھی جانا گوارانہیں کررہے تھے۔ اصحاب حسینی کا یہ عدیم النظیر ایثار پوری دنیا کے لئے سبق آموز ہے۔

عمروبن قرطبہ انصاری نے میدان کربلا میں چوطرفہ لڑائی لڑکر اپنے جسم کو فرزند رسولؐ کی ڈھال بنادیا جو تیرآیا اپنے جسم پر لے لیا جو نیزہ آیا اپنے جسم پرروکا حتی کہ زخموں سے چور چور ہوکر زمین پر گرے۔ امام حسینؑ نے فرمایا اے عمرو تیری قربانی دنیا میں تاریخ کا حصہ اور آخرت میں قابل رشک رہے گی۔عمرو نے پھر کھڑے ہوکر جنگ کرنا شروع کی اور لاتعداد یزیدیوں کو واصل جہنم کرکے شہید ہوئے۔معرکۂ کربلا میں حسینؑ کے اصحاب وانصار نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ وہ تسلیم و رضا حق وصداقت اور وفا کی اعلیٰ ترین منزلوں پر فائز تھے بقول منظر لکھنوی ؎

شہیدان وفا کے حوصلے تھے داد کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا

مسلم ابن عوسجہ زین سے زمین پر تشریف لائے تو حضرت امام حسینؑ اور حبیب ابن مظاہر دونوں بیک وقت پہنچے امام حسینؑ نے مسلم کے چہرے سے غبار کو صاف کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلم اللہ تجھے جزائے خیر دے۔ جب امام عالی مقام ایک جانب ہوئے تو حبیب نے آگے بڑھ کر مسلم کا سرآغوش میں لے کر فرمایا مسلم میرے لئے تم کو اس حالت میں تڑپتے دیکھنا انتہائی شاق ہے اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی تمہارے بعد آرہاہوں تو میں تم سے یقینا تمہاری وصیت معلوم کرکے پوری کرتا۔اگر اس کے بعد بھی کوئی وصیت کرنا چاہوتو کرو میں اسے پورا کرنے میں اپنے لئے سعادت سمجھوں گا۔مسلم ابن عوسجہ نے دونوں ہاتھوں کو بلند کرکے فرمایا حَبِیب أوصِیک بھذاالرجل اے حبیب میں تم سے فرزند رسولؐ کی حفاظت کی وصیت کرتاہوں کہ جب تک تمہاری جان میں جان ہے

امام سے غافل نہ ہونا۔ یہ سن کر حبیب نے فرمایااے مسلم تم مطمئن ہوکر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو میری جانب سے تمہیں مایوسی نہ ہوگی۔ جیسے ہی حبیب نے عہد کیا مسلم کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

بلاشبہ ایسے نازک ترین لحظات حیات میں اپنے آقا کا اس قدر خیال صرف اصحاب حسینؑ ہی کرسکتے تھے بیشک انہوں نے جانفشانی اور سرفروشی کی جو مثال میدان کربلا میں پیش کردی۔ وہ نہ اس سے قبل پیش کی جاسکی تھی اور نہ قیامت تک پیش کی جاسکے گی۔

آقای محمد باقر دہدشتی بہبہانی لکھتے ہیں:

عابس ابن شبیب شاکری اور غلام عابس شوذب پتھروں ،تلواروں اور نیزوں کے زخموں سے چور چور ہوکر شہید راہ خدا ہوگئے تو عبد اللہ اور عبدالرحمن غفاری ایک ساتھ حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں ڈھاڑھیں مارکر روتے ہوئے آئے تو امامؑ نے فرمایا اگر تم لوگ واپس جانا چاہتے ہوتو اس وقت بھی تمہیں اجازت ہے کہ تم جاسکتے ہو اس لئے کہ یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ سن کر دونوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا آقا ہم اپنی جان کے لئے نہیں رورہے ہیں آپ نے فرمایا پھر گریہ کا سبب کیا ہے آقا ہم اس لئے رو رہے ہیں کہ ہم نے دشمنوں سے آپ کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہمیں اپنے بعد آپ کی تنہائی اور دختران رسولؐ کی بے چارگی ومایوسی رلارہی ہے کاش ہمارے بس میں کچھ ہوتا۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا بہت جلد ہم تمہارے پاس آئیں گے اور دختران رسولؐ کا بھی خدا محافظ ہے تم اپنی منزل کی جانب قدم بڑھاؤ خدا تمہیں جزائے خیر عطا کرے۔ یقینا تمہارے بس میں جتنا تھا تم نے اتنا کیا۔ دونوں نے امامؑ سے وداع ہوکر کہا اَلسّلَامُ عَلَیکَ یَا اَبَاعَبدِاللہ پھر میدان جنگ میں پہونچ کرلشکر یزید میں درانہ گھس گئے اور بے شمار دشمنوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد شہید ہوگئے۔

حضرت امام حسینؑ کےقتل کی آواز جب بلند ہوئی تو سوید بن مطعاع نے جو کثرت زخم کے سبب غش کھا کر مقتولین میں دب گئے تھے۔مگرجسم میں رمق حیات باقی تھی، یہ آواز سنی کہ امام حسینؑ شہید ہوگئے۔تو وہ دوبارہ لشکر یزید پر حملہ آور ہوئے ان کے پاس ایک چھرّا رہ گیا تھا تلوار چھن چکی تھی اسی چھرّے سے پھرلڑنا شروع کیا گھڑی بھر لڑے ہوں گے کہ اعداء دین میں شامل عروہ اور زید بن رفاء نے مل کر ان کو شہید کردیا۔

تاریخ کے اوراق اس سے بڑھ کر وفاداری وجانثاری کی نظیر نہیں پیش کرسکتے۔ ان وفادار اصحاب اور ناصروں کو دیکھ کر بے ساختہ دل کہہ اٹھتا ہے کہ شاید قلم قدرت نے ان اصحاب کی فہرست امام عالی مقام کی نصرت ومدد کرنے کے لئے خود تیار کی تھی۔

با وفا عاشق شبیرؑ شجاعت کے دھنی
منتخب ساری خدائی میں بہتر نکلے

یقینا اصحاب امام حسینؑ نے اپنے قول وعمل میں موافقت پیدا کر کے تاریخ صحابیت کا وقار اتنا بلند کردیا کہ اس سے زیادہ صحابی کا شرف ووقار بلند نہیں ہوسکتا۔ یقینا رہتی دنیا تک ان کی جانفشانیوں اور قربانیوں سے لوگوں کو جرأت مندی، ثابت قدمی، بہادری، قربانی، ایثار اور اپنے آقا کے لئے خلوص قلب کا پیغام ملتا رہے گا۔

حوالے:

۱۔سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۶
۲۔طبری، جلد ۶، صفحہ ۲۳۹
۳۔ابن اثیر بحوالہ تاریخ احمدی، صفحہ ۲۵۹
۴۔ناسخ التواریخ، جلد ۶، صفحہ ۲۶۸

حسینی انقلاب کا مقصد اصلاح امت

حجۃ الاسلام مولانا قربان علی

حضرت حق تعالیٰ نے ہمیں عقل دے کر حق وباطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت دی ہے ہم عقل سے کام نہ لے کر باطل کی پیروی کریں تو خدا ہمیں جہنم میں ڈھکیل دے گا۔ حضرت امام حسینؑ کا اصلاحی قیام آیا حق پر مبنی ہے یا نہیں؟ اس کو عقل سے پرکھنا ضروری ہے لہٰذا ہم چند سوالوں کے جوابات میں حق تلاش کرتے ہیں:

(۱) زمانہ جاہلیت میں رسولؐ کی اصلاحات اور اموی سفیانی دور کی جہالت میں حسینؑ کی اصلاحات میں کیا فرق ہے؟

(۲) یزید کی بیعت کا مطالبہ نہ ہوتا ،تب بھی آیا حضرت امام حسینؑ قیام فرماتے ؟
(۳) کوفیوں نے حکومت کی دعوت نہ دی ہوتی تو کیا حضرت امام حسینؑ پھر بھی قیام فرماتے ؟
(۴) حضرت امام حسینؑ کا قیام آیا ایک اتفاقی امر تھا یا پہلے سے سوچی سمجھی تد بیروں کا نتیجہ تھا ؟
(۵) حضرت امام حسینؑ نے روش شہادت کیوں اپنائی جبکہ تشکیل حکومت سے بھی اصلاح ہوسکتی تھی ؟

جاہلی عرب کی اجتماعی و انفرادی زندگی کی تمام بد بختیوں اورضلالت و گمراہی کے اسباب زیادہ ہیں مگر دوسبب بہت اہم ہیں :

الف : جہالت وتنگ نظری نے عرب کو شرک وبت پرستی ، بیٹیوں کو زندہ دفن اور ماں کو شادی سے محروم کرنے یا اس سے شادی رچانے کی طرف ڈھکیلا ہے۔

ب: ضمیر مردگی اورقساوت قلبی نے عرب کو جہنم تک پہنچادیا تھا،عرب کا ضمیر بیدار ہوتا تو وہ کبھی شہوت رانی ،شرانجوری قتل وغارت گری ،مال ودولت کی خاطر باپ بیٹے اور بھائی کا خون کرنے یا چند وقت کا کھانا اورآ زوقہ دے کر بھائی کے بچوں کوگروی رکھنے کی اجازت نہ دیتا اور نہ ہی اپنے تمام امور عورتوں پر چھوڑ کر عیش وعشرت کدہ میں جاتا۔حضرت ابراہیمؑ نے مکہ میں توحید اور دین حنیف کی بنیاد رکھی تھی مگر لوگ رفتہ رفتہ بت پرستی ،ملائکہ پرستی ،دوگانہ پرستی، خورشید پرستی اور ستارہ پرستی کی طرف بڑھ گئے اورنوبت یہانتک پہنچی کہ کعبہ میں عورتوں کی تالیوں اور سیٹیوں کی گونج میں برہنہ اور حالت مستی میں عبادت اور نماز ادا کی جانے لگی ،جاہلی عرب معاشرہ میں عورت کا وجود حقارت آمیز تھا ، باپ کی نظر میں عورت شیطان اور فتنہ وفساد کی جڑ تھی اس لئے وہ اپنی بیٹی کو زندہ دفن کردیتا تھا ،عرب معاشرہ میں قوم وقبیلہ پرستی مایہ افتخار تھی ،رئیس قبیلہ کے انتخاب میں سن رسیدگی ،بزرگی،قبیلی تعصب اور دولت ملاک تھی البتہ قبیلہ کی حاکمیت موروثی نہیں تھی ،قبائل عرب میں قریش کو سیاست میں بڑا دخل تھا، اشراف مکہ اس کے سر فہرست تھے ،وہ اپنے ظالمانہ قوانین کے سبب پورے عرب پر حکمرانی کرتا تھا۔ بہرحال جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں آفتاب رسالت طلوع ہوا اور ضمیروں کو بیدار کردیا، جہالت کو کچل ڈالا ،منحرف عقیدوں کی اصلاح کی ،شرک وبت پرستی کوختم کرکے توحید کا درخت اُگایا تو بلال قریش کے شکنجوں میں اَحَدْ اَحَدْ کی صدائیں بلند کرتا ہے ،قرآنی تعلیم اور معلم قرآن کی جان لیوا کاوشوں نے جاہلی عرب معاشرہ کی کایا پلٹ دی ،کل جو باپ اپنی بیٹی کی شادی قبر کی مٹی سے رچاتا تھا آج شرمندہ ونادم ہوگیا،کل شراب پینے والا آج شراب خانوں میں آگ لگا

دیتا ہے ،کل جو غیر کی بہو و بیٹیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا تا تھا، وہی آج زانی کو اپنے ہاتھوں سے سزا دیتا ہے، کل جو عیش وعشرت اورقتل وغارت میں غرق تھا آج وہی مناجات ،رازونیاز اور کفار سے جنگ و جدال میں مشغول ہے ، آنحضرتؐ نے جہالت کو دور اورضمیروں کو بیدار ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے دینی جوش وولولہ کو بھی بڑھاوادیا تھا۔

لیکن رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی امت اسلامی کا عقیدہ اورایمان سست پڑ گیا ،خلفاء ثلاثہ کے دور نے اسلامی معاشرہ کا دھارا بدل دیا،نتیجہ میں پرانے زمانے کی پرانی جاہلیت ،نئی جاہلیت کے روپ میں آگئی۔عرب کا کینہ وحسد دوبارہ گل بوٹے کھلانے لگا ، چوری ڈکیتی ،غارت گری دوبارہ لوٹ آئی، بس فرق اتنا تھا کہ کل غیروں کا مال جھٹکے سے کھایا جاتا تھا، آج مسلمانوں کے خزانوں پر ڈکیتی پڑنے لگی ،شراب دوبارہ دستر خوانوں پر سجائی جانے لگی اور عدالت کی کوٹھری میں بھی جا گھسی ، خلیفہ کا نمائندہ کوفہ کا گورنر حالت مستی میں نماز پڑھاتا ہے ،خاندانی رقابت تعصب قومی اورثروت زمانۂ جاہلیت میں رئیس قبیلہ کے انتخاب میں معیارتھی ،خلفاء ثلاثہ کے انتخاب میں بھی وہی استعمال کی گئی جس نے امام علیؑ کے ہاتھوں سے حاکمیت کی باگ ڈورچھین لی تھی۔

اموی سفیانی دورمیں زمان جاہلیت کی عداوت ودشمنی اورقتل وغارت گری اپنے عروج کو پہنچ گئی، سفیانی دور میں بھی جہالت وتنگ نظری اورضمیروں کا سوجانا تمام بدبختیوں کا باعث تھا،مال ومنال اتنا اہم قرار پایا کہ لوگ اپنا دینی تقدس کھوبیٹھے ، بڑی بڑی امانتوں پر ہاتھ مارنے لگے ،ظلم پر پردہ، اہداف کو پایۂ تکمیل اوراپنی بدعتوں کو دینی رنگ چڑھانے کیلئے دھڑادھڑ حدیثیں جعل ہونے لگیں، دین میں تحریف کی اس سے بڑھ کراورکیامثال ہوگی کہ عائشہ نے معاویہ سے پوچھا: کیوں یزید کو جانشین بناتا ہے؟ تو اس نے کہا : خلافت یزید قضاء الٰہی اورخواست خدا ہے ،بندوں کو دخالت کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ سچے رہنماؤں کودینی راستے سے ہٹادیا گیایہاں تک کہ لوگ اپنے بچوں کا نام علیؑ کے نام پرنہیں رکھ سکتے تھے ،امام حسنؑ کوبھی کنارے ڈال دیا گیا اور امام حسینؑ کو ہٹانے کا منصوبہ توزیادہ قوی تھا۔ دس سالہ امامت کے دورمیں صرف ۲۷۵ حدیثیں احکام شرعی میں آپ سےنقل ہوئی ہیں، امام کو راستہ سے بالکل ہٹایا جاچکا تھا، چنانچہ میدان کربلا میں وہ خودفرماتے ہیں: ’’کوفیو! پہچانوں میں کون ہوں؟ میں تمہارے رسولؐ خدا کی بیٹی فاطمہ زہراؑ کالخت جگرہوں‘‘۔حضرت امام حسینؑ کے زمانے کی نئی جاہلیت میں بھی جہالت وتنگ نظری،عوام فریبی اورضمیروں کا سوجانا تمام بدبختیوں کا باعث تھا ،امام

کے دور میں نئی جاہلیت ایک ایسی محیط اور فضا میں اتری جب قرآن کا بڑا بول بالا تھا۔کتنے لوگ حافظ، کتنے کاتب وحی اور کتنے قاریان قرآن تھے جو لوگوں کو قرآن پڑھ پڑھ کر سنا رہے تھے گویا قرآن کا پیغام لوگوں تک پہنچ چکا تھا، حضرت رسول خداؐ اپنے وجود،معجزات،سنت وعمل، زبان وحی اور اپنی یادگار سیرت کے ساتھ ابھی ابھی زندگی کو خیرباد کہہ چکے تھے، لوگ ابھی تک آپ کے پاکیزہ انفاس،خطبوں ،حدیثوں اور زرین اقوال وافعال کے ذریعہ اپنی روحوں کو صیقل دے رہے تھے۔ ابھی تک آنحضرتؐ کی امانت داری ،شجاعت ،صداقت،عبادت ورشادت ،پارسائی،محنت ومشقت، پیار ومحبت،ایثار وقربانی جیسے سیکڑوں ممتاز کمالات کی حکایتیں سینہ بسینہ نقل ہورہی تھیں جو مسلمانوں کی عبرت کا باعث تھیں،مگر اس کے باوجود وہی سب کچھ ہورہا تھا جو کل اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ کی ہمعصر نئی جاہلیت، جناب ابوذر ،عمار،مقداد،ابن مسعود، مالک اشتر،محمد ابن ابی بکر،حجرابن عدی ،عمرابن حمق خزاعی اور دیگر دسیوں پاکباز شہیدوں کی مقاومتوں کی سنگین باڑھ اور حضرت علیؑ اورامام حسنؑ کی قدآور شخصیتوں کو روندتی آگے بڑھی تھی تاکہ علم کو مات دیدے لہٰذا اس سے ٹکرانا آسان کام نہ تھا۔[۱]

یزید کی بیعت پر اصرار نے امام کو قیام کیلئے مجبور کیا تھا:

مدینہ کے حاکم ''ولید بن عتبہ'' نے امام کو طلب کیا اور مرگ معاویہ کی خبر دے کر کہا: یزید کا حکم ہے : ہماری بیعت حسینؑ سے لے لو ،بیعت نہ کریں تو انھیں سانس لینے کی بھی مہلت نہ دو ، اب آپ بتائیے ! بیعت کرتے ہیں یانہیں؟ امام نے فرمایا: ''مجمع عام اور دن کے اجالے میں بات کرنا جب تم دوسروں سے بیعت لے لوگے'' مروان نے کہا: ''اے ولید! بیعت لئے بغیر حسینؑ کو جانے نہ دو ،قید کرلو ،بیعت کریں تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کردو'' امام نے کہا: ''یابن الزرقاء ! تیری یہ مجال! تو مجھے قتل کرے گا ؟ امام کی آواز پر بنی ہاشم کے جوان دربارمیں درآئے اور امام کو بخیر وعافیت واپس لے آئے ،اس کے بعد مروان نے ولید سے کہا: ''تونے میری بات نہیں مانی،ایسا موقع پھر کبھی تیرے ہاتھ نہ آئے گا ،ولید نے کہا: تم مجھے ملامت نہ کرو ،تمہارا مشورہ میرے دین کی تباہی تھا،قتل حسینؑ کے عوض پوری کائنات کی دولت مل جائے تو مجھے منظور نہیں ،صرف بیعت نہ کرنے پر قتل کردوں، خدا کی قسم روز قیامت جس سے خون حسینؑ کی باز پرس ہو، وہ جہنم میں جائے گا''[۲]۔ بیعت یزید کا مطلب ایک فاسق وفاجر اور نالائق کی خلافت اور ایک ظالم حکومت کی تائید کرنا تھا جس

کی بنیاد امیر شام نے ڈالی تھی ،حیات معاویہ ہی میں امام حسینؑ نے یزید کی ولیعہدی کو ٹھکرادیا تھا اور بیعت سے انکار کردیا تھا۔ ۳؎ حضرت امام حسینؑ نے جہاں معاویہ کو خط لکھ کر دوسرے امور ومظالم پر سرزنش کی تھی وہاں یزید کی ولیعہدی کے بارے میں بھی سرزنش کی تھی کہ تو نے ایک سگباز اور شرابی کو ولیعہد بنایا ہے۔ ۴؎ آج بھی جب بیعت کا مطالبہ ہوا تو امام نے صاف انکار کردیا اور اپنے اہل وعیال ،عزیز واقرباء اور دوستوں کو لے کر مکہ چلے آئے تا کہ دنیا بھر کے حاجیوں کو اپنے قیام کا مقصد سمجھائیں۔ حضرت امام حسینؑ کا قیام اب تک ایک ناجائز تقاضے سے انکار اور اس میں امام کا وظیفہ ایک دفاعی وظیفہ تھا جس کا آغاز کوفیوں کی دعوت سے پہلے ہو چکا تھا۔

کوفیوں نے دعوت دی ،تب امام نے قیام کیا تھا:

کوفہ میں جنہیں ۲۰ سال پہلے حضرت علیؑ کی حکومت یاد تھی ،جو امام کی تعلیم وتربیت، عدالت اور سر پرستی میں پروان چڑھے تھے ،سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور امام حسینؑ کو تشکیل حکومت کی دعوت دے ڈالی، ۱۲یا ۱۸ ہزار خطوط لکھے ،امام کو کوفیوں کا پہلا خط قیام سے ۴۲دن کے بعد ۱۰ رمضان ۶۰ ھ کو ملا جس نے حسینؑ پر شرعی ذمہ داری عائد کردی لہٰذا آپ نے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجا تا کہ کوفہ کی فضا کے بارے میں خبر دیں ،یہ امام کا مثبت اقدام ہے ،بیعت سے انکار اور مدینہ سے مکہ میں اب تک گویا امام حسینؑ کے ذمہ کوئی وظیفہ نہیں تھا لیکن اب کوفیوں نے شرعی وظیفہ معین کردیا تھا لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کوفیوں نے چونکہ امام کو دعوت دی تھی، تب امام نے حکومت کی لالچ میں بیعت سے انکار اور قیام کیا ہے اور یہ دو شہزادوں کی جنگ ہے ، پہلے امام حسینؑ نے قیام کیا ہے، تب کوفیوں کی دعوت آئی ہے ،اگر ان کی دعوت نہ آئی ہوتی زمین خدا تنگ کردی گئی ہوتی تب بھی امام اپنے قیام کو جاری رکھتے۔

امت کی اصلاح اورامر بالمعروف ونہی عن المنکر کیلئے قیام کیا تھا:

حضرت امام حسینؑ نے پہلے ہی روز اصلاح امت جد ،امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا شعار بلند کرکے مدینہ چھوڑا ہے لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ امام نے چونکہ بیعت سے انکار کردیا تھا پس قیام کرنا یا عبداللہ بن زبیر کی طرح چھپ کر بھاگ جانا ناگزیر تھا،نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اگر امام سے بیعت کا مطالبہ بھی نہ ہوتا تب بھی حسینؑ قیام کرنے کو اپنے اوپر واجب جانتے تھے، اس لئے کہ آپ کے قیام کا مقصد یزید کی غیراسلامی حکومت پر اعتراض تھا، اس کی حکومت منکرات ،فساد اورظلم وجور سے بھری

تھی اس لئے امام پر شرعی ذمہ داری اور وظیفہ الٰہی عائد ہوتا تھا کہ قیام کریں۔

کوفیوں نے یزید سے منھ موڑ کر دعوت دی تھی اور آپ نے قبول کر لی تھی اس لئے ان کی دعوت اہم ہے، اگر حالات سازگار ہوتے تو ضرور اس پر عمل کرتے مگر بیعت سے انکار کرنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ امام نے بارہا ٹھوس لہجہ میں کہہ دیا تھا کہ کچھ بھی ہو میں بیعت نہ کروں گا، سر کٹادوں گا بیعت نہ کروں گا ،امام حسینؑ کے عزم اور مقاومت سے پتہ چلتا ہے کہ یزید کی حکومت باطل اور ایک غیر اسلامی حکومت تھی لیکن ان دونوں عوامل سے زیادہ اہم تیسرا سبب''اصلاح امت ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا فریضہ ہے ،انکار بیعت دفاعی پہلو رکھتا ہے ،بھاگ کر یا کسی جگہ چھپ کر جان بچائی جا سکتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن زبیر نے بچائی تھی ،کوفیوں کی دعوت بھی اہم نہیں ہے کیونکہ جب کوفہ کی فضا مکدر اور جناب مسلم کے قتل کی خبر ملی ہے تو امام کو اس وقت عراق کے سفر سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جناب مسلم کی شہادت کے بعد جو خطبے امام نے دیئے ہیں وہ بڑے سخت ،گرم اور پر ہیجان ہیں ، ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سب سے زیادہ اسی تیسرے سبب'' امت جد کی اصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر زیادہ تکیہ کئے ہوئے ہیں ،یزید پر زیادہ معترض اور غضبناک ہیں۔''

حکومت یزید کا پس منظر:

شامیوں نے نہ رسولؐ کو درک کیا تھا اور نہ ہی مخلص اصحاب کو دیکھا تھا ،مدینہ والے جس طرح اسلام سے واقف تھے ،شامی لوگ اس طرح واقف نہ تھے ،۱۱۳صحابیوں نے شام کو فتح کرنے میں کردار ادا کیا تھا یا انھوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی تھی مگر ان کی اکثریت بہت کم عرصہ میں وفات پا گئی تھی، باقی گوشہ نشین تھے کیونکہ نہ ان کی چلتی تھی اور نہ ہی ان کی کوئی عزت تھی ،شامیوں نے بس خالد بن ولید اور معاویہ بن ابی سفیان کو دیکھا تھا ،نئی نسل اور یزید کے ہم سن افراد حقیقی اسلام سے آشنا نہ تھے،امیر شام نے اس طرح ان کی تربیت کی تھی کہ لوگ اپنی بصارت اور آگاہی سے محروم تھے ،وہ اونٹ اور اونٹنی میں تمیز نہ کرتے تھے ،جمعہ کی نماز بدھ کو پڑھ لیا کرتے تھے ،بس وہ امیر شام کے اسلام پر راضی اور اس کے سامنے سجدہ ریز تھے ۔۵۔

اپنے زمانہ کی پرانی جاہلیت میں رسول نے اپنی معنوی اور آسمانی شخصیت،قرآن وسنت ،مکرر معجزات،اپنی مقاومت وجہاد کے جو ابزار ووسائل استعمال کئے تھے ،ان سے امام حسینؑ اپنے

دور کی جاہلیت کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، یہ سب تو اس کے سامنے فیل ہو چکے تھے ،قرآنی آیتیں جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرتی تھیں، دلوں کو خاشعین کی منزلوں میں لاتی تھیں،آج ان کا اثر جاتا رہا تھا، الفاظ قرآن کی قرائت سے دل خوش کیا جاتا،احادیث وآیات کے نفوذ کا راستہ بند ہوگیا تھا،روز بروز جہل قاریان قرآن اور فقہاء کی روحوں کے ذریعے پروان چڑھ رہا تھا ،اس کے سامنے نبی مکرم □کی اصلاح کے ہتھیار بھی فیل تھے، جہالت کے مقابلے میں رسول □ کے موقف میں اور امام حسینؑ کے موقف میں زمین تا آسمان فرق تھا، نبی مکرم □کی اصلاح کے ہتھیار آج فیل ہو چکے تھے، امام کے دور کی نئی جاہلیت ،اپنی اصلاح کیلئے نئی روش اور نئے ہتھیار مانگ رہی تھی ،تنگ نظری ،ضمیر مردگی اور عوام فریبی نے تحریف دین،حدود کی تعطیل ،حدیثیں جعل ،آیتوں کے معانی ومفہوم میں الٹ پھیر کرنے کی فضا ہموار کردی تھی ،امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی آواز کو نطفہ میں ہی گھونٹ دیا جاتا تھا،رسولؐ کے سچے اور برحق آئمہ کو راستے سے ہٹا کر ان کے ہاتھوں میں بیلچہ وپھاوڑہ پکڑادیا تھا،سقیفہ سے اس کی ریت چلی آرہی تھی،تمام عہدوں پر جاہلوں نے قبضہ کر رکھا تھا،زبان وحی کے فرزندوں ''امام حسنؑ وامام حسینؑ'' کو گوشہ نشینی پر مجبور کردیا تھا ، جاہلی آداب ورسوم لوٹ آئے تھے پس حضرت امام حسینؑ کے زمانے کی جہالت اوردین سے دوری اصلاح کیلئے نئی روش اور نئے ہتھیار مانگ رہی تھی ،روز بروز حسینؑ پر دوسروں کی نسبت زیادہ سخت گذر رہا تھا،ہر روز اس خدائی مرد پر روحی شکنجہ اورغم بڑھتا جارہا تھا اسلئے امام ہرطرح کی قربانی دینے کیلئے تیار تھے تاکہ اپنے جد کی امت کو گمراہ ہونے سے بچالیں لیکن تنہا آمادہ ہونا اور اصلاح کی صلاحیت رکھنا تو کافی نہیں تھا جب تک کہ تحقق اصلاح کے اسباب فراہم نہ ہوجائیں چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے دومتمائز اورمختلف موقف اختیار کئے :

اعتراض آمیز سکوت :

حضرت امام حسینؑ نے حاکم شام کے دور میں نہ خود قیام کیا اور نہ دوسروں کو اجازت دی، دوستوں نے اصرار کیا تو فرمایا: ''جب تک یہ امیر زندہ ہے، گھروں میں ایسے بیٹھے رہو، جیسے فرش بچھا رہتا ہے'' آپ کے سکوت کی دلیل یہ ہے کہ امیر شام بدرجہ اتم مکارو چالاک تھا جب لوگوں نے امیر شام کی چالاکی کے طعنے حضرت علیؑ کو دیئے تو آپ نے فرمایا: ''خدا کی قسم ! معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک وسیاستداں نہیں ہے وہ چالاکی دکھاتا ہے اور مرتکب گناہ ہوجاتا ہے اگر مکاری بری چیز

نہ ہوتی تو میں لوگوں میں سب سے بڑا سیاست مدار ہوتا۔لیکن کیا کروں ،مکاری گناہ ہے اور گناہ کفر کا باعث ہے'' ٦۔

اگرامام حسینؑ نے اس کے دور میں قیام کیاہوتا تو وہ فوراًنقض صلح امام حسنؑ ،خلیفہ کے خلاف خروج اور فتنہ گری کا مارک چپکا دیتا اورعوام فوراًقبول کر لیتے،امیر شام نے حسینؑ کے چاہنے والوں پرظلم ،قتل وغارت گری اور امام علیؑ کومنبر سے گالیاں دینے کے سلسلے کو جاری رکھا تا کہ حسینؑ اُٹھ کھڑے ہوں تووہ ان کوصفحہ ہستی سے مٹادے لیکن امام اس کی سیاست کوسمجھ گئے تھے لہٰذا مناسب وقت کے انتظار میں بیٹھ گئے اور آپ کا یہ سکوت ایک حکیمانہ فعل تھا۔

اصلاح سے بھرپور قیام:

معاویہ کے مرتے ہی ایک دم حالات بدل گئے تھے۔پس حضرت امام حسینؑ نے سکوت توڑا، بیعت سے انکار کیا اور مکہ میں آٹھہرے ،چار مہینے کچھ دن قیام کیا تا کہ دنیا پر حجت تمام ہوجائے کہ فرزند رسول ﷺ نے قیام کردیا ہے جوظلم کے خلاف اپنے شرعی وظیفہ پرعمل کرنا چاہے، وہ آئے اور مدد کرے مگر پورے عالم اسلام سے کوئی آواز نہ آئی۔کوفہ سے ایک مری ہوئی آواز آئی جس پربھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا پھربھی امام نے مسلم بن عقیل کوبھیج دیا تھا اورخودبھی اسی آواز کے سہارے چل پڑے تھے ،محمد بن حنفیہ ،عبداللہ بن عباس اور بڑی بڑی قد آورشخصیتوں نے روکا ،سمجھایا اورمشورہ دیا مگر امام تیارنہ ہوئے کہ اب وہی اعتراض آمیزسکوت جاری رکھیں ،ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر بیعت کا مطالبہ بھی نہ ہوتا،صرف مرگ معاویہ کی خبرمل جاتی توحضرت امام حسینؑ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے لہٰذا سب سے زیادہ اہم تیسرا سبب '' امت جد کی اصلاح، امر بالمعروف اورنہی عن المنکر'' ہے ،صرف اسی ہدف پرنشانہ لگاکے آپ نے قیام کیا ہے۔

مسلمانوں کا خلیفۂ وقت یزید:

ایک ناتجربہ کار،شہوت پرست ،عیاش ،بے شرم وبے باک،سگباز ،شراب خور ،مغرور، احمق،کوتاہ فکر اور دوراندیشی سے محروم تھا،یزید کی ماں مسیحی تبارتھی ،عیسائی تعلیم وتربیت اوراخطل نامی نصرانی شاعر سے رابطہ دوستی رکھتی تھی ۔ ۷۔ یہی وجہ ہے کہ یزیدفخر یہ کہا کرتا تھا: ''اگر دین محمدیؐ میں شراب حرام ہےتو دین مسیح کی اساس پرشراب لو اور پیئو ۔'' ۸۔ یزید اپنے دادا ابوسفیان کی

طرح تمام چیزوں کو فرضی تصور کرتا تھا لہٰذا واقعہ کربلا کی ظاہری کامیابی پر کہتا ہے : ''بنی ہاشم کا ایک کھیل تھا، نہ کوئی عالم غیب ہے اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔''یزید جنگ بدر کے مجاہدوں سے اپنے دیرینہ کینہ وحسد کا اظہار اور قتل حسینؑ سے اپنے آباء واجداد کے قتل کی تلافی کرتے ہوئے کہتا ہے : ''کاش! ہمارے آباء واجداد جو جنگ بدر میں مارے گئے ہیں ،حاضر ہوتے تو بڑے خوش ہوتے اور کہتے ''یزید تمہارا ہاتھ صحیح سلامت رہے اور کبھی شل نہ ہو۔'' ہم نے آل علیؑ کو جنگ بدر کا مزہ چکھا دیا اور ان سے اپنا انتقام لے لیا۔۹۔ الغرض امیر شام کے مرتے ہی معاشرہ کی اصلاح اور اسلام زندہ کرنے کے اسباب فراہم ہوگئے تھے، اب امام صلح حسنؑ کے تابع نہ تھے،تفرقہ اندازی ،خروج بر خلیفہ اور نقض اتحاد کا مارک چپکا کر امام کے قیام کو مخدوش اور متنفر کرنے والا اب کوئی نہ تھا ،ایسی صورت میں نواسۂ رسولؐ کے عنوان سے حسینؑ کا قیام اگر شہادت کو بھی طلب کرتا، امویوں کو بڑا مہنگا پڑتا کیونکہ امیر شام کی جگہ پر یزید جیسا بدنام زمانہ شخص بیٹھا تھا، یزید کی حالت اتنی بد تر تھی۔خوداس کے چاہنے والوں کی زبان اس پر اٹھتی تھی۔ جب معاویہ نے زیاد ابن ابیہ سے یزید کو اپنا ولیعہد بنانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس کی مخالفت کی تھی ،یہی وجہ ہے کہ جب تک زیاد زندہ تھا امیر شام نے یزید کیلئے بیعت نہیں لی تھی۔۱۰۔

یزید فسق وفجور اور عدم لیاقت کے لحاظ سے اتنا برا تھا کہ زیاد جیسے خونخوار ،سفاک اوردنیا پرست شخص کی عقل بھی اجازت نہ دیتی تھی ، معاشرہ کی باگ ڈور ایک احمق کے ہاتھ میں دے دی جائے ورنہ زیاداسلام کیلئے دلسوز دل کہاں رکھتا تھا کہ وہ یزید کی بے دینی پر آنسو بہاتا۔ یزید کا چہرہ ظاہر ہونے سے امام کے قیام کا مقصد روشن ہوجاتا ہے ، یزید کی حکومت اسلام میں ایک موروثی ظالم حکومت کی بدعت کا آغاز کرنے والی تھی پس اگر امام، یزید کی بیعت کرلیتے تو آپ کی یہ بیعت یزیدی حکومت کیلئے ایک بہت بڑی دلیل بن جاتی ،امام نے مدینہ میں ولید بن عقبہ سے کہہ دیا تھا: ''یزیدجیسا معاشرہ پر مسلط ہوتو سمجھ لو اسلام کی فاتحہ پڑھی جاچکی ہے''۱۱۔

بہرحال یزید کے برسراقتدار آنے سے قیام کے اسباب مہیا ہوگئے تھے ،امیر شام کے دور میں ہر قیام ناکام تھا ،نہ ظاہری کامیابی لاتا اور نہ ہی خون رنگ لاتا لیکن آج لوگوں کی روح خون امام حسینؑ کے پیام کو جذب کرنے کیلئے آمادہ تھی ،بہت حساس وقت تھا جس کا دسیوں سال سے حضرت علیؑ اورامام حسنؑ انتظار کرتے کرتے شہید ہوگئے تھے ،ضمیروں کو بیدار کرنے کیلئے زلزلہ خیز وقت آچکا تھا اگر

یہ وقت نکل جاتا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آتا ،آج حسینؑ کو ۷۲ ساتھی مل بھی گئے تھے پھر کسی کو یہ بھی نہ ملتے اور امت کی اصلاح ناممکن تھی لہٰذا امام نے وقت کو غنیمت جانا اور اٹھ کھڑے ہوئے ،حضرت امام حسینؑ اپنے اس قیام میں غالب آتے یا مغلوب ہوجاتے دونوں صورتوں میں فاتح اور کامیاب تھے ،اگر غالب آتے حکومت تشکیل دیتے تو بھی اسلام زندہ ہوتا اور اگر مغلوب ہوتے تو اپنے خون سے ضمیروں کو بیدار کرتے جیسا کہ خون حسینؑ نے اثر دکھایا بھی ہے ،آج بھی امت خون حسینؑ سے بیدار اور زندہ ہے۔

روش جہاد :

حضرت امام حسینؑ نے جہاد اور مقابلہ کی روش کیوں اپنائی اور ثقافتی راہ کیوں نہ اپنا ئی ؟ امام اگر اپنی زبان، قلم اور اپنی علمی سیرت سے دینداری کا درس دیتے ،لوگوں کو اسلامی معارف واحکام سے آگاہ کرتے تو یہی شاگرد اسلامی کلچر کی بقا کے محافظ اور جاہلی افکار کے لئے مانع ہوتے جیسا کہ حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے مکتب تشیع کو مذہب جعفری کے عنوان سے یادگار بنایا ہے؟! حضوروالا ! یہ ثقافتی راہ ضرر و موثر تھی مگر عملی میدان میں کارگر نہیں تھی اس لئے کہ اموی حاکم اس کی اجازت نہ دیتے ،مدینہ میں امام حسینؑ کو انھوں نے نظر بند رکھا تھا ،لوگ دور تھے انھیں آپ کی پوری معرفت نہ تھی تنہا مدینہ والوں کی اصلاح ہوسکتی تھی، دوسرے یہ راہ تمام پہلوؤں سے معاشرہ کی اصلاح کی ضامن نہ تھی کیونکہ ثقافتی امور دیر میں اثر انداز ہوتے ہیں جبکہ حسینؑ کومعاشرہ کی اصلاح کے لئے تندرفتار روش کی ضرورت تھی، دیسی دوائی کے بجائے انگریزی دوا اور ٹیبلٹ کے بجائے انجکشن کی ضرورت تھی ،اس لئے کہ امام اسلام کو شدید خطرہ میں دیکھ رہے تھے لہٰذا آپ نے راہ جہاد کو اختیار فرمایا کیونکہ جب معاشرہ میں فساد بڑھ جاتا ہے اور ضمیر مردگی عروج پر پہونچ جاتی ہے تو پھر مصلحان قوم اور ہادیان امت راہ مبارزہ اختیار کرتے ہیں، لوگ جب دیکھتے ہیں کہ صلح کرنے والے اپنی جان ومال کی اور بیوی بچوں کی قربانیاں دینے کیلئے تیار ہوگئے ہیں تو وہ اپنے اندر احساس شرم کرتے ہیں کیونکہ حق پر بہنے والا مجاہدوں کا خون معاشرہ میں ہلچل مچاتا ہے ،نور افشانی کا بم پھٹتا ہے ،صدیوں تک تاریخ بشریت کو اپنے اثرات کے کنٹرول میں رکھتا ہے ،امام حسینؑ کو یہی صورت درپیش تھی جس طرح رسولؐ نے راہ جہاد ومبارزہ کواپنایا تھا، امام نے بھی راہ جہاد ومبارزہ کواپنا یا، رسولؐ نے معجزہ کی طاقت سے بھی کام لیا تھا مگر امام کے پاس اپنے دعوی کوسچا ثابت کرنے کیلئے یہ طاقت اس پیمانے پر نہ تھی۔

فلسفۂ قیام:

جناب محمد بن حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئے اپنے قیام کا مقصدامام نے یہ بیان کیا: ''میں نے ہوا وہوس اور بدمستی کیلئے قیام نہیں کیا، میرا مقصد فساد اور ظلم وستم نہیں ہے بلکہ میں نے اپنے جد کی امت کی اصلاح، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیلئے قیام کیاہے، میں اپنے جد کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہوں'' ۱۲؎ یہ وصیت حسینی انقلاب و قیام کو سمجھنے کیلئے بہترین سند ہے، کیسی اور کونسی اصلاح چاہتے ہیں؟ امام خود بیان کرتے ہیں: ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ انحراف ومفاسد کو ختم کرنا، اسلامی کمالات ومعنوی فضائل کو زندہ کرنا ہی میرا ہدف ونشانہ ہے، میں اپنے قیام کے ذریعہ اپنے جد رسول اللہ □ کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں، میرا قیام رسول اکرم □ کی بعثت کے مترادف ہے، جیسے میرے جد رسول □ نے جاہلیت کی پر پیچ فضا میں قیام کیا تھا اور تمام جاہلی آداب ورسوم کو ختم کرکے نور اسلام کی شمع جلا دی تھی، ایسے ہی میں بھی اپنے زمانے کی نئی جاہلیت سے جودینی رنگ اور لعاب چڑھائے ہے، مبارزہ کرنا چاہتا ہوں''۔ یہ ایسی توفیق الٰہی ہے جو رسول □ کے بعد تنہا حسینؑ کو نصیب ہوئی ہے، حضرت علیؑ وامام حسنؑ بھی اپنے زمانے کی جاہلی ثقافت کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں لیکن حسینؑ نے اسلام کو زندہ اور جاہلیت کو مات دینے کی توفیق الٰہی پالی ہے، اسی لئے فرماتے ہیں: ''میری سیرت رسول □ کی سیرت کے مشابہ ہے، میرا عمل رسول □ کی بعثت کے مترادف ہے، میرا قیام ایک نئی اور دوسری بعثت ہے''۔ اس وصیت میں امام نے اپنے قیام کے چار سبب ذکر کئے ہیں: (۱) اصلاح امور امت (۲) امر بالمعروف (۳) نہی عن المنکر (۴) اپنے جد کی سیرت کی پیروی وترویج۔ انہیں چار مقاصد کو حسینی انقلاب کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے اور یہی وہ چارعناصر اربعہ ہیں جو اسلام کی بقا کی ضمانت ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حسینؑ نے مختلف جگہوں پر اپنے قیام کے فلسفے اوراہداف بیان کئے ہیں۔ آپ نے سپاہ حر سے فرمایا: ''دیکھ نہیں رہے ہو! حق پر عمل نہیں ہورہا ہے، منکرات سے نہیں روکا جار ہا ہے ایسی صورت میں ایک مومن کو مرنے کی تمنا کرنی چاہیئے۔'' ۱۳؎ کربلا میں دشمنوں پر حملہ کرتے وقت اپنے اشعار میں فرمایا: ''میں حسینؑ بن علیؑ ہوں، میں تمہارے سامنے نہیں جھکوں گا، میں اپنے خاندان کی حمایت کروں گا اور اپنے جد رسول خدا □ کے دین ومشن کو آگے بڑھاتا رہوں گا۔'' ۱۴؎ الغرض حضرت امام حسینؑ نے روش جہاد کو اپنایااور راہ ثقافت کو چھوڑ دیا، بات معقول ہے لیکن امام نے روش شہادت کو کیوں اختیار کیا، تشکیل حکومت اور غلبہ

پانے کی روش کو کیوں نظر انداز کیا؟ قیام امام کی دو صورتیں ممکن تھیں، روش حکومت اور روش شہادت۔

روش حکومت:

امام حسینؑ اگر امویوں پر غالب آتے ،حکومت تشکیل دیتے تو آپ کامیاب تھے کیونکہ پورا عالم اسلام بنی امیہ سے تنگ آچکا تھا ،کوفی آپ کی حمایت وپشت پناہی پر کھڑے ہوتے ،لوگ اپنے حاکموں کے دین پر چلتے ہیں لہٰذا وہ آپ کے تابع ہوتے تو آپ اسلام کو زندہ اور امت کی اصلاح کر سکتے تھے ،پھر کیوں آپ نے اس راہ سے گریز کر کے روش شہادت کو اپنا یا ہے ؟ اگر حسینؑ حکومت تشکیل دیتے تو مصدر قدرت قرار پاتے ،بجا اور نابجا طوفانوں کا سامنا کرتے ،لوگوں کی تمام توقعات پر پورا نہ اترتے اوراگر خدانخواستہ راہ ظلم اختیار کرتے تو یزید اور حسینؑ میں کوئی فرق نہ رہتا،نتیجہ میں حسینؑ کو ایک گروہ کی توقعات کا منفی جواب دینا پڑتا اور وہ گروہ آپ سے دور ہوجاتا ،آپ کی نصیحتیں بھی کارگر نہ ہوتیں جیسے حضرت علیؑ کے نصائح طلحہ وزبیر کے سامنے فیل تھے،اس لئے آپ نے اس راہ سے گریز کر کے راہ شہادت کواپنایا تھا ،آپ اپنے بابا علیؑ اور بھائی حسنؑ کی حکومت سے تلخ تجربہ حاصل کر چکے تھے ،کہاں ہیں وہ لوگ جو حسینؑ کی جنگ کو دوشہزادوں کی جنگ سے تعبیر کرتے ہیں ؟

روش شہادت:

حضرت امام حسینؑ نے اپنے عظیم الٰہی مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے شہادت کی راہ وروش اپنائی،آپ اگر ظاہراً ناکام ہوتے تب بھی معاشرہ کی اصلاح کرنے میں کامیاب تھے ،آپ کا خون رنگ لاتا کیونکہ آپ کی شہادت ایثار وقربانی اور ازخود گذشتگی میں بالکل ڈوبی ہوتی ،کسی کیلئے دلگیری کا جلوہ نہ رکھتی،سیاہ اور پتھر دل انسانوں کو بھی پگھلاتی، جتنا خون محترم ہوگا جتنا درجۂ کمال پر پہنچا ہوگا اتنا ہی زیادہ رنگ لائے گا ،اس کی نورانیت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے گا اورخون کا پیغام دینے والے بھی محترم ،پاکیزہ ،بافضیلت اور زیادہ مظلوم ہوں تو وہ خون اور قیام قیامت تک باطل کو ضرور شکست دیتا رہے گا۔

خون حضرت امام حسینؑ :

حسین مظلوم کا خون بہت محترم تھا ،حسینؑ ثاراللہ تھے ،خون حسینؑ کسی سے قابل مقائسہ نہ تھا۔ امام انتہائی حدوں تک درجہ کمال پر فائز تھے ،پورے عالم اسلام میں سب سے افضل تھے، عبداللہ بن عمر نے جب امام کو روکنا چاہا تو فرمایا: ''آپ فرزند رسول ؐ ہیں ،آپ رسول خداؐ کے پارۂ جگر ہیں۔'' واقعاً حسینؑ نور خدااور حجت خدا تھے ،مومنوں کے دلوں میں آپ کے نام کے دیئے جلتے تھے ، آپ کی ذات حق وباطل میں تمیز کا معیارتھی ،لوگ آپ کو ابن رسول اللہ ؐ،ابن بنت رسول اللہ کہہ کر پکارتے تھے ،امام جوانان جنت کے سردار تھے ،امام حسنؑ اورامام حسینؑ کے چاہنے والوں کے بارے میں رسول ؐ نے جنت کی بشارت دی تھی۔اصحاب نے رسولؐ کوحسینؑ کے گلے اور پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا تھا ،اصحاب نے اپنے بچوں کیلئے رسول اکرم ؐکی حسینؑ سے مہرو محبت کی داستانیں نقل کی تھیں ،دربار ابن زیاد میں جب زید بن ارقم نے دیکھا۔ ابن زیادامام کے دانتوں پر چھڑی مار رہا ہےتوان سے برداشت نہ ہوافوراً ابن زیاد کو ٹوک دیا'' چھڑی حسینؑ کے دانتوں سے ہٹاؤ،میں نے رسولؐ کو ان ہی دانتوں پر پیار کرتے دیکھا ہے''۔۱۵؎ فرزدق شاعر نے حسینؑ سے راہ کربلا میں کہا: لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔'' پس اگر حسینؑ شہید ہوجاتے تو جو دل خوف وہراس یا جہل ونادانی کے سبب آج آپ کی حمایت سے گر یز کرتے تھے ،وہ شہادت کے دوسرے دن ضرور بیدار ہوجاتے کہ کس منجدھار میں جا پھنسے ہیں ،کیوں انھوں نے حسینؑ کی حمایت نہیں کی ہے ؟ دربار ابن زیاد میں اسراء کربلا کے چند جملوں نے انقلاب برپا کردیا تھاحتی وہ یزیدی بھی رو رہے تھے جن کے ہاتھ کہنیوں تک خون حسینؑ سے رنگین تھے۔قیام توابین کے دوران جو شیعہ خوف وہراس یا جیل میں پڑے رہنے کی وجہ سے حسینؑ کی حمایت نہ کرسکے تھے ، آج وہی امام کے قاتلوں سے قصاص لینے کی خاطر جنگ کر رہے تھے انھیں کامیابی کی امید بالکل نہیں تھی۔شہادت حسینؑ کی محبت میں دشمن کی کاٹتی چمکتی تلوار کے سامنے جاگرتے تھے اور اپنی جان تیغ جفا کے سپرد کردیتے تھے بلکہ آج بھی حسینؑ کے چاہنے والے امام کی محبت میں ظلم کے خلاف سر کٹانے سے نہیں چوکتے ہیں۔ یہ حسینؑ کے مقدس ومحترم اور بافضیلت خون ہی کا اثر ہے۔

حسین مظلوم نے راہ شہادت کیوں اختیار کی؟

راہ شہادت اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ تمام قرائن وشواہد یہ بتارہے تھے کہ حسینؑ کو

شہادت نصیب ہوگی اور آپ کا قیام خون سے رنگین ہوگا۔ پورے عالم اسلام پر امویوں کی دہشت طاری تھی،معاشرہ کی روح پر جاہلی کلچر غالب تھا لہٰذا تشکیل حکومت اور ظاہری کامیابی کے امکانات ناپید تھے۔امام حسینؑ مکہ میں چار ماہ ٹھہرے ،پورا جہان اسلام متوجہ ہوگیا تھا کہ حسینؑ ان کی حمایت کے منتظر ہیں۔بے وفا کوفہ سے ایک آواز آئی ،آپ نے مسلم بن عقیل کو بھیج دیا اور خود بھی روانہ ہوئے کیونکہ اب امام کے لئے مکہ میں رہنا دو بھر ہوگیا تھا۔ امام حسینؑ بیداری کی لہر ایجاد کئے بغیر خاموشی سے قتل ہونا او رخانہ کعبہ کی حرمت زائل کرنا نہیں چاہتے تھے ،عراق جانے سے روکنے پر مختلف لوگوں کو آپ نے مختلف جواب دیئے ہیں:''اس کام میں خدا سے طلب خیر چاہوں گا ،قضاء الٰہی کو کوئی ٹال نہیں سکتا ہے، جو خدا پسند کرتا ہے ،اس کا حکم دیتا ہے، خدا سے طلب خیر چاہوں گا اور حالات دیکھوں گا۔'' ۱۶؎ اس طرح کے جوابات عراقیوں کی وفا پر بحث کرنے سے گریز تھا اور امام کوان کی وفا پر اعتماد نہ تھا۔

حضرت کے قیام کا ایک مقصد ناصح دوستوں پر اعتراض بھی تھا کہ دین کو خطرہ میں دیکھ کر کیوں قیام نہیں کرتے ہیں ،کیوں دنیا کی عافیت میں دین چاہتے ہیں ،نصرت اسلام خون چاہتی ہے تو بھاگتے کیوں ہیں؟ امام یہ شکوہ مدینہ سے مکہ اورمکہ سے کربلا تک دل میں نہاں رکھے رہے ،کربلا پہنچے تو اپنا عقدۂ دل بیان کیا :''لوگ دنیا کے غلام ہیں،ان کی زبانوں پر دین بچے ہوئے لقمہ کی مانند ہے، جب تک ان کی معیشت رونق پکڑتی ہے، دیندار بنے رہتے ہیں اور جب آزمائے جاتے ہیں تو حقیقی دیندار کم ہوجاتے ہیں''۔ ۱۷؎ کوفیوں کی بے وفائی اور جناب مسلم کی شہادت کی خبر سے حکومت پانے کا احتمال دم توڑ گیا تھا بلکہ آغاز قیام ہی سے ختم تھا اور شہادت کا احتمال جلوہ گر تھا، اسی میں حسینؑ کامیابی اور امت کی اصلاح دیکھ رہے تھے جو روکنے والوں کونظر نہ آتا تھا۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب حضرت امام حسینؑ روانہ ہوئے تو بنی ہاشم کے نام یہ خط لکھا:

''جو میرا ساتھ دے گا وہ شہید کیا جائے گا اور جو مجھ سے کترائے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا'' ۱۸؎ روایت کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ امام شہادت کو اپنی کامیابی کا راز سمجھتے تھے مگر ایسا بھی نہیں ہے امام حسینؑ نے حکومت کیلئے ہاتھ پیر نہ چلائے ہوں بلکہ جہاں ذرا بھی اس کی رمق ملتی فوراًادھر ہی کا رُخ کرتے لہٰذا کوفیوں کو مثبت جواب دیا اور بصرہ والوں سے مدد طلب کی ،امام حسین

ؑ کی رفتار وگفتار سے شہادت کی بومشام کو پہنچتی، جنگ پر جاتے وقت کبھی حضرت رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ نے وصیت نامہ نہیں لکھا تھا مگر حسینؑ نے لکھا، جب محمد بن حنفیہ نے حسینؑ کی بات کاٹ کر رونا شروع کر دیا، حسینؑ بھی رونے لگے اور محمد بن حنفیہ کے تصور کی تائید فرمادی۔ ابن عباس وقت رخصت ڈھاڑے مار کر رونے لگے تو امام بھی گلے لگ کر بہت دیر تک روئے۔ ۱۹؎ امام کی نانی ام سلمیٰ نے عراق جانے سے روکا تو فرمایا: '' خدا کی قسم! جیسانانا رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے میں ویسے ہی قتل کیا جاؤں گا، عراق بھی نہ جاؤں تب بھی مجھے قتل کر دیا جائے گا''۔ ۲۰؎ مکہ میں عراق جانے سے قبل فرمایا: ''اولاد آدم کے گلے میں موت ایسے پڑی ہے جیسے جوان دوشیزہ کے گلے میں کوئی ہار ہو، میں اپنے آباء واجداد کا اسی طرح مشتاق ہوں جس طرح جناب یعقوب یوسف کے مشتاق تھے، میرے لئے جگہ معین ہے، میرے پیکر کو وہاں پہنچنا ضروری ہے، کربلا میں بیابانی بھیڑیئے میرے جسم کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں اور اپنے خالی پیٹ بھر رہے ہیں، جب قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے اس کے بعد کوئی چارہ کار نہیں ہے۔'' ۲۱؎ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی اور اپنے دوستوں کی شہادت کو تنہا امت کی اصلاح اور احیاء دین کیلئے چنا تھا اس کیلئے اگر مطالبہ بیعت بھی نہ ہوتا تب بھی آپ قیام فرماتے۔

مکتب اہل بیت کی خصوصیت:

درحقیقت مکتب اہلبیت میں بیوی بچوں کو میدان میں لانے کا تجربہ کم تھا اور بنی ہاشم کی غیرت اس کی اجازت ہی نہ دیتی تھی لیکن امام کے مکتب فکر میں یہ ضروری تھا اس لئے کہ زمانہ اس موڑ پر پہنچ چکا تھا جس میں نبی مکرمؐ کی اصلاح کے ہتھیار بھی فیل تھے۔ حسینؑ کے زمانے کی جہالت ودین سے دوری اصلاح کے لئے نئی روش اور نئے ہتھیار مانگ رہی تھی، بیوی بچوں کو ساتھ لانا اتفاقی امر بھی نہ تھا اس لئے کہ ابن عباس اور محمد بن حنفیہ کو آپ نے جواب دیا تھا کہ خواب میں رسولؐ نے مجھے حکم دیا ہے: ''اے حسینؑ اٹھو اور قیام کرو، خدا تم کو مقتول اور تمہارے بیوی بچوں کو اسیر دیکھنا چاہتا ہے۔'' اسیران کربلا کا ہر فرد، واقعات عاشورا کا عینی شاہد تھا۔ اگر یہ لوگ کربلا میں نہ ہوتے تو معلوم نہیں کہ اب تک تاریخ کربلا تحریف ہوگئی ہوتی یا نہیں؟ کوفہ وشام کے بازاروں میں سیدامام سجادؑ اور جناب زینبؑ کے آتش فشاں خطبوں نے حالات کا دھارا امام حسینؑ کے حق میں موڑ دیا، ضمیروں کو بیداراور جھنجھوڑ ڈالا، قیدیوں کے چند جملوں نے ہی کوفیوں کے دل ہلا ڈالے، جن کو فیوں

کے ہاتھ کہنیوں تک خون امام سے رنگین تھے ،وہ آج چند روز کے بعد ندامت کے آنسو بہار ہے تھے،شام میں دربار یزید کو اپنی تقریروں سے ہلا ڈالا، لوگوں کو یزید کے خلاف ابھارا ، بنی امیہ کو اپنا تخت وتاج گرتا نظر آیا فوراً اظہار ندامت کرنے لگے اور مختلف تاویلوں کا سہارا لینے لگے ، یہ سب حسینؑ کے بچوں اور خواتین کربلا کا کارنامہ ہے، جہاں کسی بری ذہنیت کو کچلنا ہوتا ہے ،وہاں عورتوں بچوں کو لایا جاتا ہے ،حسینؑ یزید کو شکست نہیں دینا چاہتے تھے، یزیدیت کو شکست دینا چاہتے تھے ، سلطنت یزید کا تختہ نہیں الٹنا تھا ، یزیدی ذہنیت کو قیامت کے لئے کچل دینا چاہتے تھے۔

مقصد کی کامیابی:

امام اپنے مقصد میں کامیاب ہیں،آپ نے جو دعویٰ کیا تھا کہ ''میرا مقصد اپنے جد کی امت کی اصلاح کرنا ہے۔'' کیاامامؑ اس میں کامیاب ہوئے یا امامؑ کی قربانیاں اکارت گئیں ؟ حضرت امام حسینؑ کے کامیاب ہونے کی دلیلیں تو بہت ہیں ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ اب کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہے اور نہ قیامت تک ہوگی جو بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھا سکے اور اگر کوئی سر پھرا پڑھائے گا تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی، پورا عالم اسلام اسکے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا ۔

حوالے:

۱۔ امام حسینؑ وجاہلیت نو ،جواد سلیمانی

۲۔ تاریخ طبری ،اردو ج/۴ ص/۱۶۵ باب ۸

۳۔ تاریخ طبری ج/۴ ص/۱۳۵ باب ۱۵ اردو ترجمہ

۴۔ الامامۃ والسیاسۃ ،ابن قتیبہ دینوری ج/۱ ص/۱۸۰ منقول از سیرہ پیشوایان ص/۱۵۶

۵۔ مروج الذہب ،مسعودی ج/۳ ص/۳۱ منقول از سیرہ پیشوایان مہدی پیشوائی ص/۱۸۵

۶۔ نہج البلاغہ/خطبہ/۲۰۰

۷۔ سمّو المعنی فی سمو الذات ،علائلی ص/۹۷ منقول از امام حسینؑ وجاہلیت نو ،جواد سلیمانی ص/۱۶۹

۸۔ سیرہ پیشوایان ص/۱۸۰ بنقل تمۃ المنتہیٰ فی وقائع ایام الخلفاء ،شیخ عباس قمی ص/۴۳

۹۔ بلاغات النس آء ،ابن طیفور ص/۲۰ منقول از سیرہ پیشوایان ص/۲۰۱

۱۰۔ تاریخ طبری ،اردو ،ج ۴ ص/۱۳۵ باب ۵

۱۱۔ امام حسینؑ وجاہلیت نو ص/۹ ۱۶ بنقل ابن عثم ،الفتوح ج/۵ ص/۱۷ ومقتل خوارزمی ج/۱ ص/ ۱۸۴

وابن طاؤس ،لہوف ص/ ۹۹
۱۲۔بحار الانوار ج/ ۴۴ ص/ ۳۲۹وامام حسینؑ وجاہلیت نو ص/۱۶۱بنقل مقتل خوارزمی ج/۱ ص/ ۱۸۸
والفتوح ج/ ۵ ص/ ۱۱
۱۳۔ طبری ،اردو ج/ ۴ ص/ ۲۳۰ باب ۱۱
۱۴۔تاریخ طبری ،اردو ج/ ۴ ص/ ۲۸۲ باب ۱۱
۱۵۔ ارشاد شیخ مفید ج/ ۲ ص/ ۶۷
۱۶۔ الاخبار الطوال ص/ ۲۲۹ وص/ ۲۹۴ ازص/ ۲۰۰
۱۷۔ مقتل خوازمی ص/ ۲۳۷ ج/ ۱ وتحف العقول ص/ ۲۴۵ ازص/ ۲۰۱
۱۸۔ لہوف ،سید بن طاؤس ،باترجمہ فارسی ص/ ۸۴ وبحارالانوار ج/ ۴۴ ص/ ۳۳۰
۱۹۔ الفتوح ،ابن اعثم ج/ ۵ ص/ ۲۶ ومقتل خوارزمی ج/ ۱ ص/ ۱۹۳ ازص/ ۲۰۶
۲۰۔ بحار ج/ ۴۵ ص/ ۸۹ حدیث ۲۷
۲۱۔ لہوف ص ۱۲۶ وبحارالانوار ج/ ۴۴ ص/ ۳۶۶ ازص/ ۲۰۷

کربلا اور اخلاقی اقدار

ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی

انسان ایک طرح کا اطمینان اور سکون اس وقت محسوس کرتا ہے جب معمولی حالات میں زندگی کا دریا سکون کے ساتھ رواں دواں ہو۔ کیونکہ اوپر کی صاف وشفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں تہہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں مخفی رہتی ہیں اور پردے کے اوپر کی صفائی سے آدمی اس بات کا احساس نہیں کر پاتا ،کہ تہہ میں کیا چھپا ہوا ہے اور کیوں چھپا ہوا ہے مگر جب اس دریا میں طوفان آتا ہے اور نیچے کی چھپی ہوئی ساری گندگیاں ابھر کر برسرِ عام سطح دریا پر پہنچنے لگتی ہیں

تو اس وقت نابینا کے سوا ہر وہ شخص جس کی بینائی کا نور باقی ہو بدون اشتباہ صاف صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا کیا کیا اپنے اندر لئے چل رہا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جب عام انسانوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوسکتا ہے کہ اس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے دریائے زندگی میں یہ گندگیاں آرہی ہیں اور اس تدبیر کی جستجو کریں جس سے اس دریا کو پاک کیا جاسکے فی الواقع اگر ایسے وقت میں بھی لوگوں کے اندر اس ضرورت کا احساس بیدار نہ ہوتو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی اپنی غفلت کے نشہ میں مدہوش ہوکر سود وزیاں سے بالکل بے خبر ہوچکی ہے۔

واقعہ کربلا ایسے ہی حالات میں رونما ہوا کہ جب اسلامی معاشرہ کشمکش حالات میں مبتلا تھا۔ اور لوگ اصلاح معاشرہ کی فکر کو ترک کرکے مایوس ہو چکے تھے۔ ایسے پُرآشوب ماحول میں حسینؑ نے اخلاق کی تلوار سے ہواوہوس کے لشکر پر عقل کا غلبہ دلانے کا پیغام دیا۔ حسینؑ نے ذلت کی زندگی بسر کرنے والوں کو ''اَلمَوت فِی عِزٍ خَیر مِن حَیاۃٍ'' کے ذریعہ سے ایک انقلابی ونورانی راہ کی ہدایت فرمائی۔ معاشرے کی اصلاح کا مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ امامؑ نے اپنے قیام کا ایک سبب معاشرے کی اصلاح کو بیان کیا ہے۔ ''اِنّی لَم اَخرُج اَشِراً وَ لَا بَطِراً وَ لَا مُفسِداً وَ لَا ظالِماً وَ اِنَّما خَرَجتُ لِطَلَبِ الاِصلَاحِ فِی اُمَّۃِ جَدّی مُحمد اُرِیدُ اَن اٰمُرَ بِالمَعرُوفِ وَ اَنھی عَنِ المُنکَرِ وَ اسیرُ بِسِیرَۃِ جَدّی وَ اَبی عَلی ابنِ اَبی طالب علیہ السلام'' ۱

امامؑ نے اپنے اس پیغام کے ذریعہ واضح کردیا کہ جہاں کہیں بھی ظلم کو دیکھو کھڑے ہوجاؤ۔ رہبران قوم کا عملی فریضہ ہے کہ اگر معاشرے میں اخلاق کے حوالے سے تنزلی، فساد، ظلم، غیر اسلامی رسومات وافکار رائج ہوتے دیکھیں تو معاشرے کی حالت کو بدلنے کے لئے آمادہ ہوجائیں۔ اسی اہم کام کے لئے امام حسینؑ اپنے احباب وعزاء واقربا اور خود کو اپنے صبرو استقامت ، ایثار وفداکاری ، ظلم ستیزی، امتحان خداوندی ، عدم فراموشی خدا، عدل وانصاف ، وغیرہ کے ذریعے سے راہ خدا میں نثار کردیا، تاکہ اسلامی معاشرہ برائیوں سے پاک ہوجائے اور اخلاقی قدریں برقرار رہیں۔

امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کرکے قرآنی حریت وحق نوازی کا دیباچہ قائم کردیا۔ خدا کے اولی العزم بندے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ ابن الوقت نہیں ہوتے بلکہ ابو الوقت ہوتے ہیں۔ وہ زمانے کے رُخ پر نہیں چلتے بلکہ زمانے کو اپنے رخ پر چلاتے ہیں۔ دریا کے بہاؤ میں نہیں بہتے بلکہ دریا کو اپنے رخ پر بہنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ وقت آگیا تھا کہ قرآن کا ایک

''عصر نو'' آشکار ہو اس کے لئے امام حسینؑ کا بیعت یزید سے انکار ضروری تھا۔ ایک مسلمان کا جینا اگر خدا کی مرضی کے مطابق نہیں ہے تو وہ قرآن کی نگاہ میں موت ہے اور اگر احکامات خداوندی کی تکمیل میں موت آئی ہے تو وہی زندگی ہے۔ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے اگر ہو نہ تلاش اقدار زندگی کیا ہے عمل ذات کا اثبات اظہار
زندگی کیا ہے فنا اور عدم کا انکار زندگی کیا ہے بقائے ابدی کا اقرار
موت ہے معنیٔ اقدار سے عاری ہونا
موت ہے موت کے انکار سے عاری ہونا ۲؎

حضرت امام حسینؑ کا طرۂ امتیاز بھی یہی قرآنی فلسفۂ موت وحیات تھا کہ جس نے آپ کو لازوال شخصیت کا مالک بنادیا۔ اگر آپ کی زندگی کا نصب العین اعلیٰ وارفع نہ ہوتا تو دنیا کے لئے حق وصداقت اور بر وقت قربانی کا جذبہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سوجاتا اور آج مردہ دلوں کے لئے پیام زندگی ثابت ہونے کے لئے ایسی کوئی چیز باقی نہ رہ جاتی ۔یقینا امام حسینؑ کی قربانی ہر دور کے لئے مشعل راہ ہے۔

آج اس عہد حاضر میں کربلا کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ غبار چھنٹ جائے اور آفتاب حقیقت زیادہ روشنی کے ساتھ طلوع ہو۔اس لیے میں نے فرصت کا انتظار چھوڑ کر اپنے اس قلیل وقت میں پیش نظر مقالہ کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ کربلا کیا ہے اور دوسرا حصہ اخلاقی اقدار۔

کربلا کیا ہے؟

ڈوب کر پار اتر گیا اسلام
آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے (یاس ویگانہ)

کربلا ایک ایسی درس گاہ ہے کہ جس میں آدمؑ کا علم ،نوحؑ کا تقویٰ ،موسیٰؑ کی ہیبت ،عیسیٰؑ کا زہد، ابراہیمؑ کی خلت ، یوسفؑ کا حسن اور ایوبؑ کا صبر موجود ہے ۔کربلا اخلاق محمدی کا دبستان عملی ہے جہاں حضوؐر اکرم کے چھوٹے نواسے نے حق اور صبر کی وصیت ۳؎ کے قرآنی فلسفہ کو عمل کی اس معراج پر پہونچایا کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کو یہ کہنا پڑا کہ ؎

رمز قرآن از حسینؑ آموختیم ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
درمیان امت آن کیوان جناب ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب
زندہ حق از قوت شبیریؑ است باطل آخر داغ حسرت میری است ۴؎

پروفیسر سلیم چشتی تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں نے ایک دفعہ حضرت اقبال سے یہ دریافت کیا کہ ''رمز قرآن'' سے آپ کی کیا مراد ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ تعلیمات قرآن کی روح، یہ ہے کہ باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت سر بکف رہو اور اگر ضرورت ہوتو جان دینے سے بھی دریغ مت کرو۔'' ۵؎

یہی وجہ ہے کہ علاّمہ اقبالؔ کو بلا جھجھک کہنا پڑا کہ:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

۶؎

یہی انداز کربلا کے شہید کا تھا کہ جس نے ہر طرح کی سختی اور مصیبت کو برداشت کیا۔ ہر ظلم پر صبر فرمایا اور اخلاق کی تعلیم اور کار ہدایت کو جاری رکھا۔ وعظ وارشاد کے ذریعہ دعوت حق کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی بلکہ یزیدی فوج کا ایک سردار حر ابن یزید ریاحی حضرت امام حسینؑ کے اخلاق کریمانہ اور دعوت حق سے متاثر ہوکر امام حسینؑ سے آملا اور حضرت کی جانثاری میں عظمت شہادت سے بہریاب ہوا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کربلا کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''حق کوشی کی راہوں کی حنا بندی شہیدوں کے خون سے ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں بالخصوص، انسانیت کی تاریخ میں بالعموم، کوئی قربانی اتنی عظیم، اتنی ارفع، اور اتنی مکمل نہیں ہے جتنی حسین ابن علیؑ کی شہادت، جو کارزار کرب وبلا میں واقع ہوئی۔ پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰؐ کے نواسے اور سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ کے جگر کے گوشے حسینؑ کے گلے پر جس وقت چھری پھیری گئی اور کربلا کی سرزمین ان کے خون سے لہولہان ہوئی تو درحقیقت وہ خون ریت پر نہیں گرا بلکہ سنت رسولؐ اور دین ابراہیمیؑ کی بنیادوں

کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سینچ گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خون ایک ایسے نور میں تبدیل ہوگیا جسے نہ کوئی تلوار کاٹ سکتی ہے نہ نیزہ چھید سکتا ہے۔ اور نہ زمانہ مٹا سکتا ہے۔اس نے مذہب اسلام کو جس کی حیثیت اس نو خیز پودے کی سی تھی استحکام بخشا اور وقت کی آندھیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا'' ۷۔

یقیناً حسینؑ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یزید کی بد اعمالیوں اور کج اخلاقیوں کی تائید کرکے اس محنت کو ضائع کردیں ، جواُن کے نانا نے اسلام کی راہ میں صرف کی تھیں۔ چنانچہ امام حسینؑ نے یہ طے کرلیا کہ وہ یزید کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے اس لئے کہ دین کا مضحکہ اڑانے والوں اورعظمت رسالت کا تمسخر کرنے والوں سے تعاون کرنا اخلاق کا نقص ہے اور ان کے مد مقابل صبر پر مستقل قیام کرنا اخلاق کا کمال ہے۔ کربلا عین اخلاق ہے اسلام کے اوامر ونواہی روح اخلاق ہیں۔ امام حسینؑ نے توحید کا درس دے کر نوع انسانی کو اخلاقی پستی سے بچایا ہے ۔ کمال اخلاق یہ ہے کہ انسان کی جبین نیاز صرف ایک ہی کی طاقت کے آگے جھکے ہر طاقت کے آگے خم نہ ہو۔ اس وسیع ترین اخلاقی تصوّر میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اس امتحان '' **وَلَنَبلُوَنّکم بِشَيءٍ مِنَ الخَوْفِ وَالجُوع وَنَقصٍ مِنَ الاَموَالِ** الخ'' ۸ ۔ میں کامیاب ہوسکے۔ جو ایک میدان زندگی سے متعلق ہے ۔اور پھر یہ امتحان کسی ایک حیثیت سے نہیں، کسی ایک شعبۂ حیات میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے۔ یہ اخلاق کے دائرے کو اتنا پھیلا دیتا ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل ، اس کی ذہنی وفکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات ، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں سب کے سب امتحان میں شریک ہیں یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ اس امتحان کی کامیابی کا راز اس وقت عیاں ہوا کہ جب ندای غیبی آئی '' **یَاایَّتُها النَفسُ المُطمَئِنَة الرجِعِی اِلیٰ رَبّکَ رَاضِیَةً مَّرضِیّة**۔۹ ۔

امتحاں کے نام سے ڈرتا ہے ہر فرد بشر
کربلا میں ڈر رہا تھا امتحاں شبیرؑ سے

اس کے علاوہ امتحان کی کامیابی کا اثر اس وقت معلوم ہوا کہ جب حسینؑ کا کٹا ہوا سر

نوک نیزہ پہ تلاوت کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کیفیت کو افتخار عارف نے کس انداز سے اپنے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، ملاحظہ کریں:

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
۱۰؎

تاریخ اسلام میں کربلا وہ منزل ہے جہاں ملت کی اصلاح وفلاح کے لئے حسینؑ نے حق کی قوتوں کو جمع کر کے منزل صبر سے باطل قوتوں کا مقابلہ کیا۔ اپنے انصار واقربا، اپنے بیٹے، بھانجے، اپنے بھائی بھتیجے اور اپنی ذات کو راہ حق میں قربان کردیا۔ حسینؑ بڑی سے بڑی مصیبت کو بخوشی سر کر لیتے ہیں۔ کسی طاقت سے نہیں ڈرتے، صرف اللہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ متّقی ہیں اور متقی کی شان عاقبت پر جا کر منتج ہوتی ہے ''وَالعَاقِبَةُ لِلمُتَّقِینَ'' یہی سبب ہے کہ نہایت بے پروائی اور سختی کے ساتھ یزید کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ سارے ظلم وستم برداشت کئے لیکن یہ نہ ہوسکا کہ یزید کی بیعت کی جائے۔ جہاد عزیمت اور شہادت اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ ایک ایسی جامع تصویر کو منتقل کرتے ہیں جو ''حقاً کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ'' کا مصداق ٹھہرتی ہے۔ ''لا الٰہ'' کہنا تو اس وقت صحیح ہوگا کہ جب عملاً بھی اسکا ثبوت موجود ہو۔ آخر عوام وخواص کے ''لا الٰہ الاّ اللہ'' میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ پھر جو خاصوں کے خاص ہوں ان کے '' لا الٰہ الاّ اللہ '' کا کیا کہنا حسینؑ کی شخصیت ہمارے سامنے ''لا الٰہ الاّ اللہ'' کی عملی تفسیر ہے ؎

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں ہے اس کی پنہ لا الٰہ ۱۱؎

حجۃ الاسلام سید علی نقوی رقم طراز ہیں:

'' جس وقت دنیا کی ذہنیت تبدیل ہوگئی اور اسلام کے خط وخال مٹ چکے تھے۔ جس وقت ذمہ دار اشخاص اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور کوئی اعتراض جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اگر رسولؐ کا فرزند اگر اسلام کا ایک ذمہ دار رہنما یعنی حسین ابن علیؑ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیتا تو دنیا میں پھر اسلام کی تصویر نہ دکھائی

دیتی۔ دنیا میں پھر احکام اسلام کے نام لیوا نہ دکھائی دیتے۔۔۔۔حسینؑ نے اپنی جان دے کر حقانیت کو ظاہر کیا ہے اور دنیا کو بتایا کہ سلطنت اور ہے ،اطاعت باری اور ہے۔ دنیا کچھ اور ہے دین کچھ اور ۔حق اور ہے باطل کچھ اور۔ دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹادئے۔اس طرح اسلام حسینؑ کی بدولت قائم رہا۔'' ۱۲؎

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ'' **اَلاِ یمانُ عَلیٰ اَربَع دَعائِم ! عَلی الصَّبر وَ الیَقینِ وَ العدَل وَ الجِھاد**'' ۱۳؎

یعنی ایمان چار ستون پر قائم ہے۔ امام حسینؑ نے مصائب پر شکر کرکے صبر کی آبرو بڑھائی۔ظن کو شکست دے کر یقین کی لاج رکھ لی، رضائے الٰہی کے لئے جہاد کا مرتبہ بڑھایا ،ظلم کو رسوا کرکے عدل کی منزلت میں اضافہ کیا اور اس طرح وہ اسلام کی جان بن گئے۔مولائے کائنات کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ'' **اَلاِ یمانُ اَربَعة اَرکَان الرِّضا بِقَضَائِ اللّٰہ وَ التَو کُّل عَلی اللّٰہ وَتَفویضُ الاَمرِ اِلَی اللّٰہ وَ التَّسلیِم لِاَ مرِ اللّٰہ**'' ۱۴؎ یعنی ایمان کے چار ارکان ہیں اللہ پر بھروسہ، اللہ کی طرف سپردگی، اللہ کے امر کے سامنے سرتسلیم کا خم ہونا، اور قضائے الٰہی کو بطیب وخاطر مان لینا۔ امام حسینؑ نے ایمان کی یہ چاروں منزلیں طے کیں۔ اللہ پر ایسا بھروسہ کیا کہ بس اللہ کے دین کے لئے گھر سے نکل پڑے۔ ۱۵؎ تنہا نہیں بلکہ گھر والوں ،عزیزوں ، دوستوں، ساتھیوں کو لیکر اللہ کی طرف ایسی سپردگی کہ دین کی خاطر دل کے ٹکڑوں کو قربان کردیا۔ اللہ کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کیا تو اس شان سے خم کیا کہ سجدے کی حالت میں جام شہادت نوش فرمایا اور قضائے الٰہی کو اس خندہ پیشانی سے مان لیا کہ ہاتھوں پہ لاشۂ بے شیر لیکر'' **رِضاً بِقَضَائِہ تَسلِیماً لِاَمرِہ**'' کے کلمے کو دل کی گہرائیوں سے ادا کیا۔ ؎

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو توچاہے (مجیدامجد) ۱۶؎

عجب نہیں کہ ایمان اس پر ناز کرے کہ حسینؑ کے دل میں اس نے جگہ پائی۔ امام حسینؑ نے ایمان کے اس درجہ کا اظہار اپنے عمل سے کیا کہ ان کے خطبے ان کے خطوط، ان کے فرامین، ان کے ارشادات اس کے گواہ ہیں۔

امام حسینؑ نے میدان کربلا میں جتنے خطبے دئے ہیں سب میں دین کی باتیں کی ہیں اپنے

دشمنوں سے اور خون کے پیاسوں سے پوچھا کہ بتلاؤ کہ کبھی میں نے کسی کا حق غصب کیا ہے۔ کبھی اپنے فریضے سے کوتاہی برتی ہے، کوئی عمل مجھ سے ایسا سرزد ہوا جو خلاف دین ہو، کلمۂ حق کے علاوہ کوئی اور کلمہ بھی کبھی میری زبان پر آیا ہے۔ ان سب کے جواب میں خون کے پیاسوں کی طرف سے یا تو فضیلتوں کا برملہ اقرار تھا یا وہ خاموشی تھی جو برملہ اقرار سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اور جس میں اپنی جگہ پر احساس جرم بھی ہوتا ہے۔

معاویہ نے امام حسینؑ کو بیعت یزید کے سلسلے میں ایک خط لکھا۔ اس خط کے لکھنے کا طریقہ دائرہ تہذیب سے خارج تھا۔ امام حسینؑ نے معاویہ کو جواب میں ایک طویل خط لکھا، خط کے آخر میں تحریر فرمایا:

> ''اے معاویہ! مجھے یقین ہے کہ تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو اور اپنے ہی عمل خیر کو ضائع کر رہے ہو۔ اے معاویہ میرے ساتھ جو مکاری کرنا چاہو کرلو لیکن خدا سے ڈرو اور یقین کرلو کہ خدا کے پاس ایک کتاب ہے جس میں ہر چھوٹی بڑی چیز لکھ لی جاتی ہے اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا صرف سوءظن پر مومنین کو قتل کر دینا، تہمت لگا کر مومنین کو گرفتار کر لینا اور اس لونڈے (یزید) کو امیر بنانا جو شراب پیتا ہے اور کتوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ تمہاری ان باتوں کو خدا نے فراموش نہیں فرمایا ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تم خود اپنے نفس کو ہلاک کر رہے ہو۔ اور اپنے دین اور حقوق اور رعیت کو تباہ و برباد کر رہے ہو''۱۷؎

کربلا ہمیں اس راہ کی طرف بلاتی ہے جو انسان کو خسارے سے بچاتی ہے اور حق و صبر کی وصیت کر کے نصب العین کے حصول میں رہنمائی کرتی ہے۔ امام حسینؑ نے میدان کربلا میں راہ خدا میں نذرانۂ جان پیش کر کے ملوکیت اور آمریت کے اندھیروں میں اپنے خون کے چراغ روشن کر کے ذریت ابراہیمیؑ کی محافظت کی علامت بن گئے۔

حصہ دوم : اخلاقی اقدار

یہ کہنا حق بجانب ہے کہ صَرف و نحو منطق و فلسفہ، فقہ و تفسیر، عقاید، طبیعات، کیمیا، ریاضی ادب، غرض تمام علوم کے خاص اصول ہیں جن پر توجہ کے بعد ہی ان علوم سے گہری شناسائی اور ان میں مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طرح سے اخلاقی اقدار کی شناخت اور اس سے صحیح صحیح استفادہ

کے لئے بھی کچھ اصول وقواعد سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے تب ہی انسان کسی نتیجہ تک رسائی حاصل کرسکتا ہے لہٰذا ذیل میں نکات کی صورت میں چند اصول پیش کیے جارہے ہیں جنہیں پیش نظر رکھ کر اخلاقی اقدار کا مفید وسودمند اور نتیجہ خیز مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اخلاق کے لغوی واصطلاحی معنی،

۲۔اخلاق شناسی کی ضرورت

۳۔اخلاق کی اہمیت وافادیت

اخلاق کے لغوی معنی

اخلاق خُلق کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں عادتیں، ملنساری، کشادہ پیشانی ۱۸۔ خلق یعنی نہادسرشت،خصلت، مزاج،طبیعت،مشرب،سیرت۔۱۹۔

اصطلاحی معنیٰ:

خلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی کی فطرت وطبیعت کااس طرح لازمی جزو بن جائیں کہ زیادہ غور وفکر کے بغیر روز مرّہ کی زندگی میں ان کا ظہور ہوتا ہو۔۲۰۔

استادمطہری تحریر کرتے ہیں۔

''بخش اخلاق یعنی مسائل ودستورہای کہ دربارہ چگو نہ بودن انسان از نظر صفات روحی وخصلت ہای معنوی است وازقبیل عدالت ،تقویٰ،شجاعت ،عفّت وغیرہ''۲۱۔

اخلاق شناسی کی ضرورت:

انبیاء اور اہل بیتؑ کے اخلاق شناسی کی ضرورت کے لئے مختلف وجوہ کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ فرزند رسولؐ کا اخلاق اور ان کی زندگی ہمارے لئے محض ایک مثالی طرز حیات ہی نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ایک حجت بالغہ ہے جس سے بے خبری وگریز ضلالت وگمراہی کا موجب ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ کو اپنی طول حیات میں ان تمام حالات سے سابقہ کرنا پڑا جو ایک انسان کو پیش آسکتے ہیں ۔یعنی اگر انسانی زندگی کے مسائل کی فہرست مرتب کی جائے تو اس

میں جو مسائل درج ہوں گے مثلاً جنگ، صلح، امن، تجارت، معاملات، معاہدات وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ ان تمام مسائل کا ہر امامؑ سے سابقہ رہا ہے لیکن چونکہ ہم تمام ائمہ معصومینؑ کو نور واحد سیرت واحد سمجھتے ہیں اس لئے ہم مجموعی طور پر تمام ائمہ کی سیرت واخلاق سے استفادہ کرتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں ائمہ کے اخلاق کا ثبوت اور یقین حاصل ہوجانے کے بعد اس پر عمل ان کی تاسّی وپیروی کہلاتا ہے۔ اخلاق ائمہ کی معرفت در اصل ان کی تاسّی کے سلسلے میں ایک قدم ہے جس کا ذکر آیات وروایات میں کبھی تمسک، کبھی حجت، کبھی اسوہ، کبھی خلق عظیم کے الفاظ میں ہوا ہے۔

اخلاق کی اہمیت وافادیت:

اسلام انسان کی اخلاقی نشوونما کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاشرے کے اجتماعی نظام میں فرد کو اختیاری حسن عمل کے لئے زیادہ مواقع حاصل رہیں تاکہ انسانی زندگی میں فیاضی، ہمدردی، احسان اور دوسرے اخلاقی فضائل روبعمل آسکیں۔ اسی بنا پر معاشی انصاف قائم کرنے کے لئے اسلام صرف قانون پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اس معاملے میں وہ سب سے بڑھ کر جس چیز کو اہمیت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ایمان، عبادات، تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذریعے سے انسان کی داخلی اصلاح کی جائے۔ اس کے ذوق کو بدلا جائے اور اس کے اندر ایک مضبوط اخلاقی حِس پیدا کی جائے جس سے وہ خود بخود انسانیت پر قائم رہے۔ جب ان ساری تدبیروں سے کام نہ چلے تو معاشرے میں اتنی جان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اجتماعی دباؤ سے آدمی کو حدود کا پابند رکھے۔ اس سے بھی جب کام نہ چلے تو اسلام قانون کی طاقت استعمال کرے تاکہ انصاف کا زور قائم کیا جاسکے۔ اخلاق خود انسان کے اندر سے پھوٹنا چاہئے تاکہ انسان کی فطری تمایلات کا جواب دے سکے وگرنہ فلسفیوں کے بنائے ہوئے اخلاقی دستور انسان کے ساختہ ہونے کی بنیاد پر انسان کی پوشیدہ حقیقت تک پہونچنے پر قادر نہیں اور انسانی سعادت کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اخلاق ایک ایسا سرمایہ ہے جس میں خدا شناسی، تزکیۂ نفس، ایمان، روحانی وپاکیزگی، عبادات اور فرض شناسی کے مراتب ہیں۔ صبروشکیبائی، ذلت وپستی سے اجتناب، تکبر وغرور سے اجتناب، اپنی ذات پر اعتماد، حق پر اعتماد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ، یہ سارے صفات موجود ہیں۔ رسولؐ فرماتے ہیں کہ ''اِلَا

خلَاقُ مَنائِحُ مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فَإذَا اَحَبَّ عَبداً مَنحه خُلقاً حَسناً وَاِذَا أَبغض عَبد اً مَنحه خُلقاً شَيئاً'' ۲۲۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ ''اَكرَمُ الاِخلاقُ السَخاءِ وَ اعتِماد نفعاً العدل '' ۲۳۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ '' مَايُقَدِّمُ المُومِنُ عَلى اللّٰهِ عَزَّوَ جَلَّ بِعَمَلٍ بَعدَ الفَرائِضِ اَحَبَّ اللّٰهِ اِلٰى اللّٰهِ تَعالىٰ من اَن يَسَعَ النَاسَ بِخُلقِه'' یعنی فرائض کے بعد خدا کے نزدیک کسی مومن کا کوئی عمل اس سے زیادہ محبوب نہیں کہ وہ اپنے حسن خلق سے لوگوں کو خوش کرے۔ ۲۴۔ رسولؐ فرماتے ہیں۔ صَاحِبُ الخُلقِ الحَسنِ لَه مِثل اَجر الصَائِمُ القائِم۔ یعنی اچھے اخلاق والے کا اجر پیش خدا وہی ہے جو ایک روزہ دار کا ہے۔(الشافی،ترجمہ اصول کافی ص ۳۵۴)

یہی وہ اخلاق ہیں جو اخلاق انسانی کی تعمیر کے لئے اسلام نے ہم کو دئے ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں ہے بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے اور سارے انسانوں کی فلاح اسی کے پیش نظر ہے۔ اس لئے ہر اس شخص کو جو اپنی اور اپنی انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہو اسے یہ سوچنا چاہئے کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لئے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں۔فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کربلا سے پہلے اخلاقی انحطاط:

حجۃ الاسلام سید علی نقی نقوی رقم طراز ہیں کہ:

'' دنیائے اسلام سے اسلام کی حقیقی صورت رخصت ہوچکی تھی۔ دنیا میں معصیت کی تاریکی تھی۔ اطاعت الٰہی ایک فراموش شدہ چیز بن چکی تھی۔ دنیا بادشاہوں کے راستوں پر چل رہی تھی بلکہ انکو نائب رسولؐ سمجھ رہی تھی۔ مذہبی تخت پر بیٹھنے والا ہر قسم کے فسق وفجور کا مرتکب ہورہا تھا یہاں تک کہ رشتہ داروں یعنی ماؤں اور بہنوں کو بھی نہ چھوڑتا تھا۔غسیل الملائکہ کے فرزند کی زبانی ہے کہ ہم نے اس وقت خروج کیا جب ہم کو خوف ہوگیا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ اِنَّه كَانَ رَجلاً يَنكِحُ الاَخوات وَ اُمَّهاتُ الاَولاَد'' ۲۵۔

یہ کہنا حق بجانب ہے کہ یزید اور یزید والوں کا اخلاقی قانون اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف تھا وہ در اصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ تھا۔ ایمان، صداقت عدل

وانصاف اور پاکیزگی اخلاق رخصت ہوچکی تھی۔ حرام خوری، حرص وطمع، شراب خوری، سنگبازی، ظلم وجفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا۔۲۶؎ اس کے حاکم ظالم، اس کے پیش کار ریاکار، اس کے سردار خائن اور اس کے عوام معصیت پیشہ ہوگئے تھے۔ شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم وشعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کردیا تھا جو ہر شریعت حقہ کے احکام میں مقصود اصلی ہوتی ہے۔ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا تھا۔ اسی بنا پر تمام قومیں بہت بڑے پیمانے پر ان بدترین صفات کا مظاہرہ کررہی تھیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کے ضمیر نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے انصافی، بے رحمی، ظلم وستم، جھوٹ، غیبت، مکر، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم محض انفرادی جرائم نہیں تھے بلکہ قومی اخلاقی پستی کی حیثیت سے ظاہر ہورہے تھے۔ وہ صفات جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں۔ مثلاً شجاعت، ایثار، قربانی، فیاضی، صبر وتحمل اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ کو بھی چند بڑی بنیادی اخلاقیات کا خادم بنا کر رکھ دیا تھا۔

کربلا اور اخلاقی اقدار

ہر مذہب نے اپنے پیروؤں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دی۔ اخلاق حسنہ کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ کسی خاص زمانے یا خاص قوم کے لیے نیکی کے تصور کو پیش کرے بلکہ تکمیل اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اخلاقی معیار کا کسی خاص زمانہ یا خاص قوم ونسل یا کسی مخصوص رسم ورواج سے تعلق نہ ہو وہ ہر دور اور ہر عہد کیلئے ہر نسل اور ہر قوم کے لئے یکساں ہے۔ انہیں اخلاق کی تعلیم رسولؐ نے دی جنہوں نے مکارم اخلاق کے اتمام کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا اور جن کے اخلاق کو ''اِنَّکَ لَعَلٰی خُلقٍ عَظیم'' کی بشارت سے متعارف کرایا گیا۔ وہ صاحب عظیم اخلاق کا عملی نمونہ اور اخلاق قرآنی کا مجسم مظہر ہے۔ ان کی شخصیت قرآن کے فلسفۂ اخلاق کی تجسیم ہے اور ان کی دعوت ''تَخلِقُوا بِاِ خلاَقِ اللّٰہِ'' کا عملی مظاہرہ ہے۔ اسی لئے دین اسلام عین اخلاق ہے اور ہر بداخلاق کو دور کرنا اور مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ادائے فرض سے غفلت جرم ہے جو مسلم کو مجرم بنادیتی ہے۔ فاسق وکاذب کی اطاعت سے انکار اخلاق کا کمال ہے۔ دین کو کھلونا سمجھنے والوں کے احکام کی تعمیل نہ کرنا ہی عین اخلاق ہے۔ یہی منزل صبر ہے جہاں انسان قیام حق کے لئے نقصان

برداشت کرتا ہے اور وہی وہ آزمائش ہے جہاں قیام حق کی جدوجہد کا مرتبہ حاصل کرلیتی ہے۔ اسی جہاد کا تقاضہ ایثار وقربانی، صبر واستقلال، عزیمت اور شجاعت ہے اور اس کا منتہیٰ شہادت جو فضائل اخلاق کی سب سے بڑی منزل ہے۔ جب بندہ باطل کی قوت کے سامنے سرنگوں ہونے کے بجائے بارگاہ احدیت میں اپنے سر کا نذرانہ پیش کرکے اس بات کی گواہی دیتا ہے پروردگار اس نے کیا پایا جس نے تجھے کھودیا اور اس نے کیا کھویا جس نے تجھے پالیا۔اسی اہم مسئلے کے پیش نظر پروفیسر یوسف حسین خان تحریر کرتے ہیں کہ!

''نیک عمل ضائع نہیں جاتا۔ اس کی تکمیل کے وسائل بعد میں خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں اسی طرح اخلاقی قدروں سے ان پر اسرار معانی کا اظہار ہوتا ہے جو زمانے کے سیل رواں میں ظہور پزیر ہوتے ہیں اورجن کی بدولت انسان فطری قوتوں سے بلند تر اور ماورا ہوجاتا ہے ۔ اخلاقی شعور میں انسان کی آزادی کی تکمیل ہوتی ہے اور اس طرح اخلاقی قانون اس کے وجود کا قانون بن جاتا ہے۔'' ۲۷؎

سلام ہو اس مظلوم پر کہ جس نے اپنے قیام کربلا سے اخلاقی اقدار کا لفظ پیدا کیا۔ اگر ہم مدینہ سے کربلا تک کے سفر امام حسینؑ پر نظر ڈالیں تو مندرجہ ذیل اخلاقی اقدار ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

(۱)رعایت ادب(۲) انصاف وعدالت(۳) علاقہ ومحبت بہ یاران اہلبیتؑ واعداء (۴)راستی با اصحاب (۵) اہمیت نماز(۶) خدمت بہ فقراء وا[illegible]ن (۷) دلچسپی تلاوت قرآن (۸)آزادی (۹) غیرت (۱۰) شہادت طلبی (۱۱) ہر حال میں لوگوں کی ہدایت (۱۲)بزرگان کے مشورہ اور نصیحت کو اہمیت دینا(۱۳) صبرواستقامت (۱۴)قیام میں خلوص (۱۵) عدم فراموشی خدا (۱۶) شجاعت وغیرہ۔

اگر متذکرہ نکات کو تفصیل کے ساتھ تحریر کروں تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب مرتب ہوجائے گی۔ اس لئے بہ نظر اختصار چند اہم نکات کی تشریح لازمی سمجھتا ہوں۔

رعایت ادب:

(۱)امام حسینؑ جب مدینہ سے سفر کرتے ہیں تو ادب کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے

اپنے نانا رسولؐ اکرم کے روضے پر تشریف لائے اور رو روکر فریاد کی ،اے نانا میں آپ کے پڑوس سے مجبوراً جارہاہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے شرابی فاسق وفاجر کی بیعت نہیں کی۔ اسی طرح دوسری رات کوتشریف لائے اور وداع کیا ۔۲۸؎ اور پھر جناب امام حسینؑ نے اپنی والدہ محترمہ فاطمہ زہراؑ کے مزار پر نماز ادا کی اور الوداع کیا۔ اس کے بعد امام حسنؑ کے روضہ پر تشریف لے گئے نماز ادا کی اور رخصت ہوئے۔ ۲۹؎

(۲) روز عاشور جب کسی نے امام حسینؑ کی توہین آمیز کلام سے دل آزاری کی تو امامؑ نے اسے کچھ نہیں کہا بلکہ خدا سے شکایت کی۔ امامؑ نے ادب کے خلاف کلام نہیں کیا ۔۳۰؎ پروردۂ آغوش رحمت اور آئینہ خلق نبوت نصیحتوں پر نصیحتیں فرماتے رہے۔ مہلتوں پر مہلتیں دیتے رہے۔

(۳) جب نماز ظہر کا وقت قریب آیا تو اسی وقت جناب حر اپنے لشکر کے ساتھ امامؑ کے نزدیک ہوئے۔ اسی حالت میں امام حسینؑ نے جناب حر سے نماز پڑھانے کے لئے کہا۔جناب حر نے جواب دیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کریں۔ ہم لوگ آپ کی قیادت میں نماز ادا کریں گے۔ دونوں لشکر نے امام حسینؑ کی قیادت میں نماز ظہرادا کی۔۳۱؎

(۴) جس وقت عمر بن سعد نے (حاکم مکہ) امام حسینؑ کے پاس خط بھیجا۔جس میں امان دینے کے متعلق لکھا تھا امام نے قبول نہیں کیا ورفرمایا اگرتم اس خط کے ذریعے نیکی کا ارادہ کرتے ہوتو تمہیں دنیا وآخرت میں جزائے خیر ہو۔ ۳۲؎

(۵) جس وقت کربلا میں شمر قریب آیا اورعباس وعبد اللہ وجعفر کوآواز دی اور چاہا کہ ان لوگوں کو امان دیں تو حضرت امام حسینؑ نے فرمایااَجِیبُو اِن کَانَ فَاسِقاً فَاِنَّہ مِن اَخوانکم۔ ۳۳؎

علاقہ ومحبت:

امام حسینؑ فقط اپنے اصحاب واعزاء کونہیں بلکہ اعداء کوبھی چاہتے ہیں اور ان سے اظہار محبت کرتے ہیں ۔

(۱) یہ وہی حُر ہیں کہ جنہوں نے امام حسینؑ کے لجام فرش پر ہاتھ ڈالا تھا اور امامؑ کو روکنے کے لئے آیا تھا اورجس کے پیاسے لشکر کو امام حسینؑ نے عالم غربت میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ دشمن کی فوج ہے اسے پانی سے سیراب فرمادیا جو آپ کے رفقاء اور بچوں کے لئے تھا۔عرب کے

ریگزاروں کی تپتی ہوئی ریت اور سفر کا یہ عالم، ایسے میں پانی کا یہ ذخیرہ کس قدر نایاب اور قیمتی شئ ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھ کبیر سن بھی ہیں اور بچے بھی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اب پانی کہاں اور کیسے دستیاب ہوگا۔ ایسے میں حر اپنے لشکر کے ساتھ سدّ راہ ہوتا ہے حر اور اس کا لشکر پیاس کے ہاتھوں ہلاک ہونے کے قریب ہے، رحمت عالم کا نواسہ اپنے نانا کے اس کریمانہ اخلاق سے کیسے دستبردار ہوسکتا ہے جہاں دشمن کی جان بچانا اور اس کے حق میں بھی ہدایت کی دعا کرنے کا طریقہ رائج ہو۔ چنانچہ امام حسینؑ نے حر اور اس کے لشکر والوں، گھوڑوں اور ناقوں اور جانوروں کو سیراب فرمادیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ حر اور اس کا لشکر آپ کی دشمنی پر مستعد اور کمر بستہ ہے۔ لیکن حسینؑ کا مقصد یہی تھا کہ اخلاق محمدی کا مظاہرہ بن کر ابھریں تا کہ اسلام کے بارے میں ملوکیت اور حکومت نے جو شبہات پیدا کردئے ہیں وہ دور ہوں۔ یہ وہی حر ہیں کہ جب اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور توبہ واستغفار کئے تو امام حسینؑ نے ان کی توبہ قبول کی اور جب میدان قتال میں جا کر شہید ہوئے تو امام حسینؑ نے انکے سر کو اپنے دامن میں لے لیا اور گریہ کیا۔ انکے چہرے سے خون کو صاف کیا اور فرمایا'' وَاللّٰہِ مَا اَخطأت اُمّکَ اِذَا سَمّتکَ حُرّاً '' ۳۴۔

(۲) امام حسینؑ نے جس وقت قیس ابن مسہر صیداوی کے شہادت کی خبر سنی تو ان پر گریہ کیا اور ان کے لئے دعا کی۔۳۵۔

(۳) امام حسینؑ اپنے بھتیجے قاسم سے فرماتے ہیں کہ اے بیٹا موت تیرے نزدیک کیسی ہے تو آپؑ نے جواب دیا کہ موت میرے نزدیک شہد سے زیادہ شیریں ہے، ایسی صورت میں امام حسینؑ نے فرمایا ''اَی وَاللّٰہِ فِدَاکَ عَمّکَ'' ۳۶۔

پروفیسر وحید اختر نے جناب قاسمؑ کی شہادت کے متعلق کتنا حساس وغم انگیز شعر کہا ہے۔

پھولوں سے لدی ٹہنیاں پھیلائے ہیں باہیں خوشبو کا بدن خاک میں پامال پڑا ہے ۳۷۔

(۴) اسلم ابن عمرو ایک ترکی غلام قاری قرآن تھا۔ جس وقت شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے تو امامؑ سرہانے پہونچتے ہیں اور گریہ کرتے ہیں اور اپنے رخسار کو ان کے رخسارے پر رکھتے ہیں اسی اثنا میں غلام ترک اپنی آنکھ کو کھول دیتے ہیں اور امامؑ کو اپنے بالائے سر دیکھتے ہیں تو مسکراتے ہیں اسی حالت میں جان قفس عنصری سے پرواز کرجاتی ہے۔۳۸۔

(۵) غلام ابو ذر غفاری کربلا میں حاضر ہوئے امام حسینؑ نے انہیں آزاد کردیا تا کہ اگر

چاہیں تو واپس چلے جائیں لیکن آپ نے جانا پسند نہیں کیا اور کہا ''**لاَوَ اللّٰہِ اَنا اُفارِقُکُم حَتّٰی یَختلطَ ھٰذَا الدَّمُ الاَسوَدِ مَع دِمائکُم**'' جب جناب غلام ابوذر غفاری شہید ہوئے تو امام حسینؑ ان کے سرہانے پہونچے اور انکے حق میں دعا کی ''**اَللّٰھُمَ بَیّض وَجھَہ وَطَیّب رِیحہ وَاحشرہ مَع الاَبرَارِ وَعَرفہ بَینہ وَبَین مُحمدؐ وَآلِ مُحمد**'' ۳۹ ۔

(٦) امام حسینؑ نے علی اکبرؑ کی شہادت پر فرمایا ''**عَلَی الدُّنیا بَعدکَ العَفاء**'' ۴۰ ۔

کیا دکھائیں خشک لب دوبوند کے ساقی ہیں سب
پیاس صحرائے ازل، اس کو سمندر چاہیئے ۴۱ ۔

۳۔ اہمیت نماز:

روز عاشورہ ابوثمامہ (عمر بن عبد اللہ الصائدی) نے کہا کہ ہم نماز ظہر آپ کے ساتھ ادا کرنا چاہتے ہیں تو امام حسینؑ نے فرمایا ''ذَکرتَ الصَّلوٰۃ **جَعلَکَ اللّٰہُ مِن المُصَلّینَ الذّاکِرِینَ**''۔ امامؑ نے لشکر دشمن سے کہا کہ جنگ سے ہاتھ روک لیں تا کہ نماز کو ادا کرلیں لیکن ان لوگوں نے سکوت اختیار کیا۔ حضرت امام حسینؑ نے اذان دی۔ زہیر وسعید بن عبد اللہ حضرت کے سامنے کھڑے ہوئے۔ نصف افراد لشکر نے امامؑ کے ساتھ اقتدا کی اور نماز کو بصورت نماز خوف ادا کی۔ ۴۲ ۔

دشمنوں نے جب آپ کو اور آپ کے اصحاب کو محاصرہ میں لے لیا اور ہر طرف سے راستے بند کردئے تو امام حسینؑ نے ایسی حالت میں بھی نماز کو فراموش نہیں کیا۔ امامؑ اور آپ کے اصحاب، صبح تک نماز واستغفار وآہ وزاری کی حالت میں بارگاہ خداوندی میں مشغول رہے۔ ''**بَاتَ الحُسین وَاَصحابِہ طُول لَیلَتھُم یُصَلُّونَ وَیَستَغفِرُونَ وَیَتَفرعُونَ**''۔ ۴۳ ۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

سر کٹا کر سجدے میں شبیرؑ نے بتلا دیا
بے نمازی سے ہمارا کوئی بھی رشتہ نہیں

۴۔ تلاوت قرآن:

(۱) عصر تا سوعا دشمنوں نے ارادہ کیا کہ امام حسینؑ کے سپاہ کی طرف حملہ کریں تو امام حسینؑ نے جناب عباسؑ سے فرمایا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں تاخیر کرسکتے ہوں تو کردیں تا کہ اس شب کو ہم نماز ودعا

واستغفار میں گزاریں۔ خداجانتا ہے کہ میں نماز اور تلاوت قرآن اور دعا واستغفار کو کس قدر دوست رکھتا ہوں۔ ۴۴؎

۵۔ آزادی:

امام حسینؑ نے روز عاشورہ فرمایا کہ ذلّت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ ۴۵؎ اس سے معلوم ہوا کہ عزت وکرامت، شرافت وآزادیٔ انسان کس قدر اہمیت رکھتا ہے، بغیر اس کے زندگی سے بہتر موت ہے

اَلمَوتُ خَیر مِن رُکُوبِ العَارِ وَالعارُ اَولیٰ مِن دُخُولِ النّارِ

۲۔ امام حسینؑ اپنے دشمنوں سے کس اخلاقانہ انداز سے فرماتے ہیں۔''اِن لَم یَکُن لَکُم دِین وَ کُنتُم لَاتَخافُونَ المَعادُ فَکُونُوا اَحرارًا فِی دُنیاکُم ھٰذِہ وَارجِعُوا اِلیٰ اَحسَابِکُم اِن کُنتُم عربًا کَما تُزعِمُون'' ۴۶؎

۳۔ امام حسینؑ فرماتے ہیں: ''اِنّی لاَ اَرَی المَوتُ اِلاَّ سَعَادَۃَ وَالحَیاۃ مَعَ الظَّالِمِین اِلاَّ بَرما'' ۴۷؎

۴۔قیام عاشورہ میں امام حسینؑ کا یہی نعرہ تھا ''ھَیھاتَ مِنّاالذِّلَّۃ'' ۴۸؎

۵۔جس وقت لشکرحر پیاس سے بے چین تھا تو ساقی کوثر کے فرزند نے اپنے بہادروں کو حکم دیا کہ حر کے سواروں کو سواری کے جانوروں کو اچھی طرح سیراب کردو۔ چنانچہ اچھی طرح سیرابی کردی گئی۔ ۴۹؎

۶۔ صبرو استقامت: ''وَاستَعِینُوا بِالصَّبرِ وَالصَّلوٰۃِ''۔صبر سے مراد ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ہے جو کسی مقصد میں کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ امام حسینؑ سیدالصابرین ہیں۔ صلوٰۃ جو جہاد اکبر کی بڑی نشانی ہے اور جو اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل کا حکم رکھتی ہے چنانچہ امامؑ ایک ہزار نوافل ادافرماتے ہیں اور شہادت کے وقت بھی نماز کو فراموش نہیں کرتے ہیں۔ امامؑ نے مختلف جگہوں پر صبر کا مظاہرہ کیا۔ جب اہل حرم سے رخصت ہونے کے لئے آئے تو سب کو صبر کی تلقین کی۔ ۵۰؎ زندگی کے آخر میں بھی امام حسینؑ نے صبر سے کام لیا۔ آپؑ نے فرمایا ''صَبراً عَلیٰ قَضَائِکَ یَا رَبِّ لَا اِلٰہَ سِوَاکَ صَبراً عَلیٰ حُکمِکَ یَا غِیاثَ مَن لاَغِیاثَ لَہ'' ۵۱؎ اے پروردگار تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ تیری قضا پر میں صبر کرتا ہوں۔ تیرے فرمان پر میں صبر

کرتا ہوں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ "مَن صَبر صَبراَلِاَحرار،وَالاّسَلاسلُوالاَغمٰار" ۵۲ ۔

راہ صبر اور جہاد حق میں صبرواستقامت اور عزم وثبات ہے۔" اِنَ الّذِینَ آمنوا رَبّنا اللّٰہ ثُمَّ استَقٰامُوا" دوسری جگہ آیت خداوندی ہے کہ "فَاستَقِم کَمٰااُمِرتَ۔۔" الخ اس شہادت عظیمہ کی سب سے بڑی خصوصیت صبر ہے کہ اپنے تمام عزیز واقارب ، اہل وعیال اوراحباب کے ساتھ غربت ومصائب میں محصور اعداء ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش اورجوع سے آہ وفغا کرتے ہوئے دیکھنا، پھران میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا حتی کہ اپنے شیر خوار کو بھی تیرظلم وبربریت سے نخچیر پانا،مگر بایں ہمہ راہ عشق وصداقت میں جو پیمان صبر واستقامت باندھا تھا اس کا ایک لمحہ متزلزل نہ ہونا اورحق کی راہ میں جس قدر مصائب و اندوہ پیش آئے سب کوشکر ومنت کے ساتھ برداشت کرنا اور امام علیہ السلام کا یہ فرمانا "رِضاً لِقَضٰائِہ وَصَبَرنا عَلٰی بَلَائِہ"۔یہ صبر جبرنہیں ہے بلکہ اختیار ہے۔ یہ اخلاق انسانی کا جوہر ہے۔ یہ اپنے دائرہ اختیار وارادہ کے عرض کوتسلیم ورضا کے جوہر سے ہم آہنگ کرکے اس کی طرف مراجعت کرنے کا نام ہے کہ اللہ اپنے بندے سے راضی ہو اور بندہ اپنے رب کی رضاسے مطمئن ہوجائے۔" یا اَیَّتُھَا النَّفسُ المُطمَئِنَّۃُ الرجِعِی اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِیَۃًمَرضِیَّۃً" ۵۳ ۔

صبرحسینؑ کے تصورات کو مدنظر رکھتے ہوئے افتخار عارف کہتے ہیں۔

زرہَ صبر سے پیکان ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہمہ دم کھینچتے ہیں
حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیر دو دم کھینچتے ہیں

(مہرونیم)

۷۔ایثار وفداکاری:

ا۔ ایثار وفداکاری کربلا کا عظیم حصہ ہے۔ امام حسینؑ نے اپنے خون کے آخری قطرے کو خدا کی راہ میں فدا کردیا اور اصحاب وانصار واعزاء کو بھی فدا کردیا۔جس وقت امامؑ کو دشمنوں نے

تیروں سے اذیت کی تو امامؑ خون کو اپنے چلّو میں لیتے تھے اور اپنے سر اور چہرے پر ملتے اور فرماتے تھے کہ خداوند عالم سے اسی طرح ملاقات کروں گا۔ ۵۴؎

۲۔ سخت حوادث سے امام حسینؑ کبھی نہیں گھبراتے تھے بلکہ سخت حوادث سے امام کا ارادہ راسخ تر ہوجاتا تھا۔ جس وقت جناب مسلم وجناب ہانی کی شہادت کی خبر امام حسینؑ نے سنی تو آپ نے فرمایا ''لَاخَیرَ فِی العَیشِ بَعدَھُؤ لَاءِ'' ان دونوں کے بعد اب زندگی میں کوئی نیکی وبھلائی نہیں ہے۔

۳۔ امام حسینؑ کے اصحاب بھی امام حسینؑ پر اپنی جان نثار کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ''اَلحَمدُلِلّٰہِ الَّذِی شَرَفنابِالقَتلِ مَعَکَ'' ۵۵؎

۴۔ امام حسینؑ نے جس وقت اپنے اصحاب سے فرمایا کہ میں بیعت کو ہٹائے لیتا ہوں جس کا دل چاہے اس تاریکی شب میں چلا جائے تو زہیر عرض کرتے ہیں کہ اے فرزند رسولؐ! میں آپ کو دوست رکھتا ہوں۔ اگر میں آپ کے ساتھ قتل کردیا جاؤں اور دوبارہ زندہ کیا جاؤں یہاں تک کہ سو بار اسی طرح سے سلسلۂ موت وحیات جاری رہے تب بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ ۵۶؎

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جسکو جانا ہے
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
(مہر دونیم)

۸۔ شجاعت:

علم اخلاق کی رو سے ہر فضیلت افراط وتفریط کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ شجاعت وہ فضیلت ہے جو گستاخی اور بزدلی کے وسط میں واقع ہے جو شخص ایک سمت سے گستاخی اور دوسری سمت سے بزدلی سے بچائے ہوئے ہو، وہ شجاع کہلاتا ہے ۵۷؎۔ اسی ضمن میں اگر امام حسینؑ کی شجاعت پر گہری نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ امام حسینؑ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ عمر بن سعد کو اپنی فوج سے کہنا پڑا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ کس سے جنگ کررہے ہو، یہ فرزند جنگ آور عرب ہے سب ملکر حملہ

کرو۔ بس ایسی حالت میں چار ہزار لوگوں نے ایک ساتھ امام حسینؑ پر تیراندازی کی۔ ۵۸ ؎

میدان شجاعت میں بعض ایسے احکام بھی ہیں جنہیں معرکۂ کارزار میں ملحوظ رکھنا قطعاً ناممکن ہے مثلاً یہ کہ سوار پیدل کو قتل نہ کرے، دشمن کے پاس زرہ نہ ہوتو اسے چھوڑ دیا جائے ، ننگے یا نہتے یا دہشت زدہ کو قتل نہ کیا جائے، دشمن کسی دوسرے شخص سے لڑنے میں مشغول ہوتو اس پر وار نہ کیا جائے۔ ۵۹ ؎ ۔کربلا میں اس قسم کے احکام میں اصلاح کے جذبہ پر نمائش اخلاق غالب آ گیا ہے۔امام حسینؑ نے ضروریات جنگ پر اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو قربان کردیا۔ امام حسینؑ کے یہ احکام جنگ بہت مہذب ہیں اور ایسے تربیت یافتہ اخلاقی شعور کا پتہ دیتے ہیں جو عداوت اور جنگ کی حالت میں بھی محاربین کے انسانی فرائض کا احساس رکھتے ہیں۔

مسٹر جیمس کا رکرن اپنی کتاب'' تاریخ چین'' ۱۸۴۸ئ میں تحریر کرتے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں تصنیف کی ہے اردو زبان میں انہیں انشاء پردازی اور اظہار خیالات میں اہمیت حاصل ہے۔وہ اس کتاب کے سولہویں باب میں سید الشہداء علیہم السلام کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

'' دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے لیکن کئی شخص ایسے گذرے ہیں جن کے سامنے رستم کا نام قابل لینے کے نہیں۔ چنانچہ اول درجہ میں حسین ابن علیؑ کا رتبہ بہادری میں ہے کیونکہ میدان کربلا میں ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ کس کے قلم میں قدرت ہے کہ امام حسینؑ کا حال لکھے۔ کس کی زبان میں لطافت وبلاغت ہے کہ ان بزرگواروں کی ثابت قدمی اور شجاعت اور بیس ہزار خونخوار شامی کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہلاک ہوجانے کے باب میں مدح، جیسا چاہئے کر سکے۔ کس کی نازک خیالی کی رسائی ہے کہ ان لوگوں کے حال کا تصور کرے کہ کیا کیا ان پر گزرا، اس وقت سے کہ جب عمر سعد نے دس ہزار سے ان کو گھیر لیا ،اس وقت تک جب شمر ملعون نے سر کاٹ لیا۔پس جنہوں نے ایسے معرکہ میں ہزار ہا کا مقابلہ کیا ہو ان پر خاتمہ بہادری کا ہو چکا'' ۶۰ ؎

امام حسینؑ اور آپ کے اہل بیت واصحاب نے بنی امیہ کے خلاف اپنی تحریک میں خالص ترین اور پاکیزہ ترین اسلامی اخلاق کا بلند ترین نمونہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس اخلاق کی فقط زبانی

تبلیغ نہیں کی بلکہ آپ اپنے اصحاب وانصار واعزاء واقربا اور اپنے خون سے اسلامی اخلاق کا یہ صفحہ رقم کیا۔ اخلاق وکردار کا مظاہرہ امامؑ اور آپ کے ساتھیوں نے پیش کیا اور مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجوڑا کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ ان کو خواب گراں سے بیدار کیا تا کہ اسلامی معاشرہ زندگی کے اس صحیح راستے پر لگ جائے جس سے وہ دور ہو چکے ہیں ۔

نتیجہ کلام

امام حسینؑ نے جس مقدس چیز کی عظمت وبقا کی خاطر، اور جس مقصد کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آنکھوں کے سامنے پاش پاش ہوتا دیکھنا پسند کیا وہ دین الٰہی ہے ''اِنَّ الدِّینَ عِندَاللّٰہِ الاِسلام'' اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد، مالک، معبود، حاکم ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے ۔سب کے لئے ایک ہی قانون اخلاق ہے اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ علیم وخبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے اس لئے ظاہری حسن اخلاق سے اسکو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ امام حسینؑ ہر قدم پر میدان کربلا میں دعوت حق دیتے رہے۔کربلا کے ذریعے سے انسان کے ذہن میں ایک مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ مذاہب کے اخلاقیات اور دہریانہ مسلکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں ۔یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کے چور دروازے موجود ہیں اور نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لئے کوئی جگہ ہے جن کی بنا پر انسان اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے عالم انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصے کے لئے مجسم فرشتہ اور دوسرے حصے کے لئے مجسم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہریانہ اخلاقیات کی وہ بنیادی کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاق میں کوئی استحکام پیدانہیں ہوسکتا۔

فی الحقیقت یہ حق وصداقت ، آزادی وحریت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لئے پیش کی گئی تھی کہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ فراہم ہوجائے ۔

(ا) سب سے پہلا نمونہ جو یہ سانحہ عظمیہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے دعوت الی الحق اور

حق وحریت کی راہ میں اپنے تیئں قربان کرنا۔

(۲) مقابلہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ تمہارے پاس قوت مادی کا وہ تمام سازوسامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس تھا۔حسینؑ ابن علی کے پاس چند ضعفاء کی جمعیت قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

(۳) حق وصداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں۔ جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ امام حسینؑ کا اسوۂ حسنہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا بھی پروانہ کرو۔ اگر ظلم وجابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے۔

(۴) تعداد کی قلت وکثرت یا سامان وسائل کا فقدان اور سپر موثر نہیں ہوسکتا۔

(۵) ظالم کا صاحب شوکت وعظمت ہونا اس کے لئے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ظلم خواہ ضعیف ہو یا خواہ قوی ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

(۶) ہر حال میں ذکر خدا کرنا چاہئے۔نماز وتلاوت کلام پاک کرنا چاہئے۔

(۷) حق وصداقت اور رفاقت کی آزمائش زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔قدم قدم پر حفظ جان وناموس اور محبت فرزند وعیال کے دامن کھینچے ہیں لیکن اسوۂ حسنہ مومنین ومخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب وہمت کو اچھی طرح آزمالیں۔ یہ نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے۔

یہ حسینی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ بعد از انقلاب حسینؑ امت کے اندر جذبۂ مقاومت بیدار ہوا اور لوگ قیادت کے لئے ایک رہبر کی آرزو کرنے لگے۔ یہ انقلابی روح ہر اس تحریک میں جلوہ گر نظر آتی ہے جو خون حسینؑ اور انقلاب حسینؑ کی آواز بازگشت کے طور پر وجود میں آئی جن میں سے چند تحریکوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) قیام عبد اللہ بن عفیف ازدی (۲) قیام توابین (۳) قیام اہل مدینہ (۴) قیام مختار ثقفی (۵) قیام مطرف بن مغیرہ (۶) ابن اشعث کی بغاوت (۷) قیام زید بن علی ابن حسین۔ ۶۱؎

روح حسینؑ ریگ کربلا سے پھر صدا دے رہی ہے ۔ روح زینب اجڑے ہوئے خیموں سے ہمیں صدا دے رہی ہے۔علی اکبرؑ وعباسؑ وعلی اصغرؑ کا ہر قطرۂ خون،اور شہدائے کربلا کے خون سے رنگین ہونے والا کنارہ ہمیں آواز دے رہا ہے کہ حسینؑ سے محبت والفت کرنے والوں حسینیت کے

کردار واخلاقی اقدار کو اپنے قول وعمل میں زندہ کرو، کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ انساں اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
علاّمہ اقبالؒ

ہر دور کے یزیدوں کو پہچانو ۔یزیدیت تمہارے اتحاد کو ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے اورحسینیت ''وَاعتَصِمُوا بِحَبلِ اللّٰہِ جَمِیعاً وَّ لَاتُفَرِّقُوا'' کے ذریعہ پیغام اتحاد دے رہی ہے۔ یقینا ہمارا تحاد عالمی سامراج کی موت ہے ۔حسینیت اخوت ومحبت اور وفا کی علمبردار ہے۔ یزیدیت اسلام کی قدریں مٹانے کا نام ہے۔حسینیت قوم کی امانت کو بچانے کا نام ہے۔ یزیدیت جہالت ،ظلم، پستی، وذلت کا نام ہے۔حسینیت،علم، امن انسانیت کی نفع بخشی کا نام ہے۔

آیئے سب مل کر یزیدیت کے خلاف ایک عہد کریں اور وقت کے یزیدوں کے قصر امارت کو پاش پاش کردیں۔ اپنے اندر حسینی کردار پیدا کریں اور کربلا ئے عصر میں ایک نیا معرکہ بپا کردیں۔ ایک نئی وادیٔ فرات کو اپنے لہو سے رنگین بنادیں۔ فتنہ، وفساد،قتل وغارت گری کی آگ کو بجھاکر امام حسینؑ کے جلائے ہوئے چراغ امن واخلاق سے اپنے ظاہر وباطن کے اندھیرے کودورکریں۔ عالم کفر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جائیں ۔اللہ کی رسّی کومضبوطی سے پکڑلیں۔ یہی شعور کربلا ہے یہی پیغام کربلا ہے۔ اس پیغام کی خوشبو کا پرچم لیکر آگے قدم بڑھائیں پھر دیکھئے مستقبل آپ کے قدم چومے گی۔

حوالے:

۱۔سوگنامہ آل محمدؐ،ص۱۹۸ محمد محمدی اشتہاردی، سن چاپ: یازدہم تابستان ۱۳۷۷
۲۔مرثیہ ''صداقت کے چراغ''،ص ۵۲ ڈاکٹر وحید اختر، ازنقل رسالہ ''العلم'' ج ۲،ماہ فروری ۱۹۹۳ء، ممبئی
۳۔سورۂ عصر، پ ۳۰
۴۔ رموز بیخودی، ص ۱۶۵۔علاّمہ اقبالؒ،ص ۱۶۵ شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۱۹۹۷ء، دہلی
۵۔ رموز بیخودی،ص ۱۷۷
۶۔کلیات اقبالؒ ،ص۳۹۹، علاّمہ اقبالؒ ، نظر ڈاکٹر منور حسین

۷۔سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ ،ص۱۸ پروفیسر گوپی چند نارنگ ،۱۹۸۶ئ ،دہلی
۸۔سورۂ بقرہ،آیت ۱۵۵
۹۔سورۂ فجر ،آیت ۲۸
۱۰۔کربلا بطور شعری استعارہ ص ۳۷، پروفیسر گوپی چندرنارنگ
۱۱۔کلیات اقبالؔ،ص۳۱۹ علاّمہ اقبالؔ،دسمبر ۱۹۹۷
۱۲۔ اسلام کی حکیمانہ زندگی،ص ۶۷ حجۃ الاسلام سیدعلی نقی نقوی۔ چاپ امامیہ مشن،لکھنؤ
۱۳۔تجلیات حکمت،ص ۶۳ سید اصغر ناظم زادہ (اردو ترجمہ) ۱۹۹۸ءقم ایران
۱۴۔تجلیات حکمت،ص ۶۴، سید اصغر ناظم زادہ (اردو ترجمہ) ۱۹۹۸ءقم ایران
۱۵۔انّی لم اخرج اشراً و لا بطراً۔۔۔الخ(سوگنامہ آل محمد ،ص۱۹۸،محمد محمدی اشتہاردی، چاپ یازدہم تابستان ۱۳۷۷)
۱۶۔نقل سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ ص ۴۹، پروفیسر گوپی چند نارنگ
۱۷۔الامامۃ والسیاسۃ ،بہ نقل از کتاب ''الشہید'' ص ۲۴۳، تالیف سیدعلی جعفری، ۱۹۶۱ئ، پاکستان
۱۸۔فیروز اللغات،ص ۵۳ ، ۱۹۸۵ئ
۱۹۔لغت نامہ دہخدا،ص۶۹۷، ج ۲۳ ۔تالیف علی اکبر دہخدا، سنہ چاپ خرداد ۱۳۵۷ ہجری،تہران
لسان العرب،ص۸۶، ج۱۰، ابن منظور افریقی ،سن چاپ ۱۴۰۵ھ،قم ایران
۲۰۔ درسہای اخلاق اسلامی،ص۲۶، آیت اللہ محمدی گیلانی، ۱۳۸۰ئ ،قم ایران
۲۱۔آشنائی باعلوم اسلامی، ج ۲،ص۱۰و ۹ ، استاد مطہری ایران
۲۲۔میزان الحکمۃ ،ص۸۰۲ ،ج ۱ ، حدیث ۵۰۳۷، سنہ طباعت ۱۴۱۶ھ ق، ایران
۲۳۔میزان الحکمۃ ،ص۸۰۸ ،ج ۱، حدیث ۵۱۱۶، سنہ طباعت ۱۴۱۶ھ ق، ایران
۲۴۔الشافی، ترجمہ اصول کافی ،ص ۳۵۴ ،ج ۳،مولانا ظفرحسن صاحب، ماہ جنوری ۱۹۹۳ئ ،کراچی
۲۵۔ اسلام کی حکیمانہ زندگی، ص۵۷ وص ۶۷، حجۃ الاسلام سیدعلی نقی نقوی، چاپ امامیہ مشن لکھنؤ
۲۶۔حکومت اسلامی،ص۲۶۴ ''ویژہ نامہ اندیشہ سیاسی عاشورہ'' دفتر اوّل، سال ہفتم ،ش ۳، ۱۳۸۱ ش مدیر مسؤل ابراہیم امینی
۲۷۔روح اقبال،ص۱۷۹ پروفیسر یوسف حسین خاں۔ جنوری ۱۹۹۸ئ حیدرآباد
۲۸۔ بحارالانوار،ص ۳۱۲ ،جلد ۴۴ ،باب ۳۷، علامہ محمد باقر مجلسی، ۱۳۹۸ھ
۲۹۔موسوعہ کلمات الامام الحسینؑ ،ص۲۹۶۔مؤلف ،معہد تحقیقات باقر العلوم،مطبع دانش،قم ایران ، ۱۹۹۵ئ

۳۰۔موسوعہ کلمات الامام الحسینؑ،ص۵۰۰ وص ۵۰۳،مؤلف،معہد تحقیقات باقر العلوم،مطبع دانش،قم ایران،مئی ۱۹۹۵ئ
۳۱۔موسوعہ،ص ۳۵۵
۳۲۔موسوعہ،ص ۳۳۲
۳۳۔موسوعہ،ص ۳۹۰
۳۴۔موسوعہ،ص ۴۴۰
۳۵۔موسوعہ،ص ۳۷۸
۳۶۔موسوعہ،ص ۴۰۲
۳۷۔شب کارزمیہ،ص ۶۸، پروفیسر وحید اختر، ۱۹۷۱ئ حیدر آباد
۳۸۔موسوعہ،ص۴۵۷
۳۹۔موسوعہ،ص۴۵۱
۴۰۔موسوعہ،ص ۴۶۳
۴۱۔زنجیر کا نغمہ،ص۱۳۵، پروفیسر وحیداختر، ۱۹۸۱ئ علی گڑھ
۴۲۔موسوعہ کلمات الحسینؑ ص ۴۴۴
۴۳۔تاریخ طبری، ج ۳،ص ۳۱۷
۴۴۔موسوعہ ص ۳۹۲
۴۵۔بحار الانوار،ص ۱۹۲، ج ۴۴
۴۶۔موسوعہ،ص ۵۰۴
۴۷۔بحار الانوار،ص ۱۹۲، ج ۴۴
۴۸۔موسوعہ ،ص ۴۲۳
۴۹۔موسوعہ،ص ۴۹۰
۵۰۔موسوعہ ،ص ۳۹۲
۵۱۔موسوعہ،ص ۵۱۰
۵۲۔نہج البلاغہ،باشرح آیت اللہ مکارم شیرازی،ص۳۷۸۔ج ۳ چاپ، دوازدہم
۵۳۔سورۂ فجر ،آیت ۲۸
۵۴۔میری ڈائری ۱۹۹۶ئ
۵۵۔بحار الانوار، جلد ۴۴ ،ص ۲۹۸

۵۶۔بحار الانوار، ج ۴۴،ص۲۱۶

۵۷۔انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار: شہید مرتضیٰ مطہری، ص ۵۲۴

۵۸۔بحار الانوار، ج ۴۴،ص۱۹۱

۵۹۔الجہاد فی الاسلام ابوالاعلیٰ مودودی ،ص ۳۶۴، ۱۹۹۵ئ دہلی

۶۰۔واقعہ کربلا محققین یورپ کی رائے مرتبہ ابو الفضل نقوی کھجوہ ضلع سارن ،ص۵ و ۶ حصہ اوّل، یہ کتاب تقریباً ۸۰ سال قدیم ہے جو کتب خانۂ مرعشیہ،قم ایران میں[illegible]ط ہے۔

۶۱۔تفصیل کیلئے مطالعہ کریں ''سیرۂ پیشوایان'' ص ۲۲۱ تا ص ۲۲۷، مہدی پیشوائی، چاپ یازدہم ۱۳۷۹ش و''حکومت اسلامی'' ص ۲۷۹ تا ۳۰۱، سال ہشتم ،شمارہ اوّل، بہار ۸۲ ش

☆☆☆

کربلا اور تحفظ اسلام

مختار علی عابدی

اسلام خدا کا دین، جس کا مطلب ہے خدا اور خدائی فرامین کے سامنے تسلیم رہنا۔ قرآن حکیم کے مطابق اس دین اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کو خداوند عالم نے اپنا خلیفہ اور جانشین بنا کر بشریت کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھیجا جن میں تین سو تیرہ رسول اور پانچ

اولوالعزم اور صاحب شریعت رسولؑ تھے۔ بعض نبیوں کو الٰہی صحیفے اور بعض کو الٰہی کتابیں ملیں۔ مرسل اعظم حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل شدہ کتاب قرآن حکیم قانون کی آخری کتاب ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق قرآن حکیم کے علاوہ دوسری آسمانی کتابیں امتوں کے ہاتھوں تحریف کردی گئی ہیں۔ اس لئے اللہ نے اپنی آخری کتاب قرآن کو دوسری تمام کتابوں کے لئے مصداق اور ناسخ قرار دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اختلاف کی صورت میں قرآن کی بات حق سمجھی جائے گی۔

مذہبی اعتبار سے دین اسلام ازلی ہے اور تمام پیغمبر خدا کی طرف سے اسی دین کی اشاعت کے لئے آئے مگر اس دین کا نام اسلام اور اس کے پیروؤں کا نام مسلم سب سے پہلے خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ نے رکھا۔ اس اعتبار سے وہ اسلام کے مورث اعلیٰ سمجھے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ سلسلہ بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے، جن میں حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ مشہور انبیاء مبعوث ہوئے اور توریت اور انجیل قانون کی کتابیں ان پر نازل ہوئیں۔ حضرت داؤدؑ پر زبور نازل ہوئی جو ایک دعا کی کتاب ہے۔

دوسرے حضرت اسمٰعیلؑ تھے، جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے شیرخوارگی کے عالم میں آپ کی والدۂ گرامی ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچادیا جس میں خانہ کعبہ واقع ہے اور کعبہ کی تعمیر بھی باپ بیٹے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل کر کی۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے ۱۲ فرزند تھے ان میں ثابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان ہوئے، جن کی نسل میں حضر بن کنانہ اور ایک قول کے مطابق فہر بن مالک بن نضر اور بقول قصیٰ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن عالب بن فہر کی اولاد قریش کے لقب سے مشہور ہوئی۔

قصی ابن کلاب نے بڑا نام پیدا کیا اور بڑے کارنامے انجام دئے۔ انہوں نے دارالندوہ (محل مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی، جس میں جمہور کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔ ان کے لئے معاشرت کے قوانین منضبط کیے گئے اور خراج کی وصولی اور حاجیوں کے خوردونوش کا انتظام کرایا۔ انہوں نے شراب کی مذمت کی اور اس کے مضرتوں کا اعلان کیا۔ جناب قصی کے فرزند میں عبد مناف اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے اور ان کے فرزندوں میں ہاشم نہایت ہی باا ثر اور ممتاز تھے۔ کعبے کی معزز خدمتیں، حاجیوں کی سیرابی اور ضیافت ان کے سپرد کی گئی جو انہوں نے بہت

قابلیت سے انجام دی۔ ان کے مقابلے میں امیہ بن عبد الشمس جو بنی امیہ کا مورث اعلیٰ تھا، ناکام ہوکر جلاوطن ہوکر شام کی طرف چلا گیااور وہاں اپنا مستقر بنالیا۔

قحط کے زمانے میں اہل مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر کھلانے کی بناپر ہاشم ان کا لقب ہوا۔ ہاشم کے بیٹے عبد ا ﷺ تھے جو شرف، عظمت اور شہرت میں اپنے اکثر بزرگوں پرفوقیت لے گئے اور سید البطحا کے خطاب سے مشہور ہوئے، جو ان کی اولاد میں آج تک باقی رہ گیا۔ انہیں کی اولاد ہے جو سادات کہلاتی ہے۔

عبد ا ﷺ کے دس بیٹوں میں دو بیٹے عبد اللہ اور ابو طالب تھے۔عبد اللہ کے فرزند پیغمبراسلام حضرت محمد مصطفی تھے، جنہوں نے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہنچایا اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی ،غرض کہ غیراللہ کی ہرطرح کی پرستش کی مخالفت کی اور بتایا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ بھولے ہوئے پیغامات کو دہرایا۔ مٹے ہوئے نظام الٰہی کو زندہ اور کامل کیا، جس کی حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النّبین مرسل اعظم تک تمام الٰہی نمائندوں نے تبلیغ وترویج کی۔

اسلام کے اصول دین یعنی توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت، سبھی عملی اور افادی حیثیت رکھتے ہیں۔اسلامی اصولوں کوعملی جامہ پہنانے کے لئے فروغ دیں۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، اچھائی کی نصیحت اور برائی کی ممانعت ، خدا اور اس کے اولیاء سے عشق ومحبت اور دشمنوں سے نفرت وبیزاری کے عنوانات سے ایک کامل منصوبہ اللہ ہی کا تیار کیاہوا ہے۔

اسلامی اعتقادات اورعبادات ومعاملات سب انسانی فطرت پر مبنی ہیں اور پورا اسلامی نظام حیات الٰہی دستوروقوانین پر استوار ہے اور تمام دستوروقوانین کا سرچشمہ قرآن حکیم وسنت رسولؐ اور سیرت معصومینؑ ہے۔کسی بھی عام انسان کو وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے۔

اسلام در اصل ایک دستور حیات ہے۔ اسلام کا نعرہ'' لاَ اِکْرَاہ فِی الدِّین ''ہے۔دور جاہلیت کے عہد اسلامی رسم ورواج کے مہلک اثرات سے لے کرعصر حاضر کی نام نہاد تہذیب اور کلچروسماج کے تباہ کن مضمرات تک ہر دور اور زمانے میں ہرقوم اورملت کی حفاظت اور بقا کے لئے مرسل اعظم اور ان کے اہل بیت مکرم نے اسلامی نظام کی ترویج واشاعت کا بیڑا اٹھایا اورنسل آدم کی تمام قوم ونسل وزبان کے غیر انسانی امتیازات کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَۃ

(مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں) اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللهِ اَتْقَاکُم (خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محترم ومکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)۔اسلام کے بنیادی تین اصولوں میں اسلام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے روئے زمین پر امن وآشتی قائم کرنے، بھولی بھٹکی قوموں کو خدا کی راہ پر لگانے اور بندے ومعبود کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کے لئے آیا۔

حضرت ابوطالب کے فرزند امیرالمومنین حضرت علیؑ مرتضیٰ تھے۔ جو اشاعت اسلام میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ہمیشہ دست وبازو بنے رہے۔ یہاں تک کہ مخالفین اسلام نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بدر و اُحد وخندق وخیبر کی لڑائیاں ہوئیں تو ان تمام لڑائیوں میں حق وصداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰؑ کی تلوار تھی جو ہر موقع پر اسلام کی فتح مندی کا سبب بنی رہی۔

حضرت رسول □ خدا کی ایک بیٹی تھی فاطمہ زہراؑ، جن کی ان کے بلند اوصاف کی بنا پر آپ اتنی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے اور بکثرت حدیثیں آپ نے ان کی فضیلت کے بارے میں ارشاد فرمایا، جن میں ایک یہ تھی کہ ''وہ سردار زنانِ جنت اور سردار زنان اہل ایمان ہیں۔'' اور فرمایا کہ فَاطِمۃ بِضَعَۃٌ مِنّی یعنی فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ ان کی شادی حضرت علیؑ مرتضیٰ سے ہوئی اور انہیں دونوں مقدس بزرگ ماں باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایک حسنؑ مجتبیٰ اور دوسرے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا۔

دس محرم ۶۱ ھ کو حسین ابن علی سبط رسول □ پر ابن زیاد کی فوجوں نے چڑھائی کردی اور اس کے کثیر لشکر کے مقابلے میں حسینی فوج کی ستّر بہتّر ہستیوں نے جن میں کمسن بچے، سن رسیدہ بوڑھے بھی تھے دادِ شجاعت لے کر اپنی جان قربان کردی اور عصر کے وقت وہ مظلوم بھائیوں، بھتیجوں کے داغ اٹھا کر اور ہزاروں زخم کھا کر زیر خنجر شہید ہوگئے اور شمر نے اس مظلوم نواسۂ رسول □ کے سر کو جسم سے جدا کردیا۔

یہ ہے واقعہ کربلا کی وہ تاریخی حیثیت جو سطحی نظروں سے دیکھنے میں چند سطور کے اندر ختم ہوجاتی ہے ۔لیکن کیا زمین کربلا کے واقعے کی حیثیت صرف اتنی ہی ہے؟ کیا وہ صرف چند گھنٹوں کی لڑائی اور ظالم اور مظلوم کی فتح وشکست کا نام ہے۔نہیں ہرگز نہیں اس واقعہ کو انہی دلگداز نمایاں پہلوؤں کا مجموعہ سمجھنا حقائق کے ساتھ صریح ناانصافی اور واقعات کی اہمیت سے کھلی ہوئی بے اعتنائی ہے۔

کربلا کا واقعہ رزم بزم یا سوز وگداز کے تاثیرات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی کمالات کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں اور نفسیانی امتیازات کے جو بھی اسرار ممکن ہیں ان سب کا خزینہ دار ہے۔

علم تہذیب الاخلاق کا بڑے سے بڑا ماہر اور قانون تمدن ومعاشرت کا کامل ترین عالم ان واقعات سے اسی طرح سبق حاصل کرسکتا ہے جس طرح حقائق لاہوت کا بڑا محقق اور فلسفہ شریعت واحکام کا فقیہ متبحر۔

حسینؑ اور ان کے انصار نے روز عاشورہ صبح سے لے کر عصر تک کی قلیل مدت میں وہ کام کیا ہے جس کی نظیر عالم میں نہ ان سے قبل ممکن ہوئی اور نہ ان کے بعد ہوسکتی ہے۔ کہنے کوتو وہ صرف اپنے جسموں کو مخالف فوج کی خون آشام تلواروں کی نذر کرکے اپنی جانیں نثار کررہے تھے لیکن حقیقتاً انہوں نے عالم انسانیت کو مسخر کرلیا اور دنیائے علم وعمل دونوں پر قیامت تک کے لئے سکہ قائم کرگئے۔ انہوں نے اس دن زندگی کے ہر شعبہ کی تکمیل کی اور کمال انسانیت کا کوئی باب ایسا نہیں ہے، جس کا نمونہ پیش نہ کیا ہو۔

علم اخلاق کی جامع ترین کتابوں کا مطالعہ کرجایئے۔علم النفس کے حقائق واسرار کی کسی مسلم استاد سے تعلیم حاصل کرلیجئے۔ اجتماعی ومعاشرتی آداب اور انسانی فضائل کی مشق پورے معیار ترقی پر پہنچا کر اور معرفت الٰہیہ وحقائق اسرار توحید کا پورے طور پر احاطہ کرلیجئے اور اس کے بعد ذرا کربلا اس کی چند گھنٹہ کی مختصر مدت کا ایک محققانہ نظر سے جائزہ لیجئے۔آپ کو وہاں وہ سب مل جائے گا جو ان تمام کمالات کا ماحصل اور نتیجہ کہا جاسکتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ سنا تھا وہ لفظیں تھیں اور ان کے معنیٰ یہ ہیں:

سیّدالشہداء اور ان کے جانباز سپاہیوں کا ہر طرز عمل اس دن ایک اسرار ورموز کا خزانہ تھا کہ جس میں اخلاقی ،تمدنی ،معاشرتی ، اجتماعی ،نفسانی خصوصیات وکمالات کے نہ معلوم کتنے پہلو مضمر تھے، ان کے کسی ایک فعل کو سامنے رکھ کر علم النفس کے مشکل سے مشکل مسائل حل کیے جاسکتے اور بلندترین انسانی کمالات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ثبات قدم، استقلال ، خودداری ، صدق وامانت ، صفائی واخلاص، صبر وضبط ،حق پرستی وحق پروری، عدل وانصاف ، رحم ومروت ، جذبۂ مذہب ، پابندی شریعت، سخت ترین وقت پر عبد ومعبود کے مخصوص روابط کی نگہداشت توکل وتحمل ،نوع بشر کی خیرخواہی مواسات وہمدردی ،عفو وکرم ،سخاوت وشجاعت اپنے مقدس اور سچے نصب العین کی آخری وقت تک

حمایت، اتمام حجت، موعظہ ونصیحت، تبلیغ ودعوت، نفس کشی، بلند حوصلگی، اعلیٰ ہمتی، اگر صرف چند حرفی لفظوں کا نام نہیں بلکہ ہر ایک ان میں سے فلسفہ اخلاق یا علم النفس، حقائق الٰہیہ یا اسرار شریعت کا ایک مستقل اور مفصل ومبسوط باب ہے تو یقینا کربلا کے واقعات مختصر نہیں بلکہ بہت طولانی ہیں اور اگر ان کے نتائج واسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو وہ یقینا چند صفحوں میں لکھنے کے نہیں بلکہ کتابوں کی کتابیں ان کے لئے لازم ہیں۔

تاریخی واقعات کو فلسفی نگاہ سے دیکھ کر ان کے علل واسباب سے بحث کرنے کے لئے ذرا دائرہ بحث کو وسیع کرنے اور مقصد کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جس قدر واقعہ کی اہمیت زیادہ ہوگی اور اس کے مقدمات وعلل کی حلقہ در حلقہ زنجیریں دور تک گئی ہوئی ہوں گی اتنی ہی ایک محقق کو بیان کی مسافت زیادہ طے کرنی پڑے گی۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس منبع اصلی کا پتہ لگائے، جس سے اس واقعہ کے گوناگوں خصوصیات کا تعلق ہے اور سلسلہ کی پہلی کڑی کو دریافت کرے جس پر اس پوری زنجیر کا دارومدار ہے۔

واقعہ کربلا اس حیثیت سے عالم کا عظیم واہم ترین واقعہ ہے کہ اس کے اسباب وعلل کی کڑیاں سال دو سال، دس بیس سال نہیں سال نہیں بلکہ سو دو سو برس کے واقعات کا نتیجہ ہیں۔ اسلامی تاریخوں میں یہ سب واقعات منتشر طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کو ترتیب دے کر فرع کو اصل کے ساتھ اور معلول کو علت کے ساتھ ملحق کرنے کی کوشش سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

وہ وقت کہ جب ہاشم اور امیہ میں عبد مناف کے انتقال کے بعد نزاع ہوئی اور فیصلہ ہاشم کے حق میں امیہ کے خلاف ہوا۔ اسی زمانہ سے عداوت وعناد کی آگ تھی جو امیہ کے دل میں مجبوری ولاچاری کے پردہ میں سلگ رہی تھی اور وہی وراثت اولاد تک پہنچی۔ دشمنی اور عداوت کی آگ مشتعل ہوتے ہوئے کسی ایک فریق کی ظاہری ترقی اور رفعت وبلندی دوسرے فریق کے لئے گرتی ہوئی بجلی کا کام کردیا کرتی ہے۔

بنی امیہ کے لئے ہاشمی خاندان کی وہ عزت ووجاہت جو ملک عرب میں پائی جاتی تھی، بھڑکتی ہوئی آگ سے کچھ کم نہ تھی کیوں کہ خالق کائنات نے اپنی خدائی کے مختار کل اور دنیا وآخرت کے عظیم فرمانروا، سرور کائنات، نبی آخرالزماںؐ کی ولادت کے لئے ہاشمی خاندان کو منتخب کیا۔

رسالت کی تحریک کی روز افزوں ترقی اور اس کے آخری نتیجہ کو بنی امیہ کے بزرگ خاندان

ابوسفیان کی نظریں پہلے ہی روز سے تاڑ گئی تھیں، اسی وجہ سے اس نے اپنے راحت وآرام سے ہاتھ دھوکر پوری قوت کے ساتھ رسالت کی اسلامی تحریک کے مقابلہ کی ضرورت سمجھی اور تمام قبائل عرب میں دورہ کر کے ان سب کو آنے والے خطرات سے آگاہ کردیا اور ان کی ہمدردی کو اپنے لئے حاصل کرلیا۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ اسلامی ترقی کسی ظاہری سازوسامان یا خارجی طاقت وقوت کا نام نہیں ہے، بلکہ روحانی قوت کا نتیجہ ہے۔ اسلامی ترقی کا زور روکنے کے لئے اس کی تمام فوجی طاقتیں، اپنے سازوسامان سمیت ایسی ثابت ہورہی تھیں کہ جیسے سیلاب کے زور کو ہتھیلی سے روکا جائے یا آفتاب کے طلوع ہوتے وقت نقطۂ نظر مشرق کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جائے جبکہ چند ہی منٹ میں آفتاب کی روشنی بڑھ کر اس پردہ کے چاروں طرف محیط ہوجائے گی۔

بدرواحد اوراحزاب، پھر صلح حدیبیہ اور اس کے بعد کے واقعات ہرمرتبہ جان توڑ کوشش اور نتیجہ میں ناکامی سب کے آخر میں بہ مجبوری سرتسلیم خم کرنے کی ضرورت پڑنا اور دل کی تمام تلاطم خیز عداوتوں کے باوجود اپنے تمام سرمایۂ حیات، عزت وآبروکودشمن (رسالت مآبؐ) کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا، یہ واقعات ایسے نہ تھے جو دل کی آگ کو خاموش ہوجانے دیں۔ یہ تمام تابڑتوڑ واقعات اس آگ کے لئے چھینٹوں کا کام دے رہے تھے، لیکن پانی کے چھینٹے نہیں بلکہ مٹی کے تیل کے چھینٹے۔ رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد اس میں پوری ترقی پیدا ہونا ناگزیر تھی۔ خلافت کے دوسرے تیسرے دور میں اس جماعت کا برسرحکومت آنااور پھر ایک مرتبہ ورق کے منقلب ہوتے ہوئے اس تخت پر بنی ہاشم کی سربرآوردہ تاریخی ہستی امیر المومنینؑ کا آجانااور صفین کا میدان ظاہری معاہدہ اور اس کی خلاف ورزی، علیؑ ابن طالبؑ کی اولاد سے جو ہمیشہ اس کے مبلغ تھے باطل کوش حکومت وسلطنت کو ہمیشہ خطرہ کااحساس ہونا، ان تمام کا نتیجہ وہ تھا جو کربلا میں بنی امیہ کے ہاتھوں خاندان رسالت کے ظاہری خاتمہ تک منتہی ہوا۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ جس کو وہ خاتمہ سمجھ رہے ہیں وہ اس خاندان کے حقیقی فروغ کا پہلا دن ہے اور جس کو اپنی فتح خیال کرکے خوش ہو رہے ہیں ہو ان کے فنا کی مرگ آمیز تمہید ہے۔ واقعات نے ثابت کردیا کہ حسینؑ کے خون کا ہر قطرہ اہل بیت رسولؐ کی مقدس تحریک کے لئے حیات تازہ اور اموی خاندان کی حکومت، ثروت بلکہ ان کی زندگی کے لئے بجلی کا حکم رکھتا تھا۔ ہمارے مذکورہ بیان کا ہر جملہ صرف چند کلموں کا نام نہیں بلکہ مفصل اور طویل واقعات کا اجمالی رمز اور اشارہ ہے۔

انسان کو بیدار پیمبرؐ نے کیا
اور ذہن کو جلوہ زار حیدرؑ نے کیا
تئیس برس جس میں محمد□ کو لگے
اک دن میں وہی کام بہتّر نے کیا

راہ حق پر چلنے والے جانتے ہیں کہ نماز عشق کا وضو خون سے ہوتا ہے اور سب سے سچی گواہی خون کی گواہی ہے۔ تاریخ کے حافظے سے بڑے بڑے شہنشاہوں کا جاہ وجلال، شوکت وحشمت سب کچھ مٹ جاتا ہے لیکن شہید کے خون کی تابندگی کبھی ماند نہیں پڑتی ، بلکہ کبھی کبھی تو جب صدیاں کروٹیں لیتی ہیں اور تاریخ کسی نازک موڑ پر پہنچتی ہے تو خون کی سچائی پھر آواز دیتی ہے اور اس کی چمک میں پھر معنویت پیدا ہوجاتی ہے ۔۔۔۔۔لیکن یہ انوکھی آواز اسی وقت کانوں سے ٹکراتی ہے یا اس کربناک آواز کا خصوصی پیام اسی وقت مشعل راہ بنتا ہے جب قوموں کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔

پیکر صبر ورضا ، سید اہل وفا، نور دیدۂ مرتضیٰ ، شاہزادۂ بتول □، جگر گوشۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ مظلوم نے کربلا کے المناک اور وحشت ناک روز وشب میں اپنے قیمتی لہو سے عالم انسانیت کے لئے اسی شجر اسلام کی آبیاری کی تھی، جسے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے خاتم الانبیاءؐ نے قُولُوا لَاالٰہ اِلّااللّٰہ تُفلِحُوا کی بلند بانگ آواز کے ذریعہ عرب کے بے آب وگیاہ صحرا میں پہنچایا تھا۔ اسی اسلام کا حیات بخش نور پوری کائنات کو روشن ومنور کیے ہوئے ہے۔

ایک سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ آخر اسلام عالمی دین کیسے بن گیا؟ وہ کون سے اسباب وعلل ہیں جن کی بنیاد پر اسلام کا نور دنیا کے ہر گوشے اور خطّے میں اپنی ضوفشانی کررہا ہے۔؟

حالانکہ اگر ہم اسلام کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح آشکار ہوجاتی ہے کہ رسول خداؐ نے بے پناہ مصائب برداشت کرکے دین اسلام کی تبلیغ کی اور اپنا خون پسینہ لگا کر درخت اسلام کی آبیاری کی اور جب اسلام کے چمنستان میں بہار کے منظر دیکھنے کا وقت قریب آیا تو بنی امیہ کا کالا بادل کبھی معاویہ کی شکل میں ،کبھی یزید کی شکل میں گلشن اسلام پر منڈلانے لگا۔

ظلم وتشدد ،قتل وغارت گری،حقوق غصب کرنا اور بدفعلیوں سے تمام معاشرے کو پر کرنے کی کوشش کی جانے لگی تاکہ اسلام کی حقیقی تصویر مٹادی جائے اور اپنے مفادات کے مطابق دین کو چلایا جائے ،چنانچہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسلام کا اعلانیہ طور پر مذاق اڑایا جانے لگا کہ کوئی

رسول نہیں آیا کوئی وحی نہیں آئی، کوئی قرآن نہیں آیا، یہ محمدؐ کا اسلام ایک ڈھونگ تھا جو انہوں نے اس لئے رچا تھا کہ حکومت کو ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان میں باقی رکھ سکیں۔

اس قدر اسلام پر ظلم وستم ڈھایا گیا کہ اسلامی درباروں میں بندروں کا ناچ، شراب خوری، قمار بازی اور رقص وسرود کی محفلیں برپا ہونے لگیں، حلال محمدی کو حرام اور حرام محمد کو حلال قرار دیا جانے لگا، اسلام کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جن منبروں سے اسلام کی بقا وتبلیغ کے لئے خطبہ ومبلغین تقریریں کیا کرتے تھے ان منبروں کو آل رسولؐ پر سب وشتم سے مخصوص کردیا گیا، جس کے نتیجہ میں اسلام اپنی زندگی کی آخری سانسیں گننے لگا۔

ان تمام حالات اور بدفعلیوں کا محرک یزید پلید تھا اس نے دیکھا کہ حقیقی اسلام فنا کی آخری منزلوں پر ہے تو اس نے سوچا کیوں نہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرکے حقیقتاً اسلام کا قصہ تمام کردیا جائے اس لئے کہ حسینؑ پر غلبہ وتسلط ہی حقیقی اسلام کی فنا ہے۔

اپنے اسی ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یزید ملعون نے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا کیوں کہ امام حسینؑ روح اسلام تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی حقیقی اسلام کو مٹا نہیں سکتا تھا لیکن امام حسینؑ نے فاسق وفاجر کے مطالبہ بیعت کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ حق باطل سے مومن فاسق وفاجر سے اور ہدایتوں کا چراغ گمراہیوں کی تاریکی سے کبھی بیعت نہیں کرسکتا اور اسی بات پر ثابت قدم رہنے کے لئے امام حسینؑ کو اپنے نانا کے وطن عزیز کو چھوڑ کر کربلا بسانا پڑا، جو اس وقت عراق میں نہر فرات کے کنارے ایک صحرائی میدانی علاقہ تھا، آج بڑا شہر ہے، جہاں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کا روضہ ہے۔ دنیا بھر سے زائرین امام کی زیارت کے لئے یہاں آتے ہیں۔

جس حقیقی اسلام کو یزید پلید نے فنا کرنے کا پورا بندوبست کردیا تھا اسی کو بچانے اور حیات ابدی عطا کرنے کے لئے امام حسینؑ یہ کہہ کر مدینہ سے کربلا کی طرف چلے ''اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الاِصْلَاحِ فِی اُمّۃِ جَدّیِ رَسُولِ اللہ'' کہ میں فقط اپنے جد کی امت کی اصلاح کے لئے نکل رہا ہوں تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دے سکوں۔ امام حسینؑ کا یہ جملہ بتارہا ہے کہ یزید نے امت مسلمہ کو برائیوں کی گہری کھائی میں گرادیا تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سارے راستے مسدود ہوگئے تھے اس لیے کہ جن منبروں سے اسلام کی تبلیغ واشاعت ہوتی تھی اسی سے اسلام اور آل رسولؐ کی توہین کی جارہی تھی۔

امام حسینؑ تاریخ کے اس اہم وحساس موڑ پر اسلام کے مسلم اصولوں کو پامال ہوتے، بدعتوں کو عام ہوتے اور فسادات کو ترویج پاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے کیوں کہ آپ الٰہی نمائندوں کی حیثیت سے خود کو بنی امیہ سے مقابلہ کرنے کا ذمہ دار سمجھتے تھے، اسی لیے آپ ان ظالموں کے شر وفساد کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے اعزّاء واقربا کے ہمراہ میدان کربلا میں آگئے۔

وہ کربلا، جس نے بقائے اسلام میں اہم کردار ادا کیا ہے، جہاں حق وباطل کے درمیان ایسی فیصلہ کن جنگ ہوئی کہ آج تک تاریخ کے اوراق میں باطل کا منہ کالا ہے اور حق اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ افق تاریخ پر درخشاں ہے۔

اگر واقعہ کربلا رونما نہ ہوا ہوتا تو آج حق وباطل کی شناخت قطعی مشکل ہوجاتی اس لئے یزیدیت نے اسلام کو اپنے تئیں پیش کرنا شروع کردیا تھا، جس میں حلال محمدی پوری طرح حرام تھا، شراب خوری، قمار بازی، جھوٹ، کذب وافترا اور ناچ گانے جیسے محرمات کو حلیت کا لباس پہنا کر بھولی بھالی عوام کو گمراہ کیا جارہا تھا، یہاں تک کہ ان کی سازشیں بہت حد تک کامیاب بھی ہوتی جارہی تھیں۔ ایسے پر آشوب ماحول میں امام حسینؑ نے اٹھ کر کربلا کے میدان میں ان ساری خفیہ سازشوں کا راز فاش کردیا۔

اگر ایک کم عقل انسان بھی واقعہ کربلا پر غور وفکر کرے تو وہ سمجھ لے گا کہ یزید جس اسلام کو پیش کررہا تھا وہ حقیقی اسلام نہیں تھا بلکہ حقیقی اسلام کے لباس میں مذہب شیطان تھا۔ حقیقی اسلام تو وہ ہے جسے امام حسینؑ نے یزیدیت کے ہتھکنڈے سے چھڑا کر قیامت تک کے لئے آزاد اور دنیاوالوں کے حوالے کیا ہے۔

نہایت منفرد اور مخصوص انداز سے امام حسینؑ نے اپنا اور اپنے اعزّاء واقربا کا خون بہا کر اسلام کو آب حیات سے سینچا ہے۔

آج اسلام عالمی دین کیسے بن گیا؟۔۔۔۔ یہ امام حسینؑ کی بے پناہ محنتوں اور راہ خدا میں دی گئی ان قربانیوں کا صلہ ہے جو حق وباطل کے درمیان ایک حد فاصل بن کر افق تاریخ پر درخشاں اور پشت پناہ اسلام ہیں، امام حسینؑ نے اسلام کو بچا کر حیات ابدی سے نوازنے اور عالمی دین بنانے کے لئے یہ قربانیاں بارگاہ الٰہی میں کس انداز میں پیش کیں کہ جب یزیدیت نے اسلام کے بازو کاٹنے چاہے تو امام حسینؑ نے اسے بچانے کے لئے اپنے بھائی عباسؑ کا بازو قربان کردیا، جب

یزیدیت نے اسلام کے سینہ میں خنجر گھونپنا چاہاتو امام حسینؑ نے اسے بچانے کے لئے جوان بیٹے کا سینہ پیش کردیا، جب یزیدیت نے اسلام کے گلے کو چھید نا چاہاتو امام حسینؑ نے اپنے شیر خوار بچے کا گلا پیش کرکے اسلام کو بچایا، جب یزیدیت نے اسلام کے جسم کو پامال کرنا چاہا تو امام حسینؑ نے اپنے بھائی امام حسنؑ کی آخری نشانی قاسمؑ کے جسم کو پامال ہونے دیا لیکن اسلام کو بچا لیا اور آخری منزل پر جب یزیدیت نے اسلام کا سر کاٹنا چاہاتو اس وقت حسینؑ نے اپنا سر پشت سے کٹا کر اسلام کو ہر قسم کی صعوبات ومشکلات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا اور اپنے خون سے شجر اسلام کی اس طرح آبیاری کی کہ اب قیامت تک باطل کا کوئی طوفان اس کی جڑوں کو متزلزل نہیں کرسکتا۔

اگر اسلام میں واقعہ کربلا رونما نہ ہوتا تو آج ہم جس اسلام کی پیروی کررہے ہیں۔ اس کا نام ونشان تک مٹ جاتا اس لئے کہ رسول اسلامؐ نے ''قُولُوا لاَاِلٰہ الاَّاللّٰہ تُفْلِحُوا'' کی صداؤں کے ذریعہ جس اسلام کا آغاز فرمایا تھا وہ اسلام کربلا میں نیستی ونابودی کی آخری منزلیں طے کررہا تھا۔

لیکن اسی کربلا میں حق نے باطل کو، ہدایت نے گمراہی کو، نور نے ظلمت کو، صداقت نے کذب کو امام حسینؑ نے یزید پلید کو اس طرح اپنے قدموں تلے کچل ڈالا کہ آج تک کسی یزیدی نے اسلام کے سامنے سر بلند کرنے کی جرأت نہیں کی اور کوئی ایسی تاریخ نظر نہیں آئی جس میں کھلے عام حلال محمدی کو حرام اور حرام محمدی کو حلال قرار دیا گیا ہو۔

آج اسلام اپنی حیات جاودانی اور تمام تر حقیقتوں کے ہمراہ افق کائنات پر درخشاں ہوکر اس کے ہر گوشے وخطے میں اپنے نور کی ضوفشانی کرتا ہوا نظر آرہاہے یہ اصل میں کربلا اور شہادت امام حسینؑ کا صدقہ ہے اور آہستہ آہستہ مذہب اسلام کی عالمگیر مقبولیت کی زمین ہموار ہوتی جارہی ہے۔

حسینؑ مظلوم کی شہادت کے خون کی سرخی نے واقعہ کربلا کے دامن پر وہ نقش ونقوش چھوڑے ہیں جس کی سرخی نے تاریخ کی ہر جنگ کی رونق چھین کر لوگوں کے ذہنوں سے ہر معرکہ جنگ کو محو کردیا، صرف یہی نہیں بلکہ واقعہ کربلا نے اپنی مظلومیت وحقانیت کی مہر دل ودماغ پر ثبت کردی ہے۔ یہاں تک کہ امام حسینؑ کی مظلومانہ شہادت نے انسانیت کے دل ودماغ پر ایسا اثر چھوڑا ہے کہ ہر مورخ کا قلم بڑی سنجیدگی کے ساتھ حسینیت زندہ باد اور یزیدیت مردہ باد کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔

☆☆☆

حسینی انقلاب کے اسباب وعوامل

مولانا سید کوثر مجتبیٰ نقوی

حسینی انقلاب ایک ایسا آفاقی کرشمہ ہے جس کے بنیادی اسباب وعوامل اس کے اعلیٰ مقاصد کی عکاسی کرتے ہیں ظاہر سی بات ہے کہ ایک معصوم جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کے پس منظر میں وہ علل واسباب ہوتے ہیں جو دوامی وفلاحی مقاصد کو بروئے کار لاتے ہیں۔حسینی انقلاب

کے بنیاد اغراض ومقاصد کی وضاحت کے لئے حسین مظلوم کا وہ جملہ کافی ہے جو انہوں نے مدینہ سے چلتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ

میں نے اپنی ہوا وہوس کی تکمیل اور کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لئے قیام نہیں کیا ہے میرا مقصد ظلم و فساد بھی نہیں ہے میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ میرا مقصد امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے اگر کوئی میری دعوت کو قبول نہ کرے تو میں صبر وتحمل سے کام لوں گا تا کہ خدا میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کردے اور اگر کوئی میری اس دعوت کو حق ہونے کی بنا پر قبول کرتا ہے تو خدا ہمیشہ سے حق کا مددگار رہا ہے۔''ا؎

آپ نے اس انقلاب کی بنیاد امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر رکھی اور اپنی شرعی ذمہ داری کے تحت اس انقلاب عظیم کا عزم مصمم کیا۔ وہ مراحل جو آپ کے پیش نظر تھے ان کا تقاضہ بھی یہی تھا اور معصوم سے بہتر اپنے تقاضوں سے واقفیت رکھنے والا کوئی نہیں ہوسکتا۔ آپ کے لئے ایک طرف تو بنی امیہ کی حکومت تھی جو ظلم وجور، فساد وانتشار نیز تمام برائیوں کا مجموعہ تھی تو دوسری طرف اسلامی معاشرہ کی زبوں حالی، مسلمانوں کی ذلت وپستی ومحرومیت تھی۔ ایسے نامساعد حالات میں بھی ذاتی اعتبار سے حسین مظلوم کو ہر طرح کی مقبولیت حاصل تھی لیکن انہیں اپنی نہیں بلکہ اپنے نانا کی امت کی فکر دامن گیر تھی اور اسلامی معاشرہ کی ہدایت ورہنمائی ان کا فرض منصبی بھی تھا چنانچہ وہ اپنے عظیم انقلاب کے اسباب وعوامل کی جگہ جگہ وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو درج ذیل عناوین کے حامل ہیں:

۱۔حکومت کا نحراف
۲۔دینی اقدار کی پامالی
۳۔عوامل کا استحصال

یہ تھے علل واسباب انقلاب حسینی، جن کے تحت اسلام کے تحفظ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوکر آپ نے اکھتّر جانثاروں کے ساتھ کربلا کے ریگ گرم پر قربانی پیش کی۔ امام حسینؑ کیا بلکہ ہر معصوم کے اقدام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا ہر عمل اجتماعیت کی عکاسی اور فلاح وبہبودی کے بہترین عناصر سے مملو نظر آتا ہے پس انقلاب حسینی کے اسباب وعوامل بھی اجتماعی حیثیت

سے خالی نہیں ہے جیسا کہ آپ کے ارشاد سے بھی واضح ہے کہ ''میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے قیام کررہاہوں۔'' یعنی یہ انقلاب کسی ذاتی مفاد یاذاتی اغراض ومقاصد پر منحصر نہیں بلکہ اس میں اجتماعی عناصر کی شمولیت ہے کیونکہ دوسری طرف تو اموی حکومت ظلم وستم کے ساتھ ہر ناجائز امور کو انجام دینے پر تلی ہوئی تھی۔ ہمہ سو فساد وخلفشار کی یلغار تھی اور وہ مظالم روا تھے کہ جن کو پڑھ یا سن کر روح لرزہ براندام ہوتی ہے۔مخالفین کا قلع قمع کیاجانا اورحق وحقانیت پر باطل کی نقاب ڈال کر باطل پرستی کو رواج دینا ان مفاسد کی نابودی کے لئے ہی حسینی انقلاب رونما ہوا۔ جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا اور اس میں بھی اس احتیاط کوملحوظ خاطر رکھا کہ رسول خدا□ سے اپنی نسبت یا اپنی ذاتی عظمت وشرافت کا کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ آپ نے حق وحقانیت کو معیار نصرت واعانت بنایا اورفرمایا جو مجھے حق کی خاطر قبول کرتاہےتو خدا ہمیشہ سےحق کا مددگار ہے۔

امام حسینؑ کے مدینہ سے کربلا تک کے خطبات حسینی انقلاب کے اسباب وعوامل کو واضح وآشکار کررہے ہیں۔ آپ اپنے قیام کے مقصد کو واضح کرکے اپنی حجت تمام کررہے تھے جیسا کہ حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد سے خطاب کرتے ہوئے '' آپ نے کہاکہ میرے نانا نے ارشاد فرمایا ہے۔حر ابن یزید ریاحی کےلشکر سے فرمایا۔ اگرکوئی ظالم حکمراں محرمات الٰہی کو حلال کرتاہے، خدا کے عہد کوتوڑتاہے سنت رسولؐ کی مخالفت کرتاہے اور اللہ کے بندوں پر زیادتی کرتاہےتو اپنی آواز یا اپنے اعمال سے ظالم کی مخالفت نہ کرنے والا بھی اسی ظالم کی طرح مستحق عذاب ہے۔'' لوگو! انہوں (بنی امیہ) نے شیطان کی اطاعت کرکے رحمن کی اطاعت چھوڑ دی ہے فتنہ وفساد برپا کیا ہے اور اسلامی حدود وتعزیرات کومعطل کردیا ہے۔ ان لوگوں نے بیت المال کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اللہ کی شریعت کے حلال کوحرام اورحرام کو حلال قرار دیا ہے اسلامی حکومت کی سربراہی کے لئے میں ایسے لوگوں سے زیادہ سزاوار ہوں اور میرے پاس تمہارے خطوط آئے ہیں اور بیعت کا پیغام تمہارے نمائندے لے کر آئے ہیں اورتم نے یہ عہد کیا ہے کہ تم مجھ سے ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے اورعہد شکنی نہیں کروگے اگرتم نے اس کو پورا کردیا تو ہدایت پاؤ گے کیونکہ میں حسینؑ ابن علیؑ ہوں۔ اور رسول خدا□ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہوں میں خودتمہارے دکھ درد میں شریک رہوں گا اور میرے اہلبیتؑ تمہارے بال بچوں کے ساتھ ہوں گے۔ اگرتم نے بیعت شکنی کی ہےتو مجھے اپنی زندگی کی قسم! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔تم نے میرے پدربزرگوار اور میرے بھائی اور میرے ابن عم'' مسلم ابن

عقیل'' کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے اس شخص نے دھوکہ کھایا جس نے تمہارے وعدوں پر اعتماد کیا۔تم نے اپنے آپ کو بد بخت بنالیا۔تمہاری تقدیر ہی بری ہے جو عہدشکنی کرتا ہے اس کی سزاوہ خود ہی پائے گا۔'' ۲؎

اس بیان کی روشنی میں حسینی انقلاب کے اسباب وعوامل کی مکمل وضاحت ہوجاتی ہے کہ اصلاح امت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے علاوہ ان کا اور کوئی مقصد نہ تھا جس کے خاطر انہوں نے مدینہ چھوڑا۔ کیونکہ آپ واقف تھے کہ لوگ ظالم وجابر حکومت کے ردعمل اور اس کے انجام کے خوف میں کبھی بھی حق کی آواز بلند کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتے ورنہ وہ ہرشی سے محروم یا ملک بدرکردئے جائیں گے۔حکومت باطل کی معمولی سی مخالفت جان پر بن آنے کے مترادف ہوتی تھی اسی لئے آپ نے اپنے خطبہ میں یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اور میرے خاندان والے تمہارے بال بچوں کے ساتھ ہر دکھ درد میں شریک ہیں۔ ایسے حالات میں امام حسینؑ کے لئے انقلاب برپا کرنا ازحد لازمی وضروری ہوگیا تھا ورنہ اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا۔

اس کے علاوہ کربلا کے میدان میں لشکر یزیدی کے خلاف نبرد آزمائی کے دوران انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس سے بھی حسینی انقلاب کے مقصد کی وضاحت ہوجاتی ہے۔آپ اپنے گھوڑے پر سوار تھے اور دشمنوں کو خاموش رہنے کے لئے حکم دیا مگر وہ خاموش نہ ہوئے تو آپ نے فرمایا۔

''وائے ہوتم پر کہ تم خاموش نہیں ہوتے اور میری بات نہیں سنتے میں تم کو ہدایت کی طرف بلارہاہوں جو میری اطاعت کرے گا وہ ہدایت یافتہ لوگوں میں شمار ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک شدگان میں شامل ہوگا۔تمہیں کیاہوگیا ہے کہ تم سب نے میری اطاعت چھوڑدی ہے اور میری باتیں سننے کے لئے آمادہ نہیں ہو۔تمہارے شکم حرام لقموں سے پُر ہیں اورتمہارے دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔ افسوس ہےتم پر! تم خاموش نہیں ہوتے اور میری بات نہیں سنتے۔ یہ سن کرعمر ابن سعد کے لشکر والے آپس میں ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ دیکھوحسینؑ کیا کہہ رہے ہیں''۔

اس وقت امام حسینؑ نے خدا کی حمد وثنا بجالانے اور محمد □ وفرشتوں اور انبیاء ورسل پر درود بھیجنے کے بعد فرمایا۔ اے لوگو! خداتمہیں ہلاک کردے کیا تم نے میری طرف استغاثہ نہیں کیا

اور مجھے اپنی مدد کے لئے نہیں بلایا؟ اب جبکہ میں تمہاری فریاد کو پہونچ گیا ہوں تو تم نے تلواروں کے ساتھ ہمارا مقابلہ کیا اور اس آگ کا رخ تم نے ہماری طرف پھیر دیا جو ہم نے خود تمہارے اور اپنے مشترکہ دشمن کے لئے جلائی تھی۔ اور اب تم خود اپنے لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہو اور اپنی ہی مرضی سے اپنے دوستوں کی مخالفت میں اپنے دشمنوں کے ساتھ مل گئے ہو جو تمہارے ساتھ ایسے عدل وانصاف سے پیش نہیں آئے کہ تم ان کے عدل وانصاف پر فریفتہ ہوجاؤ اور نہ آئندہ کسی بہتری کی ان سے کوئی امید ہے۔

تم تو صرف اس لئے میرے خلاف لڑ رہے ہو کہ تمہیں بنی امیہ نے دنیا کے حرام مال کا ایک معمولی حصہ دے دیا تاکہ تم ذلت کی زندگی بسر کرو حالانکہ میں نے کوئی چھوٹا گناہ بھی نہیں کیا۔ وائے ہو تم پر کہ تم نے ہم سے دوری اختیار کی اور ہم کو چھوڑ دیا تم نے اس وقت فتنہ کی آگ بھڑکائی اور ٹڈی دل کی طرح ہر جگہ سے اٹھ کر جمع ہوگئے اور مکھیوں کی طرح فتنہ وفساد پر اتحاد قائم کرلیا ہے جبکہ تلواریں اپنے نیام اور لوگوں کے دلوں میں آرام اور فکر میں سکون تھا۔ تمہارے سروں پر خاک ہو، اے غلامی کی زندگی بسر کرنے والو! اے کجروی کرنے والو! کتاب خدا کو ترک کرنے والو! شیطان سے دھوکہ کھانے والو! اللہ کی نافرمانی پر اتحاد کرنے والو! کتاب خدا میں تحریف کرنے والو! اور چراغ شریعت کو بجھانے والو! اور اولاد انبیاء کے قاتلو! اوصیاء وعترت کو نابود کرنے کی کوشش کرنے والو! ناجائز بچوں کو اپنے نسب سے ملانے والو! مومنین کو آزار پہونچانے والو! انبیاء کا مذاق اڑانے اور کتاب خدا کو پارہ پارہ کرنے والوں کے ساتھیو!

تم نے کس قدر عظیم جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور ابدی عذاب مول لے لیا ہے۔ تم نے حرب کے بچے (معاویہ ابن ابی سفیان) کی مدد کی۔ اور ہم سے روگردانی کی۔ ہاں قسم بخدا یہ عہد شکنی تمہارا شعار ہے آب بیوفائی سے تمہاری جڑیں سیراب ہوئی ہیں اور تمہاری شاخوں کو قوت ملی ہے اور تمہارے دل عہد شکنی کے ساتھ مضبوط ہیں اور تمہارا سینہ ان چیزوں سے بھر چکا ہے۔ تم وہ خبیث ترین پھل ہو جو ہر غاصب کا لقمہ بنتا ہے اور تم ہر دیکھنے والے کے لئے دکھ بن گئے ہو۔ خدا کی لعنت ہے ان لوگوں پر جو عہد وپیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ تم نے اس بیعت پر خدا کو گواہ بنایا تھا۔ ولد الزنا ابن ولد الزنا نے مجھے قتل اور ذلت کے درمیان لاکھڑا کیا ہے مگر ذلت وخواری ہم سے کوسوں دور ہے، خدا رسولؐ اور مومنین ہماری ذلت پر راضی نہیں ہوں گے ہمارا پاکیزہ خاندان،

عزت نفس، بلند ہمتی اور پاکیزہ تربیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں عزت کی موت پر کمینوں کی اطاعت کو ترجیح دوں۔

لوگو ! جو کچھ مجھے کہنا چاہئے تھا میں نے کہہ دیا اور خوف خدا یاد دلا دیا اب میں اپنے خاندان کے ہمراہ دوستوں کی قلت، دشمنوں کی کثرت اور یارومددگار نہ ہونے کے باوجود جہاد کے لئے آمادہ ہوں پھر آپ نے اس طرح اشعار پڑھے۔

فان نهزم فهزامون قدما وان نغلب فغير مغلبينا

اگر ہم دشمنوں کو شکست دیں تو یہ ہمارا شیوہ ہے کہ ہم ہمیشہ دشمنوں کو شکست دیتے رہے ہیں اور اگر ہم بظاہر ناکام ہوئے تو ہم حقیقت میں ناکام نہیں ہیں۔

وما ان طبنا جبن ولكن منايانا ودوله آخرينا۔

خوف وترس ہمارے نزدیک نہیں آتا اور جب تک ہم زندہ ہیں ظالموں کو حکومت نہیں کرنے دیں گے البتہ وہ ہماری موت کے بعد ہی حکومت کریں گے۔

اذاما الموت رفع عن اناس كلاكله اناخ بآخرينا

موت جب اپنے چنگل سے کچھ لوگوں کو اٹھالیتی ہے تو دوسروں کے سینوں میں پیوست کر دیتی ہے۔

فافنى ذلكم سروات قومى كما افنى القرون الغابرينا

موت نے میری قوم کے بزرگوں کو نگل لیا۔جس طرح گزشتہ صدیوں کو ختم کردیا

فلو خلد الملوک اذن خلدنا ولو بقى الكرام اذن بقينا

اگر دنیا کے شاہان زندہ رہے ہوتے تو ہم بھی زندہ رہتے اور اگر نیک لوگ باقی رہتے تو ہم بھی باقی رہتے۔

فقل للشامتين بنا افيقوا سيلقى الشامتون بما لقينا

ہمیں شماتت کرنے والوں کو بتادو کہ جس طرح موت آج ہمارے پاس آرہی ہے کل تمہارے پاس بھی آئے گی۔ ۳۔

علل واسباب انقلاب آپ کے اس خطبے سے کس قدر ظاہر ہورہے ہیں جس میں آپ نے عراق کے باشندوں سے ان کی غلط روش اور بدسلوکی کا شکوہ بھی کیا ہے اور ظاہر کیا کہ تم نے مجھ سے

طلب اعانت کے باوجود اپنے ہی دشمنوں کی معاونت کو قبول کرلیا۔ اللہ اللہ کس قدر بے حسی طاری ہوچکی تھی۔حق کو باطل کے غلاف میں روپوش کردیا تھا اور اپنی آنکھوں سے مروت کوختم کردیا تھا۔

علل واسباب انقلاب حسینی میں وہ تمام مسلمان بھی شامل ہیں جو اس وقت کے بدترین معاشرے کی اصلاح کی ضرورت امام عالی مقام کے ذریعہ محسوس کررہے تھے کیونکہ ان لوگوں نے بھی اس بات کومحسوس کیا جنہوں نے امام حسینؑ کوعراق آنے کے لئے خطوط تحریر کئے اور ان لوگوں نے بھی اس کا احساس کیا جو آپ کے ساتھ مصائب وآلام برداشت کرکے شہید ہوگئے۔ جن لوگوں نے آپ کوعراق آنے کے لئے خطوط لکھے وہ معدودے چندافراد نہ تھے بلکہ بعض مورخین کے مطابق اہل عراق نے امام حسینؑ کوعراق آنے کے لئے ۱۵۰ خطوط لکھے۔ ۴؎

بعض دوسرے مورخین نے بارہ ہزار خطوط تک کی تعداد لکھی ہے۔ اور اجتماعی پہلو کے پیش نظر یہ خطوط انفرادی نہیں تھے بلکہ اجتماعی تھے یعنی ہر ایک خط ایک دو سے لیکر دس افراد کی جانب سے تھا۔ ۵؎ لیکن ان تمام خطوط کے باوجود ان کی بے رخی قرآن کریم کی اس آیت کو یاد دلاتی ہے۔

''انّ اللّٰہ لایُغیر مَابقَوم حَتّیٰ یُغیر وامَابانفُسھم۔'' ۶؎

یعنی ''اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ اپنے باطن میں تبدیلی نہ لائیں۔'' اگر وہ اپنے باطن میں تبدیلی لاتے اور اس طرح کے اسباب وعوامل انقلاب پیدا نہ کرتے تو یہ اتنا بڑا معرکہ کیوں ہوتا۔لیکن علل واسباب انقلاب حسینی یہی تھے کہ مسلمان دین اسلام کو پائمال کرنے کے لئے تلے ہوئے تھے۔ اگر امام حسینؑ انقلاب کے لئے آمادہ نہ ہوتے اور یہ قربانیاں پیش نہ کرتے تو دین کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔

رہبر انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ خمینیؒ فرماتے ہیں۔

''اگر عاشورہ اور خاندان رسالت کی قربانی نہ ہوتی تو اس وقت کے طاغوت نبی اکرم □ کی بعثت اور ان کی جانفرسازحمتوں پر پانی پھیر چکے ہوتے۔ اگر عاشورہ نہ ہوتا تو ابوسفیانیوں کی جاہلیت کی منطق جو وحی اور کتاب خدا پر خط سرخ کھینچنا چاہتے تھے اور بت پرستی کے عصر تاریک کی یادگار یزید کے ذریعہ، جو اپنے زعم میں فرزندان وحی کوقتل وشہید کرکے اسلام کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کی امید رکھتا تھا اور پوری صراحت کے ساتھ (نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی ہے) کا اعلان کرکے ایسی حکومت کی بنیاد منہدم کرنے کی توقع رکھتا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ عاشورہ کے بغیر قرآن کریم اور

اسلام عزیز پر کیا بلا نازل ہوتی۔لیکن خداوند متعال کا ارادہ یہ تھا اور ہے کہ نجات بخشنے والے اسلام اور ہدایت کرنے والے قرآن کو ہمیشہ باقی رکھے اور فرزندان وحی جیسے شہیدوں کے خون سے زندہ کردے اور ان کی حمایت کرے اور ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رکھے اور اس ثمرہ نبوت ویادگار ولایت حسینؑ ابن علیؑ کو آمادہ کرے کہ وہ اپنے عقیدے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی امت پر اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان قربان کردیں تاکہ رہتی دنیا تک ان کا پاک خون ابل ابل کر دین خدا کی آبیاری اور وحی اور اس کے بہترین نتائج کی حفاظت کرتا رہے۔ے

یہی اسباب وعلل انقلاب ایران میں بھی رونما ہوئے کیونکہ انقلاب حسینی دنیا کے لئے ایک ایسا نمونہ ہوگیا کہ جب بھی یہ اسباب انقلاب سامنے آئیں تو دینداروں کو کربلا والوں کی طرح سرکٹانے اور قربانی دینے کے لئے بے دریغ اسی طرح آمادہ ہوجانا چاہئے انقلاب حسینی کومشعل راہ بنا کر انقلاب اسلامی ایران کو کامیابی وکامرانی کا درجہ نصیب ہوا جہاں بے راہ روی وبے دینی عام ہورہی تھی آج وہی ملک دنیاکے لئے دین کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ سب حسینی انقلاب اور اس کے اثرات کا طفیل ہے۔حضرت آیت اللہ خمینیؒ ودیگر آیات وعلماء نیز جانباز سرباز عوام نے کربلا کے اصول پر گامزن رہ کر وہ انقلاب برپا کیا جس سے کربلا کے مشن کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہ انقلاب اگرچہ ایک ملک تک محدود ہے اور اس انقلاب حسینی کا کہیں سے کہیں تک کوئی تقابل ممکن ہی نہیں لیکن علل واسباب انقلاب چونکہ مشترک ہیں اور یہ انقلاب اسلامی بھی ان جانبازوں کی قربانی سے مستفید ہوکر ہی برپاہوا تو اس لئے کربلا کی یادضروری ہوئی۔

عصر حاضر میں حسینی انقلاب کے اسباب وعلل کی جھلک محسوس ہورہی ہے۔ یزیدیت اپنا پرچم بلند کررہی ہے اور بے دینی کومصلحت یا ترقی پسند عناصر سے تعبیر کیا جارہا ہے اور مذہب حق وحقانیت کوقدامت پسندی سے تعبیر کیا جارہا ہے جو جتنا بڑا لامذہب ہے اتنا ترقی یافتہ تسلیم کیا جارہا ہے اور جو جتنا نیک ایماندار اور مذہبی ہے وہ اتنا ہی معاشرے سے ناواقف اور یک نوع بیوقوف متصور ہوتا ہے۔حدتو یہ ہے کہ اب ایمانداری ودینداری کے نام پر بھی بے دینی پائی جارہی ہے حالات وہی ہیں یعنی علل واسباب انقلاب حسینی آج پھر سے بام عروج پر ہیں۔خدا یا جلداز جلدامام حسینؑ زمانہ کا ظہورفرما کہ پھر ان ہی علل واسباب کے تحت دوبارہ انقلاب حسینی رونما ہوتا کہ دنیا عدل وانصاف سے بھرجائے اور چاروں طرف دین ایمان کا تذکرہ ہو۔لوگ اس طرح سے دیندار بنیں کہ جیسے کربلا

والے، کہ تیروں کی بارش میں نماز قائم ہورہی تھی۔ بھوک و پیاس کے باوجوداطاعت امام پر جان دی جارہی تھی زروجواہر کے وعدوں اور لالچ دئے جانے کے باوجود حق کے دامن سے وابستہ تھے اور جنت ودوزخ کے امتیاز کو واضح کرر ہے تھے۔

حوالے:

۱۔سوگنامہ آل محمد۔محمد محمدی اشتہاردی ، ۱۹۸

۲۔اعیان الشیعہ ، ج ۴ ،حصہ اول،ص ۲۹۔۲۲۸۔الطبری، ج ۴،ص ۳۴۔۳۵۔الکامل، ج ۳،ص۲۸۰

۳۔ اعیان الشیعہ ،حصہ اوّل ،ص ۱۵۵۔۱۶۰

۴۔الکامل، ج ۳،ص ۲۶۶۔۲۶۷

۵۔الطبری ،ج ۴ ،ص ۳۶۲

۶۔سورۂ رعد،آیت ۱۱

۷۔ پیام امام خمینیؒ ،مورخہ ۱۶/۳/۶۰ ھ ش

]ب[

مقصدِ پیغامِ کربلا

سید حمید الحسن زیدی

واقعہ کربلا اپنی انفرادیت ،آفاقیت، اثر اندازی اور کردار سازی میں بےمثل ونظیر ہے۔ تاریخ انسانی میں ہزاروں واقعات رونما ہوئے ہزاروں قربانیاں دی گئیں اور ہزاروں خون بہائے گئے لیکن کسی واقعہ کسی قربانی یا کسی خون نے ایسا اثر نہیں دکھا یا جیسا اثر واقعہ کربلا نے چھوڑا ہے۔ واقعہ

کربلا ہر درد مند دل کی آواز ہے ہر غم زدہ اور مصیبت کے مارے انسان کے لئے تسلی کا سامان ہے اس پورے واقعہ کی تجزیاتی حقیقت کو مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف پیاس، غربت، بیکسی، بے یاری و مددگاری لیکن صبر واستقامت، بردباری، ہمت، دلیری، بہادری، عبادت گزاری، عزم وحوصلہ، جوش و جذبہ، بندگان خدا کے حقوق کی رعایت اقربا سے محبت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اصحاب کے جذبہ وفاداری کی قدردانی مہمان نوازی کی اعلیٰ ترین مثال غرض کہ ہر انسان میں کمال کی اعلیٰ ترین مثال موجوداور کسی بھی بڑی سے بڑی مصیبت کے مقابلے میں کسی انسانی کمال کے سلسلے میں ذرہ برابر سمجھوتا نہیں ہے۔

دوسری طرف سیرابی، آوارگی، عیش و نوش، اور اس کے ساتھ ساتھ خدا سے بے خبری غیر خدا کے تیئں عجز و انکساری ،خودغرضی، مکاری ،عیاری، چاپلوسی، اقتدار کی بھوک، بے وفائی، بے دینی، بے لگامی، بدحواسی، بدکرداری غرض کہ ہر وہ خرابی جس پر انسانیت شرمسار ہو ایسے دومخالف گروہوں کے درمیان ٹکراؤ فطری ہے

کربلا کا مقصد دین اسلام کی حفاظت

یہاں پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کربلا میں ہونے والے حق وباطل کے اس ٹکراؤ کا کوئی مقصد ہے؟ یا یہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے؟

کربلا کے واقعہ اور اس کے پس منظر پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ اندازہ باآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ اتفاقی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے دونوں طرف سے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی حق کے نمائندے امام حسینؑ ، آدمؑ سے لیکر تمام انبیاء اور اپنے بزرگ ائمہ معصومینؑ کی وراثت میں دین خدا کے محافظ ہادی، رہنما اور امام معصوم تھے جن کا منصوبہ دین الٰہی کو ہر ممکنہ گزند سے [illegible]ط رکھ کر اس الٰہی امانت کو اس کی اصلی شکل میں پوری عالم انسانیت تک پہنچانا تھا لیکن شیطانی نمائندہ یزید بظاہر انسانی شکل میں شیطانی مقصد کے لئے اس دین کو ختم کرنا یا کم سے کم اس کی شکل کو بگاڑ نا چاہتا تھا تا کہ صحیح خدائی پیغام دنیا تک نہ پہنچ سکے۔

آدمؑ سے لیکر پیغمبر اسلام □ اور پھر پیغمبر اسلام □ سے لے کر باقی تمام ائمہ معصومینؑ کا بنیادی مقصد انسانی سماج کو دین الٰہی کا پابند بنانا تھا لیکن شیطان نے روز اول ہی سے فیصلہ کر لیا

تھا کہ نسل انسانی کو خدائی دین سے دور رکھ کر خدائی نعمتوں سے بہرہ مند نہیں ہونے دے گا اور حتیٰ الامکان اسے جنت کی پر کیف وادی کی سیر نہیں کرنے دے گا، لہٰذا اس نے پورا زور لگا کر انسانی شکل میں اپنا سراپا یزید کی صورت میں مجسم کر دیا اس کو پورا یقین تھا کہ اگر یزید اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا تو پھر پوری نسل انسانی میں صحیح دین الٰہی کا ماننے والا اور اس کی پابندی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا دیرینہ مقصد پورا ہو جائے گا اور آدمؑ کے سامنے اپنی رسوائی کا انتقام بھی ہو جائے گا۔

شیطان نے اس منصوبہ میں پوری نسل انسانی کے خبیثوں کی تاریخ کا جائزہ لے کر حتی الامکان تمام ممکنہ خباثتیں یزید منحوس کے ناپاک سراپا میں بھر دی تھیں گویا برائیاں پوری تمکنت کے ساتھ کمالات کے مقابلے میں ڈٹی ہوئی تھیں۔

کمال کے خاتمہ کے نتیجہ میں برائیوں کا بلا مقابلہ رواج یقینی تھا لیکن الٰہی نمائندہ نے اپنے تمام گذشتہ ہادیان دین و مذہب کے تمام مجموعی کمالات کا پیکر بن کر برائیوں کو ایسی شکست دی کہ شیطان کہیں منھ دکھانے کے لائق نہ رہ سکے یزیدیت کی شکل میں آنے والا شیطان حق کے نمائندہ سے ٹکرا کر اتنا ذلیل ہوا کہ اپنے اصلی وجود سے زیادہ اپنے انسانی وجود میں بدنام ہوگیا آج لفظ شیطان سے زیادہ لفظ یزید بدنام، ذلیل اور رسوا ہے۔

فرزند رسول □ نے واقعہ کربلا میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی قربانی پیش کر کے نسل انسانی پر وہ احسان کیا جس کا تصور بھی ناممکن تھا پورا سلسلۂ ہدایت انسانی نسل کو جس طرح دین خدا اور پیغام الٰہی سے روشناس کرانا چاہتا تھا کربلا کے بعد اس کے لئے راستہ ہموار ہوگیا تاریخ میں اس سے پہلے بھی اس مقصد کے لئے قربانیاں دی گئیں تھیں لیکن نہ اتنے وسیع پیمانے پر دین الٰہی کی دشمنی سامنے آئی تھی اور نہ اتنی عظیم اور جامع قربانی دی گئی تھی جس کے اثرات قیامت تک باقی رہیں۔ کربلا میں ہر سن و سال کی قربانی کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ کربلا کا پیغام اور اس کے اثر سے خدائی دین و مذہب کی پابندی ہر سن وسال کے شخص میں پائی جائے اور کوئی شخص کسی بھی عمر میں عمر کی کمی یا زیادتی کا بہانہ کر کے کربلا کے پیغام دینداری سے ذرہ برابر غفلت نہ برت سکے۔

کربلا ایک تسلسل ہے

کربلا ظلم کے خلاف جہاد ،بے دینی کے خلاف جنگ ،خدا سے غفلت کے خلاف لڑائی، غرض کہ ہر برائی کے خلاف ایک پیکار مسلسل ہے اور یہ تسلسل آج تقریباً چودہ سو سال سے اسی ذکر کربلا کے ذریعہ قائم ہے ۔

کربلا جس طرح برائیوں کے خلاف ایک مسلسل جہاد ہے اسی طرح نیکیوں کے انتخاب کے لئے بھی ایک مسلسل مہم ،یزید اور یزیدی برائیوں کے خلاف امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی جنگ جہاں یزیدیت سے نفرت اور بیزاری کا مطالبہ کرتی ہے وہیں حسینی کردار کو اپنانے کا درس عمل بھی دیتی ہے۔

جس طرح واقعہ کربلا نے اسلام اور اس کے پیغام کو ایک نئی حیات بخشی ہے اسی طرح کربلا کے ذکر اور اس کی یاد کو بھی اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں دخل انداز ہونا چاہئے ۔یعنی ذکر کربلا کے ساتھ اسلامی احکام و قوانین اور انسانی اقدار کو عملی طور پر نئی زندگی ملنی چاہئے جس طرح کربلا والوں کی زندگی اور ان کے جملہ اعمال و کردار اسلامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر تھے اسی طرح کربلا کی یاد منانے والوں کی بھی کوشش ہونی چاہئے کہ یاد مناتے وقت کربلا کے کرداروں کی طرح اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کریں۔

کربلا کے میدان پر فرزند رسول □ نے صدائے استغاثہ بلند کر کے نصرت اسلام کیلئے ہر باشعور دیندار انسان کو دعوت عمل دی تھی آج تقریباً چودہ صدیوں سے ساری دنیا کے عاشقان حسینؑ اس صدائے استغاثہ پر لبیک کہنے کے لئے بے تاب ہیں یہی وجہ ہے کہ یوں تو سال بھر،لیکن خاص طور پر محرم کے ایام میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی قربانی اور مظلومیت پر آنسو بہائے جاتے ہیں عاشقان حسینی کے یہ آنسو جہاں کربلا والوں کی مظلومیت پر بہتے ہیں وہیں اس مصیبت کی گھڑی میں آپ کی نصرت نہ کر پانے کی حسرت میں بھی۔

اکثر اوقات یہ حسرت ان کی زبان پر بھی آجاتی ہے ۔"**فَیالَیتَنی کُنتُ مَعَکُم فَافُوزَمَعکم**" [۱] ـ "کاش! آپ کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی کامیابی حاصل کرتے ،یہ حسرت بھرے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے دل میں کربلا کے اس عظیم کردار سے ہماہنگی پائی جاتی ہے جس نے اسلامی تعلیمات کو زندگی عطا کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی مصیبت اٹھائی"۔

ہمارے یہ الفاظ انشاء اللہ بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل کر لیں گے اور ہمارا حشر کربلا

والوں کے ساتھ ہوگا لیکن یہ الفاظ ہمیں اس بات کی دعوت بھی دیتے ہیں کہ ہم سوچیں کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا کردار کیا تھا اور الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کردار کو اپنانے کی عملی کوشش بھی کریں سر دست کربلا کے بعض ایسے اہم پیغامات پر توجہ دینا ہے جن پر عمل تحفظ اسلام کی ضمانت قرار پاسکتا ہے۔

تحفظ اسلام کے لئے کردار میں ہماہنگی کی کوشش ضروری ہے

امام حسینؑ امام معصوم اور جملہ فضائل وکمالات انسانی کا مجموعہ تھے تو آپ کے گرد اکٹھا ہونے والے آپ کے منتخب اصحاب و انصار بھی اس آفتاب فضائل و کمالات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے چاند اور ستارے تھے جنھوں نے نور امامت سے اس طرح کسب فیض کیا تھا کہ ہرایک اپنے وجود میں امام حسینؑ کی تصویر نظر آرہا تھا۔ ان پاکیزہ افراد نے صرف زبانی دعوائے نصرت نہیں کیا بلکہ عملی اقدامات میں سرکارسیدالشہداءؑ کا بھر پور ساتھ دیا۔ اور اس کیلئے کردار حسینی میں ڈھل جانا ضروری سمجھا۔

یہ حسینی کردار میں ڈھلنا ہی تھا کہ برستے ہوئے تیروں میں اس نماز کو یاد کیا جن کے بارے میں امام حسینؑ کا ارشاد ہے''اِنِّی اَحَبُّ الصَّلوٰہ'' ۲؎ میں نماز سے محبت کرتا ہوں۔

حسینی کردار سے ہماہنگی کی نہ جانے ایسی کتنی مثالیں ہیں جنہیں واقعات کربلا کے ضمن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ظلم سے نفرت ،گناہوں سے بیزاری اپنے مالک کے تئیں عجز و انکساری اپنے آقا کی اطاعت اور اس کی رضا کا مکمل پاس و لحاظ ، جرأت، شجاعت ،ہمت ،جواں مردی ،حمایت مذہب پاسبانیٔ شریعت ،عزت نفس کا خیال ، ذلت سے دوری جیسے کربلا کے نہ جانے کتنے مطالبات جنہیں پورا کرنا کربلا سے وابستہ ہر حسینی کی ذمہ داری ہے ۔لہٰذا اگر کوئی حسینی ہونے کا دعویدار ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ دین خدا کی پابندی کرے۔ کربلا کی ضرورت انسانی نسلوں میں دینداری کو باقی رکھنے کے لئے پیش آئی تھی اور کربلا کو بھی دیندار نسل کی ضرورت تھی چاہے وہ جس سن وسال میں ہو، ۸۶ سال کے بوڑھے مجاہد سے لے کرشش ماہہ علی اصغرؑ تک کربلا میں ہر سورما اپنے اپنے اعتبار سے دین خدا کا پابند تھا بزرگوں کے ساتھ جوانوں اور نوجوانوں یا کمسن بچوں کی قربانیاں رہتی دنیا تک انسانی

نسلوں کو آواز دیتی رہیں گی کہ اگر کربلائی بننا ہے تو دیندار بنو۔

صبح کی اذان کے وقت علی اکبرؑ کی جوانی کا تصور کرو،جان کی بازی لگانا پڑے تو قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ کو یاد کرو۔ضعیفی اور پیری میں دین خدا پر وقت پڑ جائے تو حبیب ابن مظاہرؑ اور مسلم بن عوسجہؑ بن کر خود کو قربان کرو۔

عروسی کی خوشیوں میں محویت کے وقت بھی اگر خدائی نمائندہ نصرت کے لئے بلائے تو زندگی کی امنگیں چھوڑ کر وہبؑ کی طرح نصرت حق کے لئے تیار رہو۔نماز جیسی عبادت چھوڑ کر امام وقت کی حفاظت مقصود ہو تو سعیدؑ و زہیرؑ کی طرح تیروں کا نشانہ بن جاؤ۔مرضی مولا کی پاسبانی کے لئے جذبہ جوش شجاعت کا گلا گھوٹنا پڑ جائے تو عباسؑ ابن علیؑ کی طرح حق وفاداری ادا کرو حق کی حمایت میں راحت وآرام چھوڑ کر زحمت و مشقت کا انتخاب کرنا ہو تو حرؑ کی طرح جرأت فیصلہ پیدا کرو اور آخر کار دین خدا کی حفاظت کے لئے چھ مہینے کے بچے کو گود میں لے کر میدان میں جانا پڑے تو اپنے آقا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کربلا کی یاد میں قربانی کے لئے تیار رہو۔

کردار میں ہماہنگی کی مثالیں

ا ۔ ضمیر کی آزادی

خداوندعالم نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اوراسے اپنے علاوہ کسی اور کا پابندنہیں بنایاہے انسانوں کے خالق خدا نے اس کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے جیسی یا اپنے سے پست کسی مخلوق کی غلامی قبول کرے۔جسمانی طور پر اگرکبھی مخصوص قوانین کے ساتھ انسان دوسرے انسانوں کے غلام ہوئے بھی ہیں تو وہ بھی اسلام کی آزادی پسند حکمت عملی کے نتیجے میں آزاد ہو گئے غرض کہ اسلام نے انسان کی سب سے بڑی اہمیت اس کی آزادی کوقرار دیاہے، بہت سے احکام کو آزادی کی شرط سے مشروط کیاہے گویا انسان کے لئے آزادی بہت بڑی دولت ہے البتہ جسمانی آزادی سے بھی بڑی دولت ضمیر کی آزادی ہے۔ممکن ہے انسان وقتی طور پر حالات سے مجبور ہو کر کسی دوسرے کی غلامی قبول کرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کا ضمیر آزاد رہنا چاہئے اور اسے کسی پست کی غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہونا چاہئے۔

ضمیر کی آزادی وہ بڑی دولت ہے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتی ۔ بہت سے افراد

بظاہر آزاد زندگی بسر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے کسی فیصلے میں بھی آزادنہیں ہوتے ۔ دنیاوی اعتبار سے بڑے بڑے اقتدار کے مالک جنہیں دوسروں کی زندگی پر تسلط ہوتا ہے خود نہ جانے کتنی چیزوں کے اسیر ہوتے ہیں ایسے افراد کو جسمانی طور پر آزادکہا جا سکتا ہے لیکن ان کا ضمیر خود ساختہ احکام وقوانین، جھوٹے جاہ جلال اور نہ جانے کتنے سماجی بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے ۔واقعہ کربلا نے جہاں انسان کو اپنی خداداد آزادی کی حفاظت کا درس دیا ہے وہیں ضمیر کی آزادی کا پیغام بھی سنایا ہے غلامی کی ذلت وقتی ہوتی ہے لیکن ضمیر کی غلامی ہمیشہ کی رسوائی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

دنیا اور اس کے طاغوتی احکام وقوانین سے انسانی ضمیر کی آزادی حقیقت میں خدا کا حقیقی بندہ بننے کا وسیلہ ہے اور خدا کی واقعی بندگی جہنم سے نجات کا سامان ہے۔ لہٰذا اگر انسان آخرت کی رسوائی سے نجات چاہتا ہے تو ضمیر کی آزادی ضروری ہے جہاں انسان کی ذمہ داری ہے اپنے انسانیت کے تقاضوں کا پاس و لحاظ کرے۔ یزیدلعین نے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کرکے آپ کے اسی آزادی ضمیر کے جذبے کو قید کرنا چاہا تھا لیکن امام حسینؑ نے واضح طور پر اس کا انکار کرکے اس شیطانی سازش کو خاک میں ملا دیا ۔ آپ نے اعلان کر دیا کہ خدائی نمائندے غیر خدائی طاغوتوں کی غلامی قبول نہیں کر سکتے آپ کا مشہور فقرہ ’’مثلی لایبایع مثلہ‘‘ ۳؎ ’’مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا۔‘‘ جہاں یزید منحوس کی پست حیثیت کی طرف اشارہ ہے وہیں اپنے بلند اور آزادانسانی ضمیر کی عظمت وسربلندی کا بھی اعلان ہے ۔

امام کا قافلہ جب مدینہ سے چلا تو آزادضمیر رکھنے والے تمام افراد اپنے آزادضمیر کے مالک امام سے قریب ہونا شروع ہو گئے اور دنیاوی حرص وہوس کے دلدادہ مادی چکا چوندھ میں گرفتار افراد آپ سے الگ ہونے لگے ۔

ایک مختصر جماعت کی شکل میں حسینی قافلہ تیار ہوگیا جس کا طرۂ امتیاز ہی ضمیر کی آزادی تھا امام حسینؑ کے اس قافلے میں چھ مہینے کے بچے سے لے کر ۸۶ سال کا بوڑھا مجاہد بھی موجود تھا۔ جواں مرد سپاہیوں کے علاوہ پردہ نشین خواتین بھی تھیں۔ سن و سال،ضعف وتوانائی جیسے دیگر جسمانی تقاضوں کے اختلاف کے باوجود جو بات سب میں مشترک تھی وہ ضمیر کی آزادی تھی شاید یہی وجہ ہے کہ کسی طرف سے ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی نحیف سے نحیف آواز ایسی نہیں اٹھی جس میں مطالبہ بیعت قبول کر لینے کی بات کہی گئی ہو گویا کربلا کا ہر جانباز ہر منزل میں اپنے ضمیر کی آزادی کی راہ میں ہر

مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کا ضمیر اپنے آقا سے اتنا ہماہنگ تھا کہ کربلا کا ہر مجاہد اپنے عزم وارادے میں حسین ہی نظر آ رہا تھا شہیدوں سے لے کر اسیروں تک ہر شخص سراپا حسینؑ تھا۔

کربلا سے لے کر کوفہ اور کوفے سے شام تک یزیدیت مختلف حربوں سے حسینیت کے آزاد ضمیر پر حملہ کرتی رہی لیکن ادھر سے بھی اس کا منہ توڑ جواب یزیدیت کی رسوائی کا سامان فراہم کرتا رہا اور آخرکار حسینیت کی آزادی اور آزاد ضمیری کے سامنے یزیدیت کو اسیر ہونا پڑا۔قصر یزید میں حسینیت کی آزادی کا اعلان ہوا اور یزیدیت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قید ہو کر رہ گئی۔

سرکار سید الشہداءؑ نے میدان کربلا میں لشکر یزید کے خود فروختہ سپاہیوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا :''اِن لَم یکُن لَکُم دِین وَ کُنتم لاَ تَخافُون المَعاد فکُونوا اِحرار اًفِی دُنیا کم''[۴]۔ ''اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہے اور تم قیامت سے نہیں ڈرتے ہو تو کم سے کم دنیا میں آزاد رہو یعنی اپنی انسانی حیثیت کا خیال رکھو اور ضمیر کی آواز پر توجہ دو۔

سرکار سید الشہداءؑ کا یہ پیغام حقیقت میں ان بے دین سپاہیوں کو راہ راست پر لانے کا آخری وسیلہ تھا کہ اگر ایک لمحے کیلئے بھی وہ اپنی انسانیت اور اس کے نتیجے میں خداداد آزادی کی طرف متوجہ ہو جاتے تو یزید جیسے پست فطرت انسان کی غلامی پر تیار ہو کر فرزند رسولؐ کا خون نہ بہاتے اور اس طرح آخرت کی بڑی رسوائی سے بچ جاتے۔

سپاہ یزید کے رو سیاہ سپاہی غلامی کی جس ذلت ورسوائی تک پہنچ چکے تھے وہاں سے واپسی مشکل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امام کا فقرہ بھی ان پر اثر انداز نہ ہو سکا لیکن قیامت تک آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے گیا کہ انسان کے ضمیر کی آزادی اتنی بڑی دولت جو یزید جیسے منحوس حکمراں کی حکومت وقیادت سے رہائی اور فرزند رسول ☐ کے خون ناحق میں ملوث ہونے سے نجات دلا سکتی ہے خود امام حسینؑ نے حر ابن یزید ریاحی کے استقبال کے وقت ان کے ''حر'' نام کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی ضمیر کی آزادی کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر تمہارے نام کی طرح تمہارا ضمیر آزاد نہ ہوتا تو کبھی بھی لشکر یزید کے زندہ جہنم سے نجات پا کر سردار جوانان جنت کے قدموں میں نہ آ سکتے۔ یہ عظیم دولت اسی ضمیر کی آزادی کی دین ہے جس نے جناب حر کو ہمیشہ کی ذلت ورسوائی سے نجات دلا کر انہیں عزت وآبرو کی علامت بنا دیا ہے۔

امام حسینؑ کے سفیر مقصد کربلا کے پہلے شہید جناب مسلم ابن عقیلؑ نے کوفہ میں لشکر ابن زیاد

کے مقابلے میں جو رجز کے اشعار پڑھے ہیں ان میں بھی اپنی اور اپنے ضمیر کی آزادی کی بات کہی ہے"اُقسِمتُ اَن لاَ اَقْتُلَ اِلاّ حُراً وَان رَاَیتَ المَوْتَ شَیئا۔۔"۵؎"موت اگر چہ تلخ ہے لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ آزاد دنیا سے جاؤں گا یعنی ضمیر کی آزادی کی راہ میں موت کو بھی گلے لگا لوں گا۔"اس کے علاوہ جناب مسلمؑ کے فرزند جناب عبد اللہ نے بھی روز عاشورہ کربلا کے میدان جہاد میں انہیں اشعارکو رجز کے طور پر پیش کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک پوری ذہنیت تھی جونسل درنسل ضمیر کی آزادی کا پیغام دے رہی تھی۔کوفہ میں جنگ کی ابتداسے لے کر روز عاشورہ تک اور روز عاشورہ سے لے کر شام سے رہائی تک ہرلحہ آزادی ضمیر کا پیغام ہے جو دنیا کے تمام کربلائیوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں انسان اپنے ضمیر کی آزادی پر آنچ نہ آنے دے۔ ضمیر کی آزادی دنیا وآخرت دونوں میں نجات کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

ضمیر کی آزادی کی راہ میں اگر موت کو بھی گلے لگانا پڑے تو اپنے آقا کے اس پیغام کو سامنے رکھ کر موت کو بھی گلے لگانے کیلئے آمادہ ہوں" **الموت فی عز خیر من حیاۃ فی ذل**"۶؎ "عزت کے ساتھ موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔سرکار سیدالشہداء نے مطالبۂ بیعت کوضمیر کی آزادی کا سودا قرار دیتے ہوئے واضح لفظوں میں یہ اعلان کر دیا تھا:**واللہ لااعطیھم بیدی اعطاء الذّلیل وَ لاَ اقرار۔۔**"۷؎خدا کی قسم نہ ان کے ہاتھ میں ذلت کا ہاتھ دوں گا اور نہ ان کے سامنے غلاموں کی طرح جھکوں گا۔"

کربلا کے بعد کربلا سے وابستہ ہر حسینی کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آقا کے اس اعلان کو اپنی زندگی کا اہم مقصد اور دستورقرار دے اورکسی بھی حال میں اس سے سرپیچی کرکے اپنے ضمیر کا سودانہ کرے تاکہ امام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے جاں نثار غلاموں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سر خرو، سرفراز اور سربلند رہ سکے اور پھر اس کی زبان پر یہ نعرہ حقیقت کا جامہ پہن سکے"**فَیَالَیتَنی کُنتُ مَعَکُم فَافُوزاًمَعَکم**"اے کاش آپ کے ساتھ ہوتے توعظیم کامیابی حاصل کر لیتے۔

۲۔دیندارنسل کی تربیت

جیسا کہ ذکرکیا گیا کربلا کا یہ عظیم واقعہ اور اس میں پیش کی جانے والی ایسی عظیم قربانیاں اتفاقی نہیں ہوسکتی تھیں بلکہ ان کے لئے پاکیزہ نسل، پاکیزہ کردار، پاکیزہ غذا، پاکیزہ ماحول، پاکیزہ

ذہن اور پاکیزہ آئیڈیل کی ضرورت تھی ۔ شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ مولائے کائناتؑ، صدیقہ طاہرہؑ ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ جیسے پاکیزہ انوارخمسہ نے مل جل کر کربلا کے لئے پاکیزہ نسل کی تربیت کی تھی اس پاکیزہ نسل کے حسن کردار میں اتنی کشش تھی کہ انسانی کمالات کے مالک پاکیزہ آغوشوں کے پروردہ ،چن چن کر اس حسینی قافلہ میں شامل ہو گئے اور اس طرح پاکیزہ نسل نے اپنا فریضہ ادا کر کے ہر نسل کو آواز دی کہ کربلائی ہوتو کربلائی کردار اور کربلائی نسل سے ہماہنگی پیدا کرو وتاکہ اگر کبھی بھی کوئی یزید سر اٹھائے توکربلائی نسل اس کا منھ توڑ جواب دے کر دوبارہ کربلا کی یاد تازہ کرسکے۔ دنیا حق و باطل میں زور آزمائی کا میدان ہے۔ دینداری اور بے دینی میں ہمیشہ جنگ کا ماحول رہتا ہے ہر وقت دین خدا کوحق کی حمایت درکار ہوسکتی ہے اور اس راہ میں قربانیوں کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے۔ کربلائی کردار ہی ایسے وقت کی ضرورت ہے۔ کربلائی ثقافت کی حفاظت اسی لئے ضروری ہے کیونکہ ثقافت کا کردار سازی میں بڑا اثر ہوتا ہے ہماری تمام نسلوں کیلئے کربلائی ثقافت سے آگاہی ،اس کی پابندی ضروری ہے اور اس سلسلے میں ہر شخص ہرلمحہ ذمہ دار ہے کہ اپنی اصلاح اپنے بچوں کی اصلاح ،اپنے سماج کی اصلاح اورسب کو کربلائی ثقافت میں ڈھال کر کربلائی نسلوں کی تربیت کرے یہ ہر شخص کا فریضہ ہے۔

دنیاوی ہویٰ و ہوس حلال وحرام سے بےخبری اور بے راہ روی بے دینی کا اتباع انسان کو اس لائق نہیں چھوڑتا کہ وہ ایسے عظیم مقاصد کے لئے قربانی پیش کر سکے اس کیلئے منصوبہ بند تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

شعائر اسلامی کی حفاظت

الف۔حرمت کعبہ کا پاس ولحاظ:

امام حسینؑ نے یزید کی طرف سے مطالبۂ بیعت پرمدینہ چھوڑ کر مکہ آباد کیا،تاکہ مرکز امن الٰہی سے دنیا کے تمام گوشہ وکنار میں آبادمسلمانوں کو دین خدا کی تعلیمات سے روشناس کیا جا سکے لیکن آپ نے یہ محسوس کیا کہ یہاں بھی حاجیوں کے بھیس میں قاتل آ چکے ہیں اورحرمت کعبہ پامال ہونے والی ہے،آپ نے اس مقدس سرزمین کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے مکہ کوترک کرنے کا ارادہ کیا اور حج کوعمرہ سے بدل کرکوفہ کی جانب نکل پڑے،فرزند کعبہ نے کعبہ چھوڑکرصحرائے بے آب وگیاہ

میں پیاسا ذبح ہونا گوارہ کر لیا لیکن حرمت کعبہ پر آنچ آ جائے اسے برداشت نہیں کیا،آج بھی ضرورت ہے کہ ہر عزادار جس طرح بھی ممکن ہو شعائر اسلامی کی حفاظت کے لئے ضروری اور موثر قدم اٹھائے،اور کسی بھی صورت دشمنان اسلام کو اس بات کی اجازت ہرگز نہ دے کہ وہ کسی جگہ اسلامی شعائر کی بے حرمتی کا ارادہ کر سکیں۔

بیت المقدس سے لیکر جنت البقیع تک اور پھر وہاں سے لیکر پوری دنیا میں پائے جانے والے مقدسات اسلامی کے تئیں اگر ملت اسلامیہ نے ہوشیاری اور بیداری کا ثبوت نہ دیا تو دشمن کی جسارتیں بڑھتی رہیں گی اور قرآن سوزی سے لیکر توہین آمیز فلم کی صورت میں اسلامی شعائر کی بے حرمتی ہوتی رہے گی لیکن اگر آج حسینیت کے نام پر جینے والے حسینی جیالے اپنے حسینی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے شعائر اسلامی کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو یزید منحوس کی سیاہ کرتوت کی طرح آج کے طاغوتی حکمرانوں کے سیاہ کارنامہ بھی تاریخ کا وہ بوسیدہ حصہ بن جائیں گے جن کو سوائے لعنت کی طوق کے اور کچھ نصیب نہ ہو سکے گا۔

ب۔ اخلاق اسلامی کا مظاہرہ

ا۔مہمان نوازی اور کرم

کوفہ جاتے ہوئے راستے میں جب حر کا پیاسا لشکر ملا تو آپ نے اخلاق اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا، چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے [illegible]ظ کیا ہوا پانی حر کے پیاسے لشکر کو پلا دیا، یہاں تک کہ جن میں خود سے پانی پینے کی سکت نہیں تھی انہیں خود سرکار سید الشہداؑء نے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی سواریوں کو بھی سیراب کیا گیا،اور اس طرح اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرکے دشمن کے سپہ سالار کا دل جیت لیا،حر اسلامی تعلیمات کے اس پیکر کی اخلاقی تعلیمات اور ان کے عملی مظاہرہ سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور عین جنگ کے عالم میں دشمن کو چھوڑ کر امام سے ملحق ہو گئے۔

عاشور کے دن حر کی آمد کے موقع پر ایک بار پھر اسلامی اخلاق کا مظاہرہ ہوا۔اور حر کے چھوٹے سے لشکر کا استقبال کرنے کے لیے اپنے بھائی اور بیٹے کو ساتھ لیکر آگے بڑھے اور حر کی معذرت کے جواب میں اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے دنیا وآخرت دونوں میں آزادی کا مژدہ سنایا اور حق مہمان نوازی ادا نہ کر سکنے کی بنا پر خود اظہار شرمندگی فرمایا۔

۲۔ قیام کے لیے زمین خریدنا

کربلا پہنچ کر وہاں قیام کے لیے زمین خریدنا بھی اسلامی اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ امام وقت ہونے کے ناطے تمام اسلامی سرزمینوں کے مالک ہونے کے باوجود کربلا پہونچ کر زمین خریدی اور دوسرے کی سرزمین میں ذرہ برابر تصرف کرنا گوارا نہیں کیا، ساتھ ساتھ کربلا کے المناک واقعہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی بھی خبر دی اور زمیندار گھرانوں سے اپنے دفن کی گذارش کرکے اپنے دشمن کی سفاکی اور بربریت کو بھی برملا کر دیا کہ دنیا صرف اسلام اور مسلمانوں کے نام سے دھوکہ نہ کھائی بلکہ دیکھے کہ مسلمان کہے جانے والے افراد فرزند رسولؐ کا خون بہانے کے بعد ان کی لاش تک کو دفنانا روا نہیں سمجھتے۔

آپ کا یہ عمل اسلامی تعلیمات کا عملی اظہار ہونے ساتھ ساتھ اس بات کا اعلان تھا کہ دین اسلام کی حفاظت کے لیے صرف نام کی نہیں محتوی کی حفاظت ضروری ہے۔ کربلا میں دنیا دونوں طرح کے اسلام کے نمونے دیکھ سکتی ہے جہاں ایک طرف اسلام کے نام پر کفرونفاق کو واپس لانے کی تمام ممکنہ کوششیں اور تدبیریں ہو رہی تھیں چاہے اسکے لیے مظلوم بیگناہ نبی کے نواسے کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے دوسری طرف روح اسلام کی حفاظت مقصود تھی چاہے اسکے لیے اپنی اور اپنے اہل خاندان یہاں تک کہ چھ مہینے کے کمسن کی قربانی ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے۔

۳۔ نماز کی پابندی

نماز اسلام کا اہم ترین پیغام ہے جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے ۔اسکے بارے میں ارشاد ہے: ''اَلصَّلاۃُ عَمُودُ الدّین'' ۸۔'' نماز دین کا ستون ہے۔'' ظاہر ہے ستون پر ہی کسی عمارت کا دار و مدار ہوتا ہے اگر ستون جس پر عمارت کو قائم ہونا ہے نہ پایا جائے تو عمارت کا تصور ہی نہیں پیدا ہوتا لہٰذا نماز کے بغیر اپنے کو دیندار سمجھنا خام خیالی ہے اور دین کے بغیر اپنے کو دین پر قربان ہونے والے آقا کا عزادار سمجھنا مذاق ہے۔

دین اسلام کی باعظمت کتاب جسے انسانی نجات کے لئے اہل بیتؑ کے ساتھ ثقلین کی صورت میں پیغمبر اسلام ﷺ چھوڑ کر گئے اس میں جس تفصیل اور تاکید سے نماز کا تذکرہ موجود ہے وہ نماز کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے ۔قرآن مجید میں ''اَقِیمُوا الصَّلوٰۃ'' کی تکرار سے عظمت

نماز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آغاز قرآن میں سورۂ مبارکہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں جہاں قرآن کے شک و تردید سے پاک ہونے کا تذکرہ ہے وہیں پر قرآن کے کتاب ہدایت ہونے کا ذکر بھی ہے لیکن اس کی ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے لئے جن اہم ترین شرائط کا ذکر ہے ان میں ایک اہم اور بنیادی شرط نماز کا قیام ہے وَیُقِیمُونَ الصَّلوٰۃَ قرآن ان لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ سرکار سید الشہداءؑ نے بعد شہادت نوک نیزہ سے جس کی تلاوت کرکے اس کی عظمت کا اعلان کیا اس قرآن سے ہدایت اور اس سے وابستگی نماز کے بغیر میسر نہیں ہے۔

قرآن مجید نے پیغمبر اسلامؐ کو اخلاص عمل کا اعلان کرنے کا جو پیغام دیا اس میں بھی سب سے پہلے نماز کا تذکرہ ہوا: ''قُل انّ صَلاتِی وَ نُسُکِی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبّ العَالمِین''۹؎ ''اے میرے حبیب کہہ دیجئے کہ میری نماز ، میری قربانی ، میری حیات اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

جناب عیسیٰؑ نے اپنے سلسلے میں جب خدا کی نصیحتوں کا تذکرہ کیا تو اہم ترین نصیحت نماز اورزکوٰۃ کی وصیت کو قرار دیا ''وَ اَوصَانِی بِالصَّلوٰۃِ وَالزَّکوٰۃِ مَا دُمتُ حَیّاً''۱۰؎ ''خدا نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک میں زندہ رہوں''۔

اٹھارہویں پارے کے آغاز میں سورۂ مومنون کا آغاز مومنین کے صفات کے تذکرہ اور ان کی کامیابی کے ذکر سے کیا جس میں کامیاب مومنین کی پہلی صفت نماز میں خشوع کو قرار دیا ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُونَ ۝ اَلَّذِیْنَ هُمْ فِی صَلاتِهِم خَاشِعُون''۱۱؎ بے شک مومنین کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں خشوع رکھتے ہیں۔

دنیا میں بھلا وہ کون انسان ہے جو کامیابی نہ چاہے۔ صاحبان ایمان کی کامیابی کا پہلا اور اہم ترین زینہ نماز اور اس میں خشوع ہے۔ کربلا والوں کی ایک اہم خصوصیت کامیابی ہے۔ شہداء کربلا کی زیارت میں ہم پڑھتے ہیں: فُزتُم وَاللّٰهِ فَوزاً عَظِیماً ''خدا کی قسم تم سب عظیم کامیابی کے حامل ہو۔ اگر واقعہ کربلا کی تفصیل کا جائزہ لیا جائے تو شاید اس کامیابی کا معیار قرآن کی رو سے معین کامیابی کا معیار بھی نظر آئے۔ قرآن مجید میں نماز اور اس میں خشوع کو کامیابی کا معیار قرار دیا گیا ہے تو کربلا والوں نے بھی آخر وقت تک کامیابی کے اس معیار کو کلیجے سے لگائے رکھا۔

شب عاشور عبادت اور نماز کی مہلت، پوری رات خیام حسینی سے تسبیح وعبادت کی آوازیں، نماز صبح کے وقت اذان اور نماز جماعت کا قیام، جماعت کی حالت میں ہی نصف سے زیادہ سپاہ حسینی کا شہید ہو جانا اس کے باوجود ظہر کے وقت نماز کو یاد کرنا، ظہر کی نماز باجماعت قائم کرنا،سنسناتے ہوئے تیروں کے سامنے نماز جماعت کا قیام اور سعیدؓ ابن عبد اللہ اور زہیرؓ ابن قین جیسے باوفا جان نثاروں کا نماز جماعت کے لئے قربان ہو جانا، اور بقیہ تمام جانثاروں کا کربلا کے برستے ہوئے تیروں میں نماز جماعت قائم کرنا قرآنی معیار کے مطابق ان کی کامیابی کا اہم ترین راز ہے لہٰذا زیارت کے آخری فقرات میں اگر کربلا والوں کی طرح ''یَالَیتَنِی کُنتُ مَعَکُم فَافُوزَ مَعَکُم'' کہہ کر کامیابی کی تمنا کرنا ہے تو کامیابی کے اس معیار کو کلیجے سے لگائے رکھنا پڑے گا ایسی عظیم کامیابی تو نماز کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

عزائے شہیدان کربلا واقعہ کربلا کو زندہ رکھنے کا سبب ہے تو نماز کا قیام مقصد کربلا کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ان دونوں باتوں سے مکمل کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نماز سے روگردانی اور اس کو کسی صورت بھی ہلکا ثابت کرنا کسی بھی طرح کربلا جیسی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتا ہے ایسا کرنے والے بے دین افراد کربلا کے نام پر شیطانی مشن کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہیں تاکہ انسان معیار کامیابی چھوڑ کر فقط اس کے ظاہری ذرائع میں اُلجھا رہے اوراس طرح آخرت میں ناکامی کے ساتھ جنت سے محروم ہو جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ بنی عباس نے واقعہ کربلا سے وابستگی کے اعلان کے ساتھ قیام کیا۔ واقعہ کربلا کی عزاداری کو علامت قرار دیتے ہوئے سیاہ لباس اختیار کیا لیکن اصل میں روح کربلا سے دشمنی میں بنی امیہ سے آگے نکل گئے اور دین کی حمایت کرنے والے ائمہ معصومینؑ اوران کے چاہنے والوں کو جس طرح آزار و اذیت کا نشانہ بنایا گیااس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف واقعہ کربلا کی یاد اور اس سے وابستگی جنتی بنا سکتی ہے۔

امام حسینؑ کے نام پر قیام کرنے والوں کے دربار کااگر جائزہ لیا جائے تو یزیدی دربار جیسا ماحول نظر آئے گا۔ کیا ایسے افراد کو کربلائی یا جنتی کہا جا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں کربلائی اور حسینی ہونے کے لئے مقصد کربلا اور سیرت شہداء کربلا سے ہماہنگی ضروری ہے اس کے بغیر کربلائی ہونے کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کربلا کے پورے واقعے میں جس طرح دیگر پیغامات دین کی زندگی مقصود ہے اسی طرح دین کے اہم ترین ستون یعنی نماز کی بھی شاید اسی لئے بار بارنماز کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔مشہور ایرانی قلمکار جواد محدثی تحریر کرتے ہیں''امام حسینؑ کا قیام دین الٰہی کو ہر جہت اور ہر رخ سے زندہ کرنا تھا'' دین الٰہی کا ایک اہم ترین مظاہرہ نماز ہے انسانی زندگی کا حقیقی، اصلی اور معنوی پہلواس کا عبادت گذار ہونا ہے ،نماز انسان کی معنوی زندگی کا اہم ترین اور نمایاں ترین پہلو ہے۔ نماز انسانی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اسی لئے اسے اسلام میں خاص اہمیت دی گئی ہے اور امام حسینؑ نے بھی کربلا کے قیام میں نماز کو خاص اہمیت دی ہے ،آپ فرماتے ہیں: **لَعلّنا نُصَلّی لِرَبنا اللّیلۃَ وَنَدْعُوہ وَنَسْتَغفِرہ فَھُوَ یَعلم اِنّی کُنتُ اَحبُ الصَّلوٰۃَ لہ وَتِلَاوَۃ کِتَابِہ وَکَثرۃ الدُعَاء وَالاَسْتَغفَار۔**

امام حسینؑ نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو دشمن سے ایک رات کی مہلت لینے کے لئے بھیجتے وقت فرمایا بھیا! اس لشکر سے کہہ دو کہ لڑائی کل تک ٹال دے تاکہ آج کی رات ہم اپنے پروردگار کیلئے نماز پڑھ سکیں اس سے دعاء ومناجات کریں اس سے استغفار کریں۔ میرا پروردگار جانتا ہے کہ مجھے نماز تلاوت قرآن مجید اور کثرت سے دعا و استغفار بہت پسند ہے۔

شہداء کربلا میں جیسا کہ ذکر ہوا سعید بن عبد اللہ اور زہیر ابن قین دونوں حضرات نے اس لئے آگے بڑھ کر اپنے سینوں پر تیر روکے تاکہ نماز اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ قائم ہوسکے اور عصر عاشور تاریخ انسانیت کا منفرد سجدہ بھی جہاں ایثار وقربانی کی انوکھی مثال ہے وہیں اپنے مالک کی عبادت وبندگی کا اعلیٰ ترین نمونہ بھی ہے۔امام حسینؑ کا سجدہ آخر ہر حسینی کو آواز دے رہا ہے کہ زندگی میں مشکلات چاہے جتنی بڑھ جائیں زخموں سے چور خنجر تلے اس تشنہ کام کی مصیبتوں سے زیادہ ہرگز نہیں ہوسکتیں لہٰذا اگر حسینی ہو امام حسینؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایسے شدید حالات میں بھی نماز سے غافل نہ ہونا اگر حسینی بننا ہے تو اپنی زبان سے زیادہ اپنے عمل سے ثابت کرنا تمہاری عبادتیں، نمازیں اور خداوندعالم کی بارگاہ میں دعا و مناجات اس بات کی دلیل ہو کہ تم واقعی حسینی ہو۔

واقعہ کربلا کے بعد کے حالات میں بھی نماز کی پابندی اور اس کی عظمت کا اعلان جابجانظر آتا ہے۔ اپنی بہن سے امام حسینؑ کی وہ مخلصانہ خواہش آج بھی زبان زد ہے''**اُختِیِنی لاَتنسانِی فِی صَلاۃِ الّلیل**'' میری بہن مجھے نماز شب میں نہ بھولنا۔امام کی خواہش جناب زینبؑ کی بندگی

پروردگار پر اعتماد کی اہم ترین دلیل ہے۔ جناب زینبؑ نے بھی راہ کوفہ وشام سے لے کر زندان شام میں امام حسینؑ کے اس حسن اعتماد کو سچا ثابت کرتے ہوئے ہر جگہ نماز کی پابندی کی ہے چنانچہ مشہور ہے کہ جب زندان شام میں جناب زینبؑ میں اتنی طاقت نہ رہی کہ آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کی۔ امامؑ چہارم نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی وجہ دریافت فرمائی تو آپ نے بیان فرمایا کہ لشکر یزید کی طرف سے کھانا اور پانی اتنا کم آتا ہے کہ اسے میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھلا دیتی ہوں اور اب جسم میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی ہے کہ کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکوں لہٰذا بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہوں۔ کیا ایسے نماز کے پابند افراد سے محبت اور عقیدت بغیر نماز کی پابندی کے ممکن ہے؟ خود امام زین العابدینؑ نے جن کا لقب مبارک ہی زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ ہے شدید بیماری کے باوجود اسیری کی ہولناک منزلوں میں عبادت الٰہی اور نماز کے لئے اہم مثال قائم کردی۔ شام غریباں کے بھیانک سناٹے میں پوری رات سجدۂ الٰہی میں گذار دینا کربلا کے اس عظیم سورما کا ہی کارنامہ ہے جو ہر کربلائی کو عبادت پروردگار کی طرف رغبت دلانے کے لئے کافی ہے۔ ایسے نمازیوں سے محبت اور ان کی مصیبتوں پر آنسو بہانے والے کیا کسی صورت بھی نماز سے غافل ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں جس طرح کربلا میں ہر آن نماز کی پابندی اور اس کی عظمت کا اعلان نظر آتا ہے اسی طرح ہر کربلائی کی بھی ذمہ داری ہے کہ نماز کی عظمت کا اعلان اور اس کی پابندی کرے تاکہ اس کی زبان کی یہ تمنا سچی ثابت ہو جائے۔ اے کاش ہم کربلا میں ہوتے تو کربلا والوں کے ساتھ عظیم کامیابی حاصل کرتے۔ کربلا سے لے کر کوفہ اور کوفے سے شام تک یزیدیت مختلف حربوں سے حسینیت کے آزادضمیر پر حملہ کرتی رہی لیکن ادھر سے بھی اس کا منہ توڑ جواب یزیدیت کی رسوائی کا سامان فراہم کرتا رہا اور آخرکار حسینیت کی آزادی اور آزادضمیری کے سامنے یزیدیت کو اسیر ہونا پڑا۔ قصر یزید میں حسینیت کی آزادی کا اعلان ہوا اور یزیدیت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قید ہو کر رہ گئی۔

حوالے:

۱۔زیارت شہدائے کربلا

۲۔لہوف،ص۸۹

۳۔مثیر الاحزان،ص ۳۴

۴۔بحار الانوار،ج ۴۵،ص۵۱

۵۔امالی شیخ صدوقؒ،ص ۱۶۲
۶۔مناقب ابن شہر آشوب، ج۱،ص ۶۸
۷۔الارشاد، ۲،ص ۹۷
۸۔وسائل الشیعہ ،ج ۴،ص ۲۷
۹۔سورۂ انعام، آیت ۱۶۲
۱۰۔سورۂ مریم،آیت ۳۱
۱۱۔سورۂ مومنون، آیت ۱تا۲

]ب[

کربلا اور اخلاقی اقدار

سید نامدار عباس رضوی

انسانی حیات، تین بنیادی اصولوں پر استوار ہوتی دکھائی دیتی ہے: عقیدہ (belief)، احکام (tenets and commandments) (یا عبادات) اور اخلاق (Ethics)، وہ زندگی سراسیمگی ، پریشاں سامانی اور تحیر کا شکار رہتی ہے جس کی بنیاد کسی عقیدہ پرنہیں ہوتی ، لہٰذا ہر دور اور ہر زمانے میں

بدعقیدہ افراد تو مل جاتے ہیں لیکن بےعقیدہ شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں، انسان غلط اور بیہودہ عقائد کا شکار تو ہو جاتا ہے لیکن یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اسے لا مذہب کہے، اس کا سبب بھی منطقی ہے اور وہ یہ کہ خدا وند عالم نے ہر انسان کی فطرت میں خدا جوئی رکھی ہے چنانچہ انسان اپنے فطری تقاضوں کے تحت خدا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کبھی مقصود تک پہونچتا ہے تو کبھی بےخبری و بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے، انسانی فطرت کی اسی بےخبری اور بے راہ روی کو علامہ اقبالؔ نے فارسی کے چار مصرعوں میں یوں بیان کیا ہے ؎

آدم از بی خبری بندگی آدم کرد
گوهری داشت ولے نذر قباد و جم کرد
آدم از خوئے عبادت زسگاں بدتر است
من ندیدم که سگی پیش سگی سر خم کر

مذکورہ چار مصرعوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان ایک عقیدہ استوار کرنے کے فوراً بعد عبادت کی سمت راغب ہوجاتا ہے، ایسے میں اگر اس کی عقیدتی بنیادیں فرسودہ ہوتی ہیں تو یقیناً اس کی عبادتیں اسے آسودہ نہیں کرسکتیں چنانچہ وہ پہلے کی مانند ہی حیران و پریشان رہتا ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ فرسودہ اور مہمل عقیدتی بنیادوں سے حاصل ہونے والے احکام (commandments) کبھی بھی بالیدہ نتائج تک نہیں پہونچا سکتے، اور یہی عقائد واحکام کی فرسودگی انسانی زندگی کے تیسرے بنیادی اصول یعنی اخلاقی اقدار کو متزلزل کر دیتی ہے۔

اخلاقی قدروں کی شائستگی اور اس کے استحکام کے لیے ایسے معلمین اخلاق کی جستجو ضروری ہو جاتی ہے جو اپنی مثال آپ ہوں، جن کے یہاں پایا جانے والا عقیدہ، صرف عقیدہ نہ ہو بلکہ عین حقیقت ہو، جن کی عقیدتی بنیادیں بے بنیاد مفروضوں پر مشتمل نہ ہوں بلکہ حق وحقیقت کی آئینہ دار ہوں، ظاہر ہے ایسے میں ہر متجسس کی نگاہ خاندان عصمت و طہارت یعنی محمد و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام پر جا کرٹھہر جاتی ہے، کیونکہ اس خاندان نے ہر مقام و منزل پر اخلاقی قدروں کے شاہکار نمونے پیش کئے ہیں، وطن تو وطن غریب الوطنی میں بھی اخلاق و کردار کی ایسی مثالیں پیش کر دیں جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر امام حسین علیہ السلام اور ان کے احباب و اقرباء نے سرزمین کربلا پر اخلاقی اقدار کے جو لازوال نقوش چھوڑے ہیں وہ رہتی دنیا تک چراغ راہ کی مانند

روشنی بکھیرتے رہیں گے۔

کربلا سے حاصل ہونے والی اخلاقی قدریں درحقیقت اسلامی تعلیمات کی تفسیر ہیں ، اس سرزمین پر امام حسین علیہ السلام اور ان کے احباب و اعزہ کے دس دن کے قیام نے اسلامی تہذیب و تمدن کی حقیقی اور مکمل تصویر پیش کردی اور مقابلہ پر آمادہ نام نہاد مسلمانوں کے چہروں کو بھی بے نقاب کر ڈالا۔

کربلا میں داخل ہونے سے قبل ہی امام حسین علیہ السلام کا حرؑ کے پیاسے لشکر کو سیراب کرنا اسلامی اخلاق کی ایک ایسی مثال تھی جو صرف اسی خاندان سے مخصوص ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانیت میں ایسی مثالیں اسی گھرانہ کی دین ہیں،اس خاندان سے الگ ہٹ کر اور واقعہ کربلا سے قبل کہیں بھی ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی جہاں دشمنوں کی سیرابی کا سامان فراہم کیا گیا ہو، امام حسین علیہ السلام کا یہ عمل درحقیقت اپنے بابا علی ان ابی طالب علیہما السلام کے حسن عمل کی پیروی تھی ، مولائے کائنات علیہ السلام نے تو اپنے دشمن ابن ملجم کو اس وقت سیراب کیا تھا جب اس نے آپ کے سر اقدس پر ضرب لگائی تھی اور گرفتار ہونے کے بعد خوف و دہشت سے لرز رہا تھا۔[۱]

کربلا کے جانبازوں میں پائی جانے والی اخلاقی قدروں کو اگر نام بنام جمع کیا جائے تو اسلامی اخلاق و آداب کی ایک مکمل کتاب سامنے آجائے گی ، اخلاق کا سیدھا سیدھا تعلق نفس و روح سے ہوتا ہے اور کربلا پاکیزہ روحوں اور مطمئنہ نفسوس کے عظیم اجتماع کا نام ہے ،قرآن مجید نے نفس مطمئنہ کی جو تعبیر پیش کی ہے کیا امام حسین علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو اس کا مصداق ہو؟!

کربلا والوں میں جملہ اخلاقی فضائل وکمالات کے احصاء کے سلسلے سے آیت اللہ مظاہری فرماتے ہیں:

"بررسی تاریخ عاشوره گواهی میدهد که نمی توان فضائلی از فضائل اخلاقی و خصائل نکوی انسانی یافت که در رفتار حضرت اباعبدالله علیه السلام ویاران ایشان بروز و ظهور نیافته باشد۔"[۲]

"تاریخ عاشورہ کا تجزیہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ انسان کے اخلاقی فضائل اور

اس کی نیک خصلتوں میں سے کوئی فضیلت یا خصلت ایسی نہیں ہے جو امام حسین علیہ السلام اور ان کے احباب میں بدرجۂ اتم موجود نہ رہی ہو۔''

کربلا کو ایک تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے دیکھنے والوں نے بھی اس بات کا جابجا اقرار کیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے تمام ساتھی جملہ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔

ایثار، فداکاری، صبر، مروت، شفقت، صلہ رحم، تواضع، مساوات، حلم و بردباری، وفا، عفو وچشم پوشی، خندہ پیشانی وکشادہ روئی، ایتام پروری، مہمان نوازی، امانتداری، درگزر، توکل و۔۔۔ اور نہ جانے کتنی ہی ایسی اخلاقی قدریں ہیں جو کربلا میں پوری آب وتاب کے ساتھ ظاہر ہوئیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کربلا کی سرزمین پر فضائل اور کمالات نے امام حسین علیہ السلام کے جانبازوں کی شکل میں وجودی پیکر اختیار کرلیا تھا۔

مساوات

کربلا کے جانبازوں پر اگر نظر ڈالی جائے اور امام حسین علیہ السلام کے سپاہیوں کی فہرست دیکھی جائے تو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ امام حسین علیہ السلام کی فوج عزیز و اقربائ، سرداران قبائل اور غلاموں پر مشتمل تھی، رؤسائے قوم اور غلاموں سے مرکب اس فوجی دستہ میں نابرابری کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا، عام طور پر دنیا کے ہر طبقہ میں نابرابری کا تصور کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے لیکن کربلا میں رحمۃ للعالمین □ کے نواسے کی رحمت آمیز نظر نے اس تصور کو یکسر ختم کر دیا تھا، چنانچہ تاریخ لکھنے والوں نے کبھی حبیبؓ اور جونؓ کو ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھا ہوا پایا تو کبھی جونؓ کا سر سرکار سیدالشہدائ علیہ السلام کے زانو پر دیکھا۔

ایثاروفداکاری

امام حسین علیہ السلام نے جس عقیدتی اور تہذیبی بحران میں قیام فرمایا تھاوہ تاریخ اسلام کا نازک ترین دور تھا،عوام علم وعمل سے دور ہو گئے تھے،تعلیمات رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالائے طاق رکھا جا چکا تھا،حرص و ہوس کا بازار گرم تھا اور معاشرے میں مادہ پرستی کا اس قدر غلبہ تھا کہ معنویت و روحانیت جیسے الفاظ بے معنی ہوکر رہ گئے تھے چنانچہ امام حسین علیہ السلام نے امت رسول □ کی اصلاح اور مردہ دلوں کو بیدار کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی کا راستہ اختیار کیا، یہ

ایک ایسا نایاب طریقہ تھا جس نے پتھر دل افراد کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا ،ہرتحریک کا سربراہ اس کوشش میں ہوتا ہے کہ میری تحریک کامیابی سے ہمکنار بھی ہو جائے اور مجھے کوئی ضرر بھی نہ پہونچے مگر امام حسین علیہ السلام کی سربراہی کا انداز بالکل الگ تھا وہ خود قربان ہوجانا چاہتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بچانا چاہتے تھے ، آپ کے اس عمل کا گواہ آپ کا وہ خطبہ ہے جو آپ نے شب عاشور دیا تھا،امام علیہ السلام نے کچھ اس طرح خطبہ ارشاد فرمایا:

''میں بہترین طریقے سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں ،میں عافیت اور مصیبت دونوں میں اس کی حمد کرتا ہوں،خدایا میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تونے ہمیں پیغمبرجیسی نعمت سے نوازا،ہمیں قرآن سکھایا اور ہمیں دین اور اس کے احکام کی سمجھ عطا کی ،ہمیں آنکھیں ، کان اور دل دئے ،ہمیں شرک کی آلودگی سے پاک رکھا،ہمیں نعمتوں پر شکر کی توفیق بخشی، یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفااور بہتر اصحاب،اور اپنے عزیزوں سے زیادہ صالح اور مہربان عزیزوں سے واقف نہیں ہوں، خدا تم سب کو جزائے خیر دے ،میرا خیال ہے کہ اب اس لشکر سے ہماری جنگ کا وقت آ گیا ہے، میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ،تم سب آزاد ہوکسی پر کوئی پابندی نہیں ہے،رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاؤ۔''۳؎

شیخ مفید،طبری اور ابولفرج سے لے کرابن اثیر تک سب نے اس خطبہ کونقل کیا ہے،بعض جگہ تو یہ بھی نقل ہوا ہے کہ امام علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ میں تمہاری گردنوں سے بیعت اٹھائے لیتا ہوں ، یعنی صاف ظاہر ہے کہ تحریک کربلا کا سربراہ صرف اپنی قربانی چاہتا تھا دوسروں کی نہیں ،قربانی ، ایثار اور فداکاری کا یہ وہ سبق ہے جو ہمیں صرف اور صرف کربلا سے ملتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام اور ان کا ہر ساتھی ایثار وقربانی کے جذبوں سے سرشار تھا ، ہر مجاہد میدان شہادت سے میں دوسرے مجاہد پر سبقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ادھر امام حسین علیہ السلام بھی اصحاب و انصار کو اعزہ و اقارب سے پہلے صرف اس لیے جنگ کی اجازت دے رہے تھے کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے احباب و انصار کے بالمقابل میرے رشتہ دار زیادہ سے زیادہ پیاس کی شدت برداشت کریں چونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ جس کی شہادت دیر سے ہوگی اسے اتنی ہی زیادہ پیاس برداشت کرنی پڑے گی۔

عفو وچشم پوشی

جناب حرؑ کے ساتھ امام علیہ السلام کے طرزِ عمل نے عفو و درگزر، چشم پوشی اور خندہ پیشانی کی جو مثال قائم کی ہے وہ ڈھونڈھے سے نہیں ملتی، وہ شخص جوامام حسین علیہ السلام کوسرزمین کربلا تک گھیرکر لانے کا مجرم ہو اس کے استقبال کے لیے اپنے دل کے ٹکڑے علی اکبر علیہ السلام اور علمدار لشکر حضرت عباس علیہ السلام کو بھیجنا ایک ایسا عمل تھا جو اعلیٰ ظرفی کا درس دے رہا تھا، اور پھر جیسے ہی حرؑ امام علیہ السلام کے سامنے آتے ہیں اور اپنا سر امام علیہ السلام کے قدموں میں ڈالتے ہیں تو آپ کا جھک کر جناب حرؑ کو اٹھانا اور گلے سے لگانااور اس بات کی معذرت پیش کرنا کہ ''اے حرؑ تم ایسے وقت میں مہمان ہوئے جب میزبانی کے لیے حسینؑ کے پاس پانی بھی نہیں ہے''، یقینا یہ وہ اقدار ہیں جو صرف رسول ﷺ کے وارثوں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ امام حسین علیہ السلام کا حسن خلق ہی تھا جس نے حرؑ کو ایسا منقلب کیا کہ جب وہ یزیدیوں کے مقابلہ پر آئے تو کچھ اس انداز میں آل رسول ﷺ کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے نظر آئے ؎

انّی انا الحر وما وی الضیف
اضرب اعناقکم بالسیف
عن خیر من حل بارض الخیف
اضربکم ولا اری من حیف

''اے اہل کوفہ و شام! آگاہ ہو جاؤ کہ میں حر بن یزید ریاحی ہوں، مہمانوں کا ملجا و ماویٰ ہوں، اپنی تلوار سے تمہارے سر جدا کروں گا اور حمایت کروں گا فرزند رسول کی۔''۴؎

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

معاشرتی اقدار کومستحکم بنانے میں کربلا کے جس عظیم درس نے سب سے اہم کردار ادا کیا، وہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' ہے۔امام حسین علیہ السلام نے مدینے سے نکلتے ہی کربلا جانے کے مقصد کو یہ کہہ کر واضح کر دیا تھا:

''ماخرجت اشراًو لا بطراًو لا ظالماًو لا مفسداًو انما خرجت لطلبِ الاِصْلاح فی امۃِ جدی رسول اللّٰہ ﷺ کی آمر بالمعروف و انھی عن المُنکَر''۵؎

''نہ میں شر و طغیان کے لیے نکلا ہوں نہ تمکنت وظلم و فساد کی خاطر، بلکہ میں اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں تاکہ اچھائی کی ترغیب دلاؤں اور برائیوں سے روک سکوں۔''

سرکار سید الشہداء علیہ السلام کا یہ پاکیزہ مقصد کسی بھی معاشرہ کی moral values کو سب سے بہتر بنانے کے لیے بے حد کارآمد ہے،معاشرہ میں پائی جانے والی برائیوں کی تاریکیاں چاہے جتنی پھیلی ہوں لیکن جیسے ہی ''نہی عن المنکر'' کے چراغ روشن ہوتے ہیں شر آمیز ظلمتوں کا دم گھٹنے لگتا ہے ، خیر و معروف کو نظر انداز کرنے والے خود غرض افراد اسی وقت تک اپنے نفس کو دھوکا دے سکتے ہیں جب تک کوئی انہیں ان کی فطرت کی طرف بلانے والا نہ ہو، وہ اسی وقت تک خواب غفلت میں ہونے کا بہانہ کر سکتے ہیں جب تک کوئی جگانے والا نہ ہو ،لیکن جیسے''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا سورج معاشرہ میں اپنی چمک بکھیرنے لگتا ہے خیر اپنی نورانیت سمیت نفوذ پانے لگتا ہے اور شر اپنی ظلمتوں سمیت نابود ہونے لگتا ہے ۔

امام حسین علیہ السلام سے نفرت و کدورت صرف انہیں افراد کو تھی جو برائیوں کے دلدل میں غرق تھے اور کسی طرح بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ خیر کی سمت آئیں ،کیونکہ لوگوں کا خیر اختیار کرنا اور شر سے دور رہنا ان سے دوری اختیار کرنے کا سبب ہو جاتا، چنانچہ شر پسندوں نے امام علیہ السلام کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن امام حسین علیہ السلام دین نبیؐ کے حقیقی وارث تھے ، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کی موجودگی میں شر سر اٹھائے اور وہ خاموش رہیں،لہٰذا امام علیہ السلام نے کربلا کی سرزمین پر وہ چراغ جلایا جس کی روشنی آج بھی شر پسندوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔

آج معاشرہ میں پائی جانے والی بے شمار برائیوں کی طرف انگشت نمائی کے لئے وہی طریقۂ کار سب سے زیادہ بہتر ہے جو امام علیہ السلام نے اختیار کیا تھا، دور حاضر میں اگر ہم معاشرہ کے امراض پر نگاہ ڈالیں تو بے پردگی، بے حیائی، غیبت ،تہمت، جھوٹ، غصب، شراب نوشی ،فسق و فجور اور فحاشی کو عام کرنا جیسے امراض معاشرہ کو روز بروز کمزور کرتے جارہے ہیں اور ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ہر حسینی کا یہ فرض ہے کہ اپنی تحریر ،تقریر اور تدبیر سے ہر ممکن کوشش کرے تاکہ ''کربلائی اقدار'' قائم رہ سکیں ۔

صبر و رضا

تاریخ کربلا میں جس اخلاقی صفت نے ہر خاص و عام کو اپنی سمت متوجہ کیا وہ صفت ''صبر و رضا'' ہے ، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صفت کو کما حقہ شہرت کربلا والوں ہی کے طفیل نصیب ہوئی۔ کربلا کے ہر مجاہد میں یہ صفت اپنے تمام و کمال معنی میں موجود نظر آتی ہے ، اصحاب و انصار، اعزہ و اقارب ، بڑے، چھوٹے ، خواتین اور مرد کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے صبر کے عظیم امتحان کو کامیابی سے سر نہ کیا ہو۔ غریب الوطنی پر صبر، بھوک اور پیاس کی شدت پر صبر، دشمنوں کے ناروا سلوک پر صبر ، بے سر و سامانی پر صبر ، بے پردگی پر صبر، اپنے جگر کے ٹکڑوں کی لاشوں پر صبر،لاشوں کی پامالی پر صبر اور نہ جانے کیسے کیسے دلسوز اور المناک حادثات و واقعات پر کمال صبر کا مظاہر کرتے ہوئے کربلا کے جیالوں نے دشمن کو ایسی شکست دی کہ آنے والی نسلوں میں صبر ایک اسلحہ کے طور پر جانااور مانا جانے لگا،امام حسین علیہ السلام کے ساتھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ خدا کی اطاعت میں مصیبتیں اٹھانا اور اس پر صبر کرنا ہی عبادت ہے اور اگر یہ سب کچھ حسین علیہ السلام جیسے آقا و مولا کے پہلو میں ہوتو اس سے بہتر اطاعت اور کیا ہوسکتی ہے، وہ آقا جس کا خود یہی نظریہ ہو کہ:

''راس طاعۃ اللّٰہ الصبر و الرضا عن اللّٰہ۔۔۔''۶؎

''اطاعت الٰہی کا بہترین نمونہ صبر و رضا ہے''

حسینی اخلاق سے خود کو آراستہ کرنا درحقیقت اپنی عزت نفس میں اضافہ کا سبب ہے ،آج ساری دنیا کی نگاہیں اسی قوم پر مرکوز ہو چکی ہیں جو امام حسین علیہ السلام کے نام پر اپنی مجلسیں آراستہ کرتی ہے، اور کربلائی اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے، آخر کیوں دنیا بھر کے نام نہاد super powers کی جملہ پابندیوں کے بعد بھی ایرانی قوم کی تہذیب اور ان کا تمدن دنیا کو حیران کئے دے رہا ہے، شاید اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ اس قوم نے وہ راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو کربلائی ہے ، یہ قوم دنیا بھر کی جنگوں اور اس کے جنگجوؤں میں دلچسپی نہیں لیتی ، بلکہ اس قوم کا اسوہ کربلا کے لوگ ہیں ، وہ لوگ جنہوں نے ایک مثالی جنگ پیش کی ، ایسی جنگ جس کا نمونہ سن ۶۱ ہجری کے بعد پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ کربلا سے ملنے والے اخلاقی دروس و اسباق

بے پایاں ہیں اور ہم اس مختصر سے مقالے میں سب کا احصاء کرنا تو دور فہرست بھی نہیں بیان کر سکتے ، خداکی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو کربلائی اخلاق اپنانے کی توفیق عنایت فرمائے (آمین)

حوالے:

۱۔ الاخبار الطوال،ص ۳۶۰ نقل از چودہ ستارے ،نجم الحسن کراروی ،ص ۱۷۴

۲۔ نقل از پائگاہ اطلاع رسانی آیت اللہ مظاہری ، www.tebyan.net

۳۔ ڈاکٹر ابراہیم آیتی ،تاریخ عاشورہ ، مترجم :مستجاب احمد انصاری ص ۱۳۴

۴۔ علاّمہ مجلسی ، بحار الانوار (اردو ترجمہ،طیب آغا جزائری، ج۱،ص۲۳۱)

۵۔ علاّمہ مجلسی ، بحار الانوار، ۴۴، ۳۲۹، باب ۳۷ ماجری علیہ بعد بیعۃ الناس

۶۔ اصول کافی ، جلد ۲ ص ۶۰: باب الرضابالقضائ

میدان کربلا کا محرمِ عشق غیور

ڈاکٹر سید احسن الظفر

شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

کیست دریں انجمن ''محرمِ عشقِ غیور''

ماہمہ بے غیرتیم ، آئینہ در کربلاست ا؎

ہندوستان کے مشہور فارسی گو شاعر مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴۔۱۷۲۰ئ) پر تحقیق اور ان کے کلام کے مطالعہ کے دوران حضرت امام حسینؑ سے متعلق ان کا ایک شعر ملا جس کی بنیاد پر

بیدل کا ان سے والہانہ تعلق تو معلوم ہوتا ہی ہے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ''عشق غیور'' کا محرم یا پیکر مجسم بھی وہ انہیں کو سمجھتے تھے، کہتے ہیں :

اس دنیا میں ''عشق غیور'' کا محرم کون ہے؟

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں :

عشق غیور کے محرم کا آئینہ دیکھنا ہو تو کربلا میں دیکھو۔ ہم لوگ جو عشق کا دم بھرتے ہیں درحقیقت بے غیرت اور بے شرم ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ آخر ایسی کیا بات ہے کہ امام حسین عشق غیور کے محرم ومصداق ہیں، حالانکہ اللہ کے بہت سے بندے عاشق صادق ہو گذرے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ''ہم''یعنی عہد حاضر کے لوگ جو عشق کا دعویٰ کرتے ہیں اول تو وہ عشق نہیں ہوتا بلکہ ہوس ہوتا ہے۔ چنانچہ بیدل ایک جگہ کہتے ہیں :ع

باعقل چہ جوشیم کہ جز وہم ندارد
از عشق چہ لافیم کہ بیش از ہوسی نیست ۲؎

ہم عقل پر کیا اترائیں جس کی حیثیت وہم سے زیادہ نہیں ہے۔ہم
عشق کی کیا لاف زنی کریں جس کی حیثیت ہوس سے زیادہ نہیں ہے۔

اور اگر وہ ہوتا بھی ہے تو عشق غیور نہیں ہوتا، بلکہ ہوس آمیز عشق ہوتا ہے ۔ چنانچہ دوسری جگہ بیدل اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

عشق را کردیم بیدل تہمت آلود ہوس
در سوادِ کشورِ ما سایہ دارد آفتاب ۳؎

ہم نے عشق پر ہوس کی تہمت لگا کر اسے آلودہ کر دیا، ہمارے ملک میں آفتاب سایہ دار ہوتا ہے ، یعنی آفتاب کے نور کے ساتھ سایہ کی تاریکی بھی ملی ہوتی ہے۔ اسی طرح عشق وہوس دونوں مخلوط شکل میں ہیں۔

از راہِ ہوس چند دہی عرض محبت
مکتوب نہ بندند ببال مگس اینجا ۴؎

ہوس کے راستے کب تک عشق کا دم بھرتے رہوگے ۔ یہاں یعنی میدان عشق میں عشقنامہ

کو مکھی کے بازو سے نہیں باندھتے ہیں ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''عشق غیور'' کیا چیز ہے؟

غیور کے معنی غیرت مند کے ہیں۔ کہتے ہیں فلاں آدمی بہت غیور ہے ۔ یعنی باحمیت، باحیا اور ناموس پرست ہے، پھر عشق بھی اگر عشق الٰہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان ،عزیز واقارب اور اپنے دوست احباب سب کی جان داؤں پر لگانے سے پیچھے نہ ہٹے اور ناموس شریعت پر آنچ نہ آنے دے ،غالب کہتے ہیں:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۵؎

حضرت امام موصوف کا عشق ایسا ہی تھا کہ حق کی آواز بلند کرنے اور باطل کے سامنے نہ جھکنے کا جو پختہ عزم وارادہ اور جو نمونہ انہوں نے کربلا میں پیش کیا وہ ایک عاشق صادق اور غیور کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں:

پیوستگی بہ حق ز دو عالم بریدن است
دیدار دوست ہستیِ خود را ندیدن است۶؎

خدا سے غیر معمولی وابستگی اور عشق کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں جہاں سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ دوست کا دیدار تو درحقیقت خود اپنی ہستی کو نظر انداز کرنا ہے ۔دوسری جگہ عشق الٰہی یا عشق ھو اللہ احد کی تعریف مثنوی عرفان میں اس طرح کرتے ہیں :

عقل و حس ، سمع و بصر ، جان و جسد
ہمہ عشق است ''ھو اللّٰہ احد'' ۷؎

''ھو اللّٰہ احد'' کا عشق بھی عجیب عشق ہوتا ہے ۔یہ عقل واحساس ، سامعہ وباصرہ اور جان وجسم سب کو اپنا مرید بنالیتا ہے اور یہ سب وہی کام انجام دیتے ہیں جو عاشق صادق چاہتا ہے ۔کربلا کے معاملہ میں عقل واحساس ، سامعہ وباصرہ اور جسم وجان میں سے ہر ایک کا تقاضہ یہ تھا کہ جان بچانے کے لئے حضرت امام حسین کم از کم اوپری دل سے ہی سہی یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے اور خود کو اور اپنے ساتھیوں کو تمام آفات ومصائب سے صاف بچا لے جاتے اور قرآن پاک کی رو سے اس کی اجازت بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

إِلاَّمَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ۔ ۸؎

مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار رہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان صدق دل سے ایمان پر قائم رہے ،لمحہ بھر کے لئے بھی ایمانی روشنی اور قلبی طمانیت اس کے قلب سے جدا نہ ہوئی ہوصرف کسی خاص حالت میں بہت ہی سخت دباؤ اور زبردستی سے مجبور ہوکر انتہائی خوف کے عالم میں گلو خلاصی کے لئے محض زبان سے منکر ہو جائے یعنی کوئی کلمہ اسلام کے خلاف نکال دے بشرطیکہ اس وقت بھی قلب میں کوئی تردد نہ ہو، بلکہ زبانی لفظ سے سخت نفرت ہو ایسا شخص مرتد نہیں بلکہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔ ہاں اس سے بلند مقام وہ ہے کہ آدمی مرنا قبول کرے،مگر منھ سے بھی ایسا لفظ نہ نکالے یہ عزیمت ہے جبکہ وہ رخصت ہے ۔حضرت امام موصوف نے عزیمت پرعمل کرکے دکھلایا۔ ......یہی ''عشق غیور ہے''۔

چنانچہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف جب کوفہ کے لئے روانہ ہوئے تو بعض صحابہ نے اس سفر سے انھیں روکا کہ کوفی لوگ قابل اعتماد نہیں ہیں۔مگر اس نصیحت کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا،اور ہوتا بھی کیسے؟ بیدل کہتے ہیں:

نصیحت کارگر نبود غریقِ عشق را بیدل
بدریا احتیاجِ در نباشد گوشِ ماہی را ۹؎

دریائے عشق میں ڈوبے ہوئے انسان پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، جس طرح سیپ کو دریا میں موتی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اور پختہ عزم وارادہ کے ساتھ بغیر کسی راہبر کے روانہ ہوگئے۔

عاشق بہ عزم مقصد محتاج راہبر نیست
پروانہ در تہِ بال مکتوب نور دارد ۱۰؎

عاشق کو کسی راہبر کی ضرورت نہیں ہوتی، پروانہ کے بازو تلے نور کا مکتوب ہوتا ہے ۔یعنی عاشق کا دل نور الٰہی سے منور ہوتا ہے جو اس کے لئے راہبری کا کام کرتا ہے، اس لئے اس کا عزم پہاڑ سے زیادہ مضبوط ومستحکم ہوتا ہے۔ پھر ان کا کاروان شوق ہرخطر سے بیگانہ اور ہر آفت سے ناآشنا ہوکر قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا۔ بھلا عاشق صادق کو امن وعافیت سے کیا واسطہ؟

کو منزل و چہ امن کہ در کاروانِ شوق

آسودگی ز آبلۂ پا رمیدہ است ۱۱؎

منزل کیا چیز ہوتی ہے ، اور امن وعافیت کسے کہتے ہیں؟ کاروانِ شوق کی آسودگی ان کے پاؤں کے آبلے کی وجہ سے ان سے کوسوں دور جاچکی ہوتی ہے اور آشفتگی و پراگندگی تو جنوں شیفتہ لوگوں کی قسمت میں داخل ہے۔

ما ''جنوں شیفتگاں'' امت آشفتگی ایم
وضع مارا بسرِ زلف پریشاں قسم است ۱۲؎

ہم ''جنوں شیفتہ لوگ'' تو آشفتگی کی امت ہیں ہماری حالت کو زلف پریشاں کی قسم ہے :

داغ عشقم نیست الفت با تن آسانی مرا
پیچ و تابِ شعلہ باشد نقشِ پیشانی مرا ۱۳؎

ہم تو عشق کی آگ میں تپے ہوئے ہیں ۔ہمیں تن آسانی سے کیا تعلق، ہماری پیشانی میں شعلہ کی سی پیچ وتاب نقش ہے۔

عاشقان در سایۂ برقِ بلا آسودہ اند
ابرو از تیغ است چشمِ خونفشاں زخم را ۱۴؎

عاشق حضرات تو برق بلا میں آسودگی محسوس کرتے ہیں۔

سوختن در ہر صفت منظور عشق افتادہ است
مشربِ پروانہ از آتش نداند نور را ۱۵؎

ہر حال میں پگھلنا اور جلنا تو عشق کا پسندیدہ عمل ہے ،پروانے کا مشرب یہ ہے کہ وہ آگ اور نور میں فرق نہیں کرتا۔

عشق غیور کے اس محرم نے آخر کار میدان کربلا میں دشمنوں سے لڑتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کردی۔

در راہ او نشستیم چندانکہ خاک گردیم
زین بیشتر چہ باشد صبر آزمائِ ما ۱۶؎

اس کی راہ میں اس قدر تگ و دو اور جنگ وجدل کی کہ آخر کار خاک ہو گئے ،ہمارے صبر وشکیبائی کی

اس سے بڑھ کر کیا آزمائش ہو گی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرلیا۔

ہر چند دریں گلشن ہر سو گلِ خود روئیست
از خونِ شہیدانت در رنگِ حنا بوئیست ۱۷؎

اس گلشن میں اگر چہ ہر طرف خود رو پھول اگے ہوئے ہیں مگر حنا کا جو رنگ ہے اس میں تیرے شہیدوں کے خون کی بو ہے۔

حوالے:

۱۔ دیوان بیدل دہلوی ، ناشر فروغی، بہ اہتمام حسین آہی، مطبوعہ تہران ص ۲۸۹

۲۔ ایضاً ص ۳۲۰

۳۔ ایضاً ص ۱۵۸

۴۔ ایضاً ص ۵۵

۵۔ دیوان غالب ،مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی، ص ۴۶

۶۔ دیوان بیدل مذکور، ص ۲۱۱

۷۔ مثنوی عرفان، مطبوعہ مطبع صفدری، بمبئی

۸۔ قرآن کریم ،سورہ نحل، آیت نمبر ۱۰۶

۹۔ دیوان بیدل مذکور ،ص ۷۶

۱۰۔ ایضاً ص ۵۲۲

۱۱۔ ایضاً ص ۲۱۳

۱۲۔ ایضاً ص ۳۰۳

۱۳۔ ایضاً ص ۶۸

۱۴۔ ایضاً ص ۹۱

۱۵۔ ایضاً ص ۹۵

۱۶۔ ایضاً ص ۹۲

۱۷۔ ایضاً ص ۳۵۶

]ب[

واقعہ کربلا: جوش ملیح آبادی کا معرکتہ الآرا مرثیہ
حسینؑ اور انقلاب

ڈاکٹر سید حسن عباس

اس حقیقت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے کہ واقعات کربلا نے عالمی ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں خاص کر ہمارا رثائی ادب تو واقعات کربلا کا ہی مرہونِ منّت ہے۔ اس عظیم واقعے نے نہ صرف انسانی شعور کو جھنجھوڑا ہے بلکہ احساس وادراک کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے اور ان

میں ایک نئی اور تازہ روح پھونکی ہے۔ انسانی شعور کے مختلف پہلوؤں پر اس کے گہرے اثرات کا جائزہ جناب شہید صفی پوری نے یوں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''انسانی شعور کے تین پہلو ہیں۔عقیدہ ،فکر اور احساس۔عقیدہ سے مذہب پیدا ہوتا ہے۔ فکر سے علم کی بنیاد پڑتی ہے اور احساس سے ادب عالم وجود میں آتا ہے (اور) واقعہ کربلا نے انسانی شعور کے ان تینوں شعبوں کو متاثر کیا ہے۔''[۱]

تاریخ شاہد ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اعزاء واصحاب نے شیطنت وبہمیت ، آمریت وبربریت ،ظلم وتشدد ،مطلق العنانی، لادینیت اور نام نہاد جمہوریت کے خلاف آواز اٹھائی اور یہی آواز ظالم کے خلاف مظلوم کی، جابر کے خلاف مجبور کی اور باطل کے خلاف حق کی آواز اور انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ امام حسین علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ اصول ونظریات سے ہٹ کر مطلق العنانی چارسو اپنا کام کررہی ہے۔ جائز وناجائز کی تفریق نہیں۔حرام وحلال کی کوئی قید نہیں ، مجبوروں کا استحصال اور مظلوموں پر تشدد بڑھتا جارہا ہے اور سب سے بڑھ کر اسلامی اصول حیات اور طرز معاشرت سے روگردانی کی فضا ہموار کی جارہی ہے، انسان پر انسان کی حکومت نہ صرف انسانیت کے خلاف ہے بلکہ اسلام نے اس کی کوئی اجازت نہیں دی ہے۔ اور حسینؑ قدروں کی شکست وریخت ، تہذیب کی پامالی اور زندگی کی شائستگی کو حرف غلط کی طرح مٹادینے کے نامعقول عزم وارادے کے خلاف ایسے ماحول میں اٹھے جب وقت کا دھارا بالکل بدلا ہوا تھا۔حسین حق کے علمبردار تھے۔ وہ ناحق کب تک برداشت کرسکتے تھے۔حسین اٹھے اور پوری جرأت سے اٹھے۔جبین نیاز پر آمریت سے ٹکرانے کی شکنیں ابھریں اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ دنیانے ایسے واقعات ، واقعہ کربلا سے پہلے کہاں دیکھے تھے؟ وقت خود انقلاب کا داعی تھا اور حسینؑ نبض شناس زمانہ— بقول علاّمہ کامون پوری:

> ''وہ حسینیت اس آمریت کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتی ہے جو اختیارات کے استعمال میں اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتی ہو، جو قانون کے بجائے فرمان جاری کرتی ہو، جو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں،نہ خدا کے سامنے نہ اخلاق کے سامنے—نفع عام کے بجائے جس کا شخصی مفاد کل انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہو، جس کے خلاف کوئی سنوائی نہیں ہوسکتی ، جو ہر چیز

طلب اور سلب کرسکتی ہے مزدور جماعت کی زندگی جس کے رحم وکرم پر ہوتی ہے آمریت خواہ فرد کی صورت میں ہو یا جماعت کی صورت میں، حسینیت اس سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔''۲؎

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے مسدس ''حسین اور انقلاب'' کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہئے، جوشؔ کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے ان کی بے باکی، جرأت وہمت اور ظلم وتشدد کے ماحول میں نعرۂ انقلاب بلند کرنے کا ان کا جوش وجذبہ جو ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے، در اصل حسینیت کے عزم و استقلال نے ہی ان کے دل میں پیدا کیا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت اور شاعری پر سردار نقوی کا یہ تبصرہ بے حد مناسب تبصرہ ہے اگر چہ وہ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق ہیں۔ سردار نقوی لکھتے ہیں۔

'' حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی شاعرانہ عظمت و بلندیٔ کمال اس حد پر جلوہ گر ہے جس کی سطح دیگر لوگوں کے لئے نہ صرف یہ کہ نا قابل رسائی ہے، بلکہ بہت سے لوگوں کے لئے نا قابل فہم بھی ہے، یہ عظمت کمال کی وہ حد ہے جس کے استحسان واعتراف کے لئے بڑے ذوق فطرت کی ضرورت ہوتی ہے، جوشؔ صاحب کا فطری قد اپنے زمانے کی عمومی ذہنی سطح سے نہایت ممتاز اور منفرد ہے۔ ان کے افکار وخیالات کی بلندیوں اور ان کے الفاظ واشعار میں پنہاں معانی کی گہرائیوں کی دادنہ دینا یہ ظلم ہے اور ان کے افکاروخیالات کو پست تر ذہنی سطح کی کسوٹی پر پرکھ کر انہیں تنقید وطنز کا نشانہ بنانا، یہ گویا ظلم بالائے ظلم ہے۔ ۳؎

ہر دور میں حساس ذہن ودل نے امام حسینؑ کی قربانیوں اور کارناموں کوخراج عقیدت پیش کیا ہے ایسے لوگوں میں شعراء پیش پیش رہے ہیں جن میں جوشؔ ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔ جوشؔ کا معرکۃ الآرا مسدس ''حسین اور انقلاب'' تاریخی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ اردو کے جدید مرثیے کی ابتدا باضابطہ طور پر اسی مسدس سے ہوتی ہے، یہ مسدس ٦٧ بند پر مشتمل ہے، اس کی شروعات یوں ہوتی ہے:

ہمراز یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ دودن کی زندگی کا غم این وآں نہ پوچھ

کیا کیا حیات ارض کی ہیں تلخیاں نہ پوچھ کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں نہ پوچھ
تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرط شرم سے منھ ڈھانپنے لگے

یعنی جوشؔ مسدس کے آغاز میں ہی یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ جس واقعہ کو بیان کرنے جارہے ہیں وہ کس قدر المناک اور غم انگیز ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ ظلم جو کچھ لوگوں پر روا رکھا گیا، کس قدر بھیانک ظلم تھا، جوشؔ امام حسینؑ کی شخصیت سے بیحد متاثر تھے اور یہی وجہ ہے کہ جوشؔ نے ''حسین اور انقلاب'' میں امام حسینؑ کی وہ شخصیت منعکس کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جو ان کی آئیڈیل ہے اور انقلاب کے لئے ایسی ہی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی نظر میں خدائی احکام کے نفاذ کی اہمیت ہر چیز سے بڑھ کر اور بالاتر ہے۔

امام حسینؑ کی ذات محتاج تعارف نہیں پھر بھی جوشؔ نے واقعات کے بیان میں امام حسینؑ کا تعارف کرا کر قاری کی تشنگی دور کردی ہے۔ حسین روح انقلاب کے پروردگار کا تعارف جوش نے یوں کرایا ہے۔ ؎

جس کی رگوں میں آتش بدروحنین ہے
اس سورما کا اسم گرامی حسینؑ ہے

تئیپھگفد،،،،

لی جس نے سانس رشتۂ شاہی کو توڑ کے
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کے

تئیپھگفد،،،،

سنتا نہ کوئی دہر میں صدق وصفا کی بات
اس مرد سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات

تئیپھگفد،،،،

رنگ اُڑ گیا حکومت بدعت شعار کا
عزم حسینؑ عزم تھا پروردگار کا

تئیپھگفد،،،،

مسدس کے اٹھارہ بند تمہیدی ہیں ان کی تمہید بڑی فکر انگیز ہے ہر ہر لفظ جادو کا سا اثر رکھتا ہے ویسے بھی جوشؔ لفظوں کے جادوگر مشہور ہیں۔ وہ انقلاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ کتنی سنگلاخ راہ ہے۔ ؎

بے جرم خود کو جرم میں جو راندھ لے وہ آئے
اس راہ میں جو سر سے کفن باندھ لے وہ آئے

تئیپھگفد،،،،

ہرگام پر حیات کے چہرے کو فق کرے
مرنا جو چاہتا ہے وہ اعلان حق کرے

تئیپھگفد،،،،

اُلجھے جو اس کے گیسوئے پیچاں کے جال میں
لگ جائے آگ دامن قطب شمال میں

تئیپھگفد،،،،

یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے شیر نر کا دل
اس تہلکے کو چاہئے فوق البشر کا دل

لیکن انقلابی شخصیتوں کو پرچم حق بلند کرنے اور انسانیت کا حق ادا کرنے کی راہ میں طرح طرح کے دشنہ وخنجر اور تشنیع وطعن کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے جوشؔ کہتے ہیں: ؎

ہوتاہے جو سماج میں جویائے انقلاب
ملتا ہے اس کو مرتد و زندیق کا خطاب
پہلے تو اس کو آنکھ دکھاتے ہیں شیخ و شاب
اس پر بھی وہ نہ چپ ہو تو پھر قوم کا عتاب
بڑھتا ہے ظلم و جور کے تیور لئے ہوئے
تشنیع وطعن و دشنہ و خنجر لئے ہوئے
اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا

رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہان کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا
قرنا وطبل و ناوک و رایت کا سامنا
لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

امام عالی مقام اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے دشت نینوا میں وارد ہوتے ہیں۔ لب فرات خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔کئی ماہ کی مسافرت کی خستگی اور گرمی کی تپش کی شدت سے ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ باطل اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ سد راہ ہوتا ہے، اس سے پہلے بھی حر اور اس کے فوجی دستے کی صورت میں سامنے آیا تھا اور وادی رنج والم میں اسی دستے نے آپ کو پہنچایا تھا، امام عالی مقام فرات سے خیمے ہٹالینے کا حکم دیتے ہیں اور صاحب دل جوش کے دل سے آہ نکلتی ہے ؎

حق تشنہ لب ہو دشت میں باطل لب فرات

اس مصرع کی سادگی اور صفائی سے ہٹ کر صرف اس کے آہنگ اور استفہام پر نظر ڈالی جائے تو یہ مصرع ''پورے تمدن کا استفہامیہ بن کر ابھرتا ہے۔۳؎

جس نے خدا کی بات رکھ لی اور رشتۂ شاہی کے تانے بانے بکھیر دیئے۔ اب جوش موجودہ دور کی استحصال پسندی، کشاکس اور قدروں کی شکست وریخت کے پیش نظر ایک بار پھر ''حسینی انقلاب'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ زمانہ ایک بار اور انقلاب کے ہچکولے کھائے اور پھر کوئی حسین اس دور کے یزید سے ٹکرائے نیز انسانیت کو انسانیت دشمنوں کے خونی چنگل سے آزاد کرائے۔

پھر حق ہے آفتاب لب بام اے حسینؑ
پھر بزم آب وگل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسینؑ
پھر حریت ہے مورد الزام اے حسینؑ
ذوق فساد و ولولۂ شر لئے ہوئے
پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے
پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو!

سرمایہ پھر ہے برسر آزار دوستو
تا کے یہ خوف اندک و بسیار دوستو
تلوار! ہاں! اُپی ہوئی تلوار دوستو
جو تیز تر ہو خون امارت کو چاٹ کے
رکھدے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کے

جوشؔ-- اپنی جذباتی فطرت سے مجبور ہوکر نعرہ زن ہوتے ہیں، گرمیٔ گفتار نے اس مسدس کو جذبات کا ایک لبریز آبگینہ بنادیا ہے، راز و نیاز اور مصلحت پسندی کے بجائے جوشؔ راست انداز میں اپنے احساسات کے ساتھ دنیا کی کج روی اور انسانیت کشی پر تبصرہ کرتے ہیں اگرچہ اس طرح افکار اور اظہار کی یکسانیت کا احساس نمودار ہوتا ہےلیکن الفاظ کی ترتیب ودروبست مصرعوں کا آہنگ اور لَے نیز استعاروں اور نئی ترکیبوں کی جدت، احساس شگفتگی پیدا کرتی ہے، یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ الفاظ پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی جب جس لفظ کو جہاں رکھ دیا گویا انگشتری پر نگینہ جڑ دیا۔

آخر میں جوش جانشین حیدرؓ کرار سے مدد طلب کرتے ہیں ؎

اے جانشین حیدر کرار المدد — اے منچلوں کے قافلہ سالار المدد
اے امر حق کی گرمیٔ بازار المدد — اے جنس زندگی کے خریدار المدد
دنیا تری نظیر شہادت لئے ہوئے
اب تک کھڑی ہے شمع ہدایت لئے ہوئے

منابع:

۱۔ واقعہ کربلا بین الاقوامی نقطۂ نظر سے مجموعہ ہفتہ وار سرفراز محرم نمبر، ص ۷
۲۔سردار نقوی: انقلابی پیغام کا مبلغ، مجلہ جوش انجمن سادات امروہہ، کراچی
۳۔عرض ہنر: ڈاکٹر محمد حسن، ص ۱۴۲

]ب[

انسانیت، حسینؑ کی سایۂ عاطفت میں

سید محمود حسن ضیاء بوترابی

دنیا کی وہ تمام مقتدر اور عظیم الشان ہستیاں جن سے زندگی کے اہم معاملات کی وابستگی ہوتی ہے۔ میدان عمل میں قدم بڑھانے کے لئے پورے غور وفکر کے ساتھ کم وبیش پروگرام بنایا کرتی ہیں۔ یہ پروگرام ماضی کے تجربوں کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مقدمات کی غلط ترتیب یا ان سے غلط نتائج نکالنے کی بنا پر انسان اپنی زندگی کو ایسے خطرات کے سپرد

کردیتا ہے جن سے بچنا ممکن سا نظر آنے لگتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے غلط اقدام اس کے سابقہ حسن عمل کو بدنامی کے سیلاب میں حسن وخاشاک کی طرح بہادیتے ہیں۔ سامنے آنے والے واقعات کبھی کبھی ایسی بھیانک اور ڈراونی مشکلوں سے نمودار ہوتے ہیں کہ انسان کا تدبر حواس باختہ ہوکر اپنے عمل کے صحیح راستے کو کھوبیٹھتا ہے۔ انسان کے غور وفکر کی گہرائی، ذہانت اور ذکاوت کی پنہائی جانچنے کے یہی موقع ہوتے ہیں۔

امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد سے ۶۰ھ تک بنی امیہ کے کارناموں کا گہرا معالعہ کرنے کے بعد امام حسینؑ اس نتیجے پہنچ چکے تھے کہ ہمارا اور ہمارے ساتھ دین اسلام کا مستقبل بہت تاریخ ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ناگزیر ہے۔ اگر اسلام کو بچانا ہے تو اب بڑی سے بڑی قربانی کسی نادر اور اچھوتے پروگرام کے تحت دینا ہوگی اور اگر اپنی جان عزیز ہے تو پھر اسلام کی خیر نہیں۔ ایک معصوم تدبر کے لئے اس سے زیادہ نازک دور نہیں ہوسکتا۔ جان ایسی چیز نہیں کہ انسان اس کو بے سوچے سمجھے کسی پیش آنے والے حادثے کی بھینٹ چڑھادے۔ اور دین بھی ایسی معمولی چیز نہیں کہ کسی عاقبت برباد کے ہاتھوں میں اسے کھلونا بنادیا جائے۔ معاویہ کی زندگی میں جب یزد کی ولیعہدی کا مسئلہ اہل مکہ ومدینہ کے سامنے آیا تھا تو ان سب کو اس اہم معاملے میں دعوت غوروفکر دے رہا تھا جن کو اسلام کے مقابل اپنی جانیں عزیز تھیں وہ اپنے دروازے بند کرکے اور زبانوں پر مہر سکوت لگاکے بیٹھ رہے۔ اسلام کا حشر کیا ہوگا اس پر زیادہ غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔

امام حسینؑ کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ اسلام ان کے گھر سے نکلا تھا۔ ان کے نانا کا دین تھا۔ جو درد اسلام کا ان کے دل میں تھا وہ دوسرے کے دل میں ہو نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مرنے سے پہلے یہ فیصلہ حتمی طور پر کرلیا تھا کہ مجھے جان نہیں بلکہ اسلام بچانا ہے۔

یزید کی تخت نیشنی اور بیعت طلبی کے بعد یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ جان کی قربانی دے کر اسلام کے بچانے کی صورت کیا ہوگی۔ امامؑ کی معصوم فطرت کے سامنے جان دینے کی مختلف صورتیں آرہی تھیں اور امام کو ان میں سے ایک بہترین طریقہ اپنی قربانی کا اختیار کرنا تھا اور اسی کے لحاظ سے زندگی اور موت کا ایک ایسا اچھوتا پروگرام بنانا تھا کہ دشمن اپنے حربوں میں ناکام ہوجائے اور انکی قربانی کے بعد اسلام تمام خطروں سے باہر نظر آئے۔

پہلا سوال اس سلسلے مین امام علیہ السلام کے سامنے یہ آیا کہ کیا طاقت کا مقابلہ طاقت سے

کیاجائے ؟ معصوم عقل اثبات میں اس کا جواب دے نہیں سکتی تھی۔ایسی حالت میں جبکہ امام کے پاس نہ فوج ہے جبہ خزانہ نہ حکومت ہے، نہ قبائلی ہمدردی اس حریف سے ٹکراجانا۔جس کے پاس بے انتہا فوج ہے، بے انتہا خزانہ ہے، ایک منظم سلطنت ہے یقینا خودکشی کا مترادف ہوگا۔ اور دنیا کے ارباب عقل وفہم اس عدم تدبر اور غلط اقدام پر رہتی دنیا تک طعنہ زنی کرتے رہیں گے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا دشمن کی چمکتی تلواروں کے نیچے سہم سہم کر گردنیں رکھ دینی ہوگی ؟ اگر یہ ہوگا تو اور بھی برا ہوگا۔ ہاشمی شجاعت کے مایہ ناز کارنامے گہری گور میں جاسوئیں گے۔ خاندانی شرافت کے دامنوں کو آگ لگ جائے گی۔ بزدلی اور نامردی کلنک کا ٹیکہ بن کر منھ دکھانے کے قابل نہ رکھے گی۔

یہ دونوں صورتیں چونکہ انتہائی مذموم تھیں لہٰذا امامؑ نے ان کے بین بین ایک ایسا راستہ اپنے مقابلے کے لئے پیدا کیا جو اپنی نظیر آپ تھا۔

کثرت کا مقابلہ قلت سے ،قوت کا مقابلہ ضعف سے، اور ظلم کا مظلومیت سے کرنا ہے لیکن اس طرح کہ کسی مرحلے میں ہمیں کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھانا پڑا، تا کہ کل کوکوئی یہ نہ کہے کہ امام حسینؑ نے خروج کیا یا حسینؑ نے جنگ کی ابتدا کی۔ ہاں جب دشمن جنگ کا آغاز کرے تو پھر اپنی موروثی شجاعت کے جوہر دکھا کر نام اسلام پر قربان ہوجانا چاہئے۔ یہ تھا حسینؑ کا آخری فیصلہ جو مدینہ کی روانگی سے قبلہ کرلیا گیا۔ اب اس کو عملی صورت میں لانے کے لئے ایک پروگرام بنا تا تھا جس کی دفعات بہت جلد امام علیہ السلام کے ذہن میں آگئیں۔

۱۔ یزید کی بیعت کسی صورت میں نہیں کرنی ہے، ورنہ دین برباد ہوجائے گا۔

۲۔ مدینہ میں رہ کر نہیں کرنا، ورنہ حرم رسولؐ کی حرمت ضائع ہوجائے گی۔

۳۔حرم خدا سب کے لئے پناہ کی جگہ ہے ، پہلے وہاں چلنا ہے ۔اگر دشمن آمادہ قتال آیا تو وہاں کا قیام بھی ترک کرنا ہوگا تا کہ حرمت حرم خدا [illegible]ظ رہے۔

۴۔قبائل میں پروپگنڈہ کرکے ان کو اپنی کمک ومدد پر آمادہ نہیں ۔ ورنہ یہ ارادہ جنگ کی دلیل ہوگا۔

۵۔عورتوں اور بچوں کے ساتھ لے جانا ہے۔تا کہ دشمن واقعۂ شہادت کو چھپانہ سکے۔ ان کے ذریعے سے شہر بہ شہر اور دیار بہ دیار یزیدی مظالم کی قلعی کھولی جائے گی۔ بنی امیہ کی بے دینی کو

طشت از بام کیا جائے گا۔

۶۔ مدافعہ میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ مکروفریب کی ہلکی سی جھلک بھی کہیں پیدا نہ ہو۔

۷۔ مصائب وآلام کے انتہائی ہجوم میں بھی احکام الٰہی کی خلاف ورزء ہوگی۔

۸۔ ظالم کے ہر ظلم کو صبر وضبط سے جھیلا جائے گا۔

۹۔ پورے استقلال سے قدم جما کر شہادت کی منزلیں سر کی جائیں گی۔

۱۰۔ ہر ہر قدم پر رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

جب یہ پروگرام بن گیا تو حسینی قافلہ مدینہ سے روانہ ہوا۔ عبد اللہ بن زبیر کی طرح چور راستے سے نہیں بلکہ شاہرا عام سے گزرتا ہوا گیا۔ تا کہ اس کا شائبہ بھی نہ ہو کہ ہم کو اپنے جرم کا احساس ہے جب ہم مجرم نہیں، بزدل نہیں تو منہ چھپا کر کیوں نکلیں، ڈنکے کی چوٹ پر جاتے ہیں، جسے روکنا ہو روکے۔ ابتدائے جنگ کا الزام اس پر عائد ہوگا۔

یہی وہ بے مثل پروگرام تھا جو امام حسینؑ کی صداقت کا امام حسینؑ کے درد دین کا، امام حسینؑ کی حق پسندی اور روشن کرداری کا گواہ بنا۔ یہی وہ پروگرام تھا جس نے اقوام عالم کے دلوں میں امام حسینؑ کی عظمت کا نقش جما دیا۔ یہی وہ فکری انقلاب تھا جس نے یزید کو اس کے تمام ناپاک ارادوں میں ناکام بنا دیا۔ اور یزیدی سطوت کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ اور حق کو باطل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

دنیا میں بے شمار لڑائیاں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ آپ دنیا کی تاریخ کی ورق گردانی کر کے کوئی ایک واقعہ نکال دیجئے جس میں حسینی پروگرام وانقلاب کی کوئی دفعہ بھی پائی جاتی ہو۔ ہر فریق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس حیلے سے بھی ممکن ہو اپنے حریف پر فتح پالوں۔ کربلا کی جنگ میں جو کردار امام مظلوم اور ان کے انصار نے پیش کیا اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

آنکھوں سے دیکھنا تو کیا، شاید کسی نے کانوں سے بھی نہ سنا ہوگا کہ دشمن کے مقابلے کے وقت کوئی ایسی جماعت کو یہ کہہ کر کم کر رہا ہوں کہ کل میرے ساتھ جو شخص بھی رہے گا۔ وہ ضرور قتل ہو جائے گا۔ میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں نے اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھالی۔ اس پردۂ شب میں جس کا دل چاہے چلا جائے۔ یہ صرف امام حسینؑ ہی کے پروگرام کی عجیب وغریب کشش تھی جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کیا دنیوی لڑائیاں اس طرح لڑی جاتی ہیں۔

کیا کوئی اور بھی امام حسینؑ کے سوا آپ کو ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنی فوج کو بڑھانے کے بجائے گھٹایا ہو۔ بجائے سبز باغ دکھادکھا کرلڑانے کے ان کو مرنے کی خبر پہلے سے سنادی ہو۔

امام حسینؑ اور صرف امام حسینؑ ہی کے جنگی پروگرام کی یہ دفعہ ہوسکتی ہے کہ اگر موقع ملے تو دشمن کے ساتھ بھی احسان کیاجائے ۔ اس کی عملی صورت حر کی پیاسی فوج کو پانی پلانا تھا۔ اگر حسینؑ ذرا دیر اپنی مشکوں کے دہانے نہ کھلواتے تو ایک ہزار دشمن پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر مرجاتا۔لیکن اگر امام حسینؑ ایسا کرتے تو پھر حسینؑ حسینؑ نہ رہتے۔ یہ اتنا بڑا احسان تھا کہ دشمن میں ذراسی بھی انسانیت ہوتی تو اس کو ہرگز نہ بھولتا۔ اس وقت کربلا مین یہ لوگ موجود نہ تھے جب امام حسینؑ ایک شیرخوار بچہ کو ہاتھوں پر رکھے پانی مانگ رہے تھے۔ اگر امام حسینؑ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس وقت ضرور یہ کہہ اٹھتا کہ ذرا میرے اس احسان کو یاد کرو کہ میں نے کیسے سخت وقت میں تمہیں پانی پلایا تھا۔تم کیسے احسان فراموش ہو کہ چند ہی روز میں میرا احسان بھلا دیا۔مگر امام حسینؑ کی زبان سے ایسا کوئی کلمہ نہیں نکلا۔ اپنے اس احسان کا اشارۃً وکنایۃً بھی ذکر زبان پر نہیں آنے دیا۔ امام حسینؑ قرآنی تعلیم کے خلاف نہ کوئی قدم اٹھانا چاہتے تھے نہ ایک لفظ منھ سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کو قرآن کا یہ یہ حکم معلوم تھا ''لاَتُبْطِلُوا صَدَقَاتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَی'' غورکریں کہ کتنا فرق ہے عام لڑائیوں میں اور امام حسینؑ کی جنگ میں۔ وہ گھر سے تخت وتاج کا مالک بننے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ یہ لوگوں کو اسلام کے بھولے ہوئے سبق یاد دلانے آنے تھے۔ لوگ بھولے ہوئے تھے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔''هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلاَّ الْإِحْسَانُ''امام حسینؑ نے معلوم کرنا چاہا کہ اس پرعمل ہے یانہیں۔ پہلے احسان کیا پھراس کے بدلے کےمنتظر رہے۔لیکن پتہ چل گیا کہ اس قسم کے اخلاقی فضائل وہ قابل توجہ سمجھتے ہی نہیں۔

ایک بھوکے پیاسے گروہ پرفوج یزید کا مظالم کے پہاڑ گرانا اور رحم وہمدردی کو قطعاً دل سے نکال دینا کیا اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ کی طرح امام حسینؑ بھی اس کی بدعا کے لئے ہاتھ اٹھادیتے کہ خداوند عالم ان کو ملیا میٹ کردے۔مگر اما حسینؑ نے ایسا نہیں کیا۔ جوان بیٹا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ بیٹھا۔ برابر کا بھائی خاک اور خون میں لوٹ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ چھ مہینے کا بچہ مظلوم باپ کے ہاتھوں پرتڑپ تڑپ کر مرگیا۔لیکن اس پر بھی امام حسینؑ کے ہاتھ بددعا کے لئے نہ اٹھے۔ اگر زبان سے کہا بھی تو اتنا ''رضاً بقَضَائه وَتَسليماً لأمره'' کیا دنیوی لڑائیاں

ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کیا دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے یہی ڈھونگ ہوتے ہیں۔

امام حسینؑ جس فتح کے متمنی بن کر کربلا میں آئے تھے وہ دنیاوی فتح نہ تھیوہ دشمن کو فنا کرکے کامیابی کا جھنڈا بلند کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی فتح مظلومیت میں تھی۔ان کی فتح سوکھا گلا کٹوانے اور گھر بار لٹوانے میں تھی۔ ان کی فتح اپنے تمام لشکر کو شہید دیکھنے میں تھی۔ چنانچہ خدا کے فضل سے یہ فتح امام حسینؑ کو حاصل ہوگئی۔

یزید لاکھوں فوج رکھنے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ وہ بیعت لینی چاہتا تھا نہ لے سکا اور امام حسینؑ نے بیعت نہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ یزید فنا ہوگیا اب اس کی قبر کا نشان تک نہیں ملتا۔مگر کربلا میں جاکر دیکھیں حسینؑ کا دربار سجا ہوا ہے۔ بڑے بڑے سلاطین کج کلاہ کس طرح فخر ونیاز کے ساتھ ان کی آستانہ قدس کو بوسہ دیتے ہیں۔ یزید کے نام لیوا اگر ہیں تو چند عاقبت برباد جنگی گردنوں پر شیطان سوار ہے۔ اور امام حسینؑ کے اصول زندگی کا احترام کرنے والے عقیدت کے پھول نثار کرنے والے ان کی محبت کا نقش دل پر جمانے والے کروڑوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔شمع حسینیت کے پروانے نہ صرف مسلمان ہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم کے افراد۔

انہیں تمام باتوں کے مدنظر مجھے یہ شعر کہنا پڑا۔

ہے یزید آباد دنیا میں کہیں
ہند میں جیسے حسین آباد ہے۔

یہ بدون تردید حقیقت ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اصول انسانیت کی قدر ہے وہ ابدالآباد تک حسین مظلوم کے گرویدہ رہیں گے۔ ظالم ظلم کرتے کرتے آخر تک گئے مگر وہ صبر کرتے کرتے آخر نہیں تھکے۔ انہوں نے اپنے غیر محدود ے صبر سے دنیا کو بتلادیا کہ ظالم کے ظلم کی حدیں ہوسکتی ہیں مگر ہماری قوت صبر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے ساری دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حضرت امام حسینؑ کی شخصیت عالم گیر بھی ہے اور فقیہ المثال بھی۔

]ب[

شہر یار کی علامتی شاعری میں واقعۂ کربلا

ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق

نئی غزل کو جن شاعروں نے علامتی شاعری کے ذریعہ متعارف کرایا ان میں شہر یار کا نام بہت نمایاں ہے شہر یار نے معاصر عہد کی صورت حال کو علامتوں کے پردے میں منعکس کیا ہے وہ تہذیبی واخلاقی انحطاط اور انسانی اقدار کے زوال سے خوف زدہ اور افسردہ ہیں ان کا یہی خوف اور افسردگی ان کی شاعری پر محیط ہے انہوں نے اس کا اظہار سمندر، دریا، پیاس، شہر، گھر، دشت ،صحرا،

ہوا، دن، رات ،سورج ، دھوپ اور سراب وغیرہ علامتوں کے پیرائے میں کیا ہے۔لیکن نیند، خواب، دھند،غبار، ریت،سایہ، پرچھائیں وغیرہ ان کی مخصوص علامتیں ہیں در اصل ان کی شاعری خواب اور حقیقت کا تصادم،قنوطیت، بے یقینی، لا حاصلی، ناامیدی اور فریب ذات وکائنات سے عبارت ہے۔

شہریارجس زمانے (۶۰ئ) میں شعری منظرنامے پرطلوع ہوئے اس وقت ہمارے جدید شاعر قدیم علامتوں میں نئے معنی ومفاہیم کی جستجو کے ساتھ نئی علامتوں کی تشکیل وتفحص میں مصروف تھے یہی وہ عہد ہے جس میں'واقعہ کربلا' اردو شاعری میں ایک تخلیقی رجحان کی حیثیت اختیار کررہاتھا اس کی سب سے بری وجہہ یہ تھی کہ اس دور میں ہم جن مسائل ومشکلات کا سامنا کررہے تھے اس صورت حال اور کیفیت کی ترجمانی کیلئے واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات مناسب ترین ذریعۂ اظہار محسوس ہورہے تھے نیز علامات کربلا کونئی شاعری میں اس لئے بھی زیادہ استعمال کیا گیا کہ اس کے اطلاقات کا دائرہ وسیع اور کثیر المعنی ہے۔

واقعہ کربلا اور اس سے وابستہ عناوین وموضوعات ابتداہی سے ہماری شعری روایت کا حصہ رہے ہیں اور ان کے مفاہیم بھی تسلیم شدہ ہیں چنانچہ جدید شاعروں نے اپنی شاعری میں واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات کاشعوری استعمال کیا انہی جدید شاعروں میں شہریار بھی شامل ہیں جنھوں نے واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات میں نئے معنی ومفاہیم کو دریافت کیا، ہم اپنے اس مقالے میں شہریار کی شاعری میں واقعہ کربلا اور اس سے مخصوص علامتوں کا تفصیل سے جائزہ لیں گے لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی کردیاجائے کہ واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات شہریار کی شاعری کا کلیدی موضوع نہیں بلکہ جزوی موضوع ہیں۔

شہریار کی شاعری میں واقعہ کربلا کے علامتی اظہار کا آغاز ستر کی دہائی سے ہوا، ان کا پہلا مجموعہ ''اسم اعظم''۶۵ء میں منصۂ شہود پر آیا اس کی نظموں اور غزلوں میں کہیں علامات کربلا کا استعمال نہیں ہوا، شہریار کے یہاں علامات کربلا کا استعمال ''ساتواں در''۱۹۶۹ء سے شروع ہوا۔ اس کے بعد ''ہجر کے موسم''۱۹۷۹ئ'' خواب کا در بند ہے''۱۹۸۵ء''نیند کی کرچیں''۱۹۹۵ء میں بتدریج اپنے معنوی امکانات کو روشن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شہریار کی نظموں اور غزلوں دونوں میں ان علامتوں کا استعمال ہواہے۔ عرض کیاجاچکاہے کہ یہ شہریار کی شاعری کامرکزی موضوع نہیں ہے لہٰذا اس کا استعمال ان کی شاعری میں بہت زیادہ تونہیں ہواہے مگر جہاں بھی ہواہے وہاں یہ علامتیں اپنی معنویتوں کو پوری طرح

منور کررہی ہیں شہر یار نے ان کے وسیع تر امکانات کی جستجو کے بعد انہیں اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے آیئے! دیکھتے ہیں کہ شہر یار کی نظموں میں یہ علامتیں کن معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں اس سلسلے میں ''ساتواں در'' سے ان کی ایک نظم ''خواب حسینؑ کے وارثوں سے'' ملاحظہ فرمائیں:

میں مانتا ہوں
تم خواب حسینؑ کے وارث ہو
میں جانتا ہوں
تم پیاس کی شدت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہنے والے
تسلیم مجھے
جس راہ میں نشیب وفراز نہیں
وہ راہ جنوں کی راہ نہیں
یہ راز مگر بتلاؤ مجھے
تلوار کا سایہ سر کی بلندی کے درپے ہے
کوفۂ زیست میں قطرۂ آب امید نہیں ہے
پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے

مجھے اس نظم کی قرأت کرتے وقت خلیل الرحمن اعظمی یاد آرہے ہیں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''ساتواں در کی بعض نظمیں دیکھنے میں ایسی سیدھی سادھی لگتی ہیں کہ پہلی نظر میں گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان کے پیچھے گہری فکر ہے۔'' شہر یار کی یہ نظم اسی طرح کی ایک نظم ہے کہ جو بظاہر دیکھنے میں سیدھی سادی ہے مگر اس کے متن میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

یہ نظم گیارہ مصرعوں پر مشتمل ہے اس میں شہر یار کی وہ بیشتر علامتیں موجود ہیں جو ان کی شاعری کا اختصاص ہیں مثلاً خواب، پیاس، سراب، دریا، جنوں وغیرہ۔ نظم کا آغاز ایجابی لہجہ میں واحد متکلم کے صیغہ میں ہوتا ہے شاعر کہتا ہے کہ میں قبول کرتا ہوں کہ تم خواب حسینؑ کے وارث ہو۔ آغاز ہی میں شاعر کا مخاطب کو حسینؑ کا وارث نہ کہہ کر خواب حسینؑ کا وارث قرار دینا بھی معنی خیز ہے کیونکہ حسینؑ کا وارث ہر وہ شخص ہوسکتا ہے جو نسل حسینؑ سے ہے مگر خواب حسینؑ کے وارث وہی اشخاص ہوسکتے ہیں جو حسینؑ کے ارفع واعلیٰ مقاصد کی اہمیت ومعنویت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نیز ان

کے تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔

عرض کیا جاچکا ہے ''خواب'' شہر یار کی مخصوص علامت ہے یہ کہیں شہر یار کے یہاں انسانی خواہشوں اور آرزوؤں کی پناہ گاہ ہے تو کہیں ناکام ارادوں کی فرودگاہ ہے کہیں حقائق کی باز آفرینی کا ذریعہ ہے مگر یہاں 'خواب' مقصد کی ترجمانی کررہاہے اور یہ مقصد بھی معمولی مقصد نہیں، کوئی عظیم مقصد ہے ۔شاعر ہمیں ابتدا ہی میں اس مقصد کی اہمیت ومعنویت کا احساس کرانا چاہتاہے کہ تم ''خواب حسینؑ'' کے وارث ہو اور خود حسینؑ ''خواب ابراہیمؑ'' کی تعبیر ہیں۔شہر یار نے ایک مصرعہ میں پورے تاریخی منظر نامہ کو ہمارے قرطاسِ ذہن پر منور کردیا ہے اس کے بعد انتہائی منفعل لہجہ میں کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہے تم پیاس کی کیفیت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہہ سکتے ہو، یہاں 'پیاس' انسانی احتیاج کی علامت ہے اور 'سراب' فریب نظر (باطل) ہے 'دریا' زرخیزی (حق) کی علامت ہے مطلب یہ ہے کہ تم سخت ترین حالات میں بھی تلبیس حق نہیں کرسکتے اور نہ باطل کے فریب میں مبتلا ہوسکتے ہو، کیونکہ تمہیں حق کا عرفان حاصل ہے۔ شاعر اپنے تیقن کا اظہار کرکے اچانک لہجہ بدل دیتاہے اور آگہی کے لہجے میں کہتاہے کہ مجھے یہ سب تسلیم ہے مگر یاد رہے جس راہ میں مشکلیں اور دشواریاں نہ ہوں وہ راہ جنوں کی راہ نہیں ہوسکتی، جنوں شہر یار کے یہاں جہد مسلسل کی علامت ہے یعنی جب تک انسان میں اپنی منزل مقصود کو پانے کا جنون نہیں ہوگا اس وقت تک اسے کامیابی نہیں مل سکتی۔ یہاں منزل مقصود ''جنوں کی راہ'' شہادت کی راہ ہے۔آخر کے چار مصرعوں میں شہر یار خواب حسینؑ کے وارثوں سے استفہامیہ لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم مجھے ذرا یہ تو بتلاؤ کہ آخر کب تک خوابِ غفلت میں رہوگے دشمن کی تلواروں کے سائے تمہارے سروں کی بلندی تک آپہونچے ہیں (یہاں تلوار کے بجائے تلوار کے سائے کا سروں تک پہنچنا بھی قابل التفات ہے یعنی ابھی تحفظ کے امکانات باقی ہیں) اور تم ابھی بھی کوزۂ زیست میں قطرۂ آب امید سے محروم ہو۔ یعنی دشمن کی تلواروں کا سایہ بھی تمہارے جذبۂ شجاعت کو مہمیز کرنے میں ناکام ہے کیونکہ نفاق تمہاری حیات کا ناگزیر حصہ بن چکاہے لہٰذا اب امید کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے۔'' پھر بھی'' کا ٹکرا اس بات کی غمازی کررہاہے کہ خواب حسینؑ کے وارث شہادت جیسے عظیم اعزاز کے لائق نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ان میں اس اعزاز سے سرفراز ہونے کی خواہش موجود ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میدان عمل میں شہادت حاصل کرنے کا حوصلہ

ان میں نہیں ہے۔ نظم کے آخری مصرعوں میں کوفۂ زیست اور ''قطرۂ آب امید'' کی تراکیب نے نظم کے سیاق وسباق کو روشن کر دیا ہے۔

''ساتواں در'' سے اس سلسلے کی ایک اور نظم دیکھئے، یہ نظم مندرجہ بالا نظم کی توسیع معلوم ہورہی ہے:

ہوا کی زد میں چراغ امید کب نہیں تھا
مگر ہاتھوں کی کپکپاہٹ
لبوں پر ریگ سکوت
آنکھوں میں آنسوؤں کے امنڈتے دریا
تم اپنے آباء کے کارناموں سے بے خبر ہو
حسین ابن علی کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

اس نظم میں بھی شہریار کی بعض مخصوص علامتیں ہوا، ریگ، آنسو، دریا وغیرہ موجود ہیں لیکن یہاں یہ علامتیں نئے معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں۔ اس نظم میں شہریار نے حسین ابن علیؑ کے وارثوں کو اُن کی حقیقی وراثت ''شہادت'' کی یاد دلائی ہے اور راہِ شہادت سے فرار اختیار کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں کہ ہمیشہ سے اہل وفا (حق پرستوں) کی امیدوں کا چراغ ہوا کی زد میں رہا ہے ''ہوا'' یہاں تخریبی طاقتوں کی علامت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ تخریب کار ہمیشہ سے چراغ حق کو بجھانے کے درپے رہے ہیں لیکن اہل حق نے اپنی ذہانت وذکاوت اور وقت پڑنے پر اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرکے اہل باطل کی سازشوں کو ناکام بنایا ہے شاعر کہتا ہے مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاتھ دشمن کے خوف سے مرتعش ہیں لبوں پر خاموشی کا صحرائے بے کنار اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ رہا ہے جو تمہاری بے بسی اور لاچارگی کا مظہر ہے۔ شاید تم اپنے اجداد کے کارناموں سے بے خبر ہو، اگر تم حسینؑ کے سچے وارث ہو تو شہادت کو گلے لگانے سے دریغ نہ کرو۔ کیونکہ حسینؑ کے وارثوں نے ہمیشہ شہادت کو سعادت سمجھا ہے اور مصاف نینوا میں شہادت کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا جس کی روشن ترین مثال ارض کربلا ہے جہاں حسینؑ اور ان کے وارثوں نے موت کو قبول کیا مگر باطل قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ لہٰذا اگر تم بھی حسینؑ کے سچے وارث

ہوتو باطل قوتوں کے مقابل سینہ سپر ہوجاؤ، اس نظم کے آخری دومصروعوں میں شہر یار نے ہلکا سا طنز بھی کیاہے۔طنز کی آمیزش نے نظم کو ایک نیا رخ دے دیاہے:

حسینؑ ابن علی کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

یعنی جوحسینؑ کے واقعی وارث تھے وہ تو معرکہ کربلا میں شہید ہوگئے اب فقط وراثت کے دعویدار باقی ہیں اور اگر یہ مدعیان وراثت حسینؑ کے سچے وارث ہوتے تو کربلائے عصر میں باطل قوتوں سے معرکہ آرا ہوتے مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت ومزاحمت ختم ہوچکی ہے اور وہ بھی ایسے دور میں جب باطل سے برسرپیکار رہنے کی زیادہ ضرورت ہے اگر یہ حسین ابن علیؑ کی عظیم قربانیوں سے واقف ہوتے توکبھی عصر حاضر کے یزیدوں سے خوف زدہ ہوکر ان کے آستانوں پرسربہ سجود نہ ہوتے بلکہ انکار بیعت کے بعد پرچم حق کی سربلندی کے خواہاں ہوتے اور نشان باطل کومحو کرنے کی کوشش کرتے بالفرض کسی وجہہ سے ایسا کرنے میں ناکام بھی ہوتے توحسین ابن علیؑ کے وارثوں کی طرح بخوشی شہادت کو اختیار کرلیتے۔اس نظم میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ روشن ضمیری اور بلندیٔ کردار ہی انسان کا اصل جوہر ہے۔

کربلا اور اس کے تعلیقات کا استعمال جس طرح شہر یار کی نظموں میں ہواہے اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی یہ تعلیقات موجود ہیں بلکہ میرا خیال ہے نظموں سے زیادہ ان کی غزلوں میں واقعۂ کربلا کے معنوی امکانات روشن ہوئے ہیں۔آیئے، دیکھیں کہ شہر یار کی غزلوں میں یہ علامتیں کن معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں ضرورت پڑنے پر ہم بعض اشعار کا تجزیہ کرکے اُن کے مفاہیم کو دریافت کریں گے یہاں اِس قبیل کےصرف چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں:

حسین ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

***

گذرے تھے حسین ابن علیؑ رات اِدھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھرسے

***

آتی کسی کو راس شہادت حسینؑ کی
دنیا میں ہم کسی کو تو سیراب دیکھتے

***

ہر سمت خموشی ہے رات کالی ہے
نہ جانے کون سے افتاد پڑنے والی ہے

***

شاخِ شجر سے پتے گرے جب بھی ٹوٹ کے
روئی تمام خلقِ خدا پھوٹ پھوٹ کے

***

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

***

اہل وفا کو شوقِ شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

***

دریا کے پاس دیکھو کب سے کھڑا ہواہے
یہ کون تشنہ لب ہے پانی سے ڈر رہاہے

***

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تیری روانی کو

غزل کے ان شعروں میں بھی شہریار کی بعض مخصوص علامتیں گھر، رات، اشک، ہوا، دریا، پانی، پیاس وغیرہ موجودہیں لیکن یہاں یہ علامتیں مختلف النوع تہہ دار اور کثیرالجہات معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں۔ شہریار نے معاصر عہد کی صورت حال کو ان علامتوں کے توسط سے بڑی خوش اسلوبی سے نمایاں کیاہے آیئے! ان علامتوں کی تفہیم کیلئے کچھ شعروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں:

حسین ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

یہ شعر بظاہر بہت سادہ سا شعر ہے اور مفہوم بھی بالکل واضح ہے مگر اس میں گہری معنویت موجود ہے اس شعر میں حسین ابن علیؑ 'حق' کا استعارہ ہیں اور کربلا 'صراط حق' کی علامت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ موجودہ عہد میں اہل حق صراط حق پر گامزن ہیں مگر باطل پرست قوتیں ان کی راہ میں مزاحم ہورہی ہیں اور اہل ایمان حق و باطل کی اس مزاحمت میں کوئی کردار ادا کرنے کے بجائے اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر اہل حق کی شکست کے منتظر ہیں اسی مفہوم کو شہریار نے دوسرے شعر میں اور بہتر انداز میں اس طرح ادا کیا ہے:

گذرے تھے حسین ابن علی رات اِدھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

آپ نے دیکھا محولہ دونوں شعروں میں قریب قریب ایک ہی مفہوم ہے لیکن دونوں شعروں کے لہجے مختلف ہیں۔ پہلے شعر کا لہجہ بیانیہ ہے اور دوسرے کا استعجابیہ، اس شعر میں شاعر تحیر کے عالم میں مبتلا ہے کہ ہم پر صہیونی طاقتوں کا خوف اس قدر غالب آچکا ہے کہ اب ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اہل حق کی معیت ومعاونت ہمارا اسلامی اور انسانی فریضہ ہے ہم حق پرستوں کو دیکھ کر ان کی صفوں میں شامل ہونے کے بجائے ان سے نگاہیں چرارہے ہیں۔ اس شعر میں 'کوئی بھی نکلا نہیں' کا فقرہ اہل حق کے فقدان کی غمازی کررہا ہے:

شاخ شجر سے پتے گرے جب بھی ٹوٹ کے
روئی تمام خلقِ خدا پھوٹ پھوٹ کے

اس شعر میں شہریار نے 'شاخ شجر' کو استعاراتی سطح پر برتا ہے 'شجر' اور 'شاخ شجر' کا استعمال مختلف معانی ومفاہیم کی ترجمانی کیلئے بیشتر جدید شاعروں نے کیا ہے۔ خصوصاً عرفان صدیقی، افتخار عارف اور بانی کے یہاں اس کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔ عرفان صدیقی کا مشہور شعر ہے:

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرند ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

شہریار نے 'شاخِ شجر' کو ایک نئے سیاق وسباق میں پیش کیا ہے اس شعر میں 'شاخِ شجر' امام حسینؑ ہیں اور 'شجر' رسول خداؐ ہیں اور 'پتے' امام حسین کے اعوان وانصار ہیں 'خلق' سے مراد کوفہ وشام کی خلقت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ جب امام حسینؑ کے اصحاب ان سے جدا ہورہے تھے تو تمام

خلقِ خدا مفارقت کے اس دل خراش منظر کو دیکھ کر گریہ کناں تھی، ہر چند کہ جیش حریفاں پر طمع دنیا غالب تھی مگر وہ بھی عالم تنہائی میں امام حسین کی مظلومیت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اس شعر میں ایک مفہوم یہ بھی پنہاں ہے کہ جب انسان حرص و ہوس میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اس کی نگاہوں پر پردے پڑجاتے ہیں اور وہ حق وباطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے:

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

اس شعر کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ مظلوم کی آنکھوں کا بھرم اس کے آنسوؤں کے قطرے سے قائم ہے اس کے 'کاسۂ چشم' میں صرف اشکوں ہی کی دولت ہے اگر وہ بھی اس کے پاس نہ رہے تو وہ تہی چشم ہوجائے گا اس لئے وہ اُس کے تحفظ کی ہرامکانی کوشش کررہاہے کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ کہیں اہل تخریب اُس کی اِس دولت کو بھی اُس سے چھین نہ لیں۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حسین ابن علی کی شہادت کے بعد ان کے فرزند علی ابن الحسین جنہیں زین العابدین بھی کہاجاتا ہے شہادت حسین کے بعد ۳۵ برس تک واقعۂ کربلا کو یاد کرکے اشک افشانی کرتے رہے شہادت حسین کے ایک عرصہ بعد جب یزیدبن معاویہ نے انہیں قید سے رہا کیا تو حکومت کی طرف سے ان کی تقریر پر پابندی عائد کردی گئی۔ ایسی صورت میں علی ابن الحسینؑ کی سب سے بڑی طاقت اور دولت ان کے آنسوؤں ہی تھے وہ نماز کے بعد دعائیں پڑھتے اور گریہ وزاری کرتے نیز اسی گریہ وزاری کے دوران دعاؤں کے ذریعے اپنے چاہنے والوں تک اپنا پیغام پہنچاتے۔ وہ دعائیں آج بھی ''صحیفۂ کاملہ'' کی صورت میں ساری دنیا کے انسانوں کیلئے مشعل راہ ہیں۔ اس مفہوم کو افتخار عارف نے اپنے ایک شعر میں اس طرح ادا کیاہے:

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

طوالت کے خوف سے ہم مزید اشعار کی شرح وتعبیر سے گریز کرتے ہوئے اس سلسلہ کا آخری شعر پیش کررہے ہیں:

اہل وفا کو شوقِ شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل وفا (حق پرستوں) کو شوق شہادت آج بھی ہے لیکن باطل قوتوں کے ہاتھ میں خنجر (آلۂ ظلم) نہیں ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے تخریب کار ہمارے چہار جانب خنجر بکف موجود ہیں مجھے اس شعر کو پڑھتے وقت انیس اشفاق کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو باعتبار مفہوم شہر یار کے شعر کے علی الرغم ہے:

جب بھی گھر سے نکلوں سب کے ہاتھ میں خنجر دیکھوں
کب تک اپنی آنکھوں سے میں لہو کا منظر دیکھوں

شہر یار کے شعر کا جو مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ اہل وفا (حق پرستوں) کو ہر عہد میں شوقِ شہادت رہا ہے مگر اس کوفۂ نفاق میں اہل وفا ہیں کہاں؟ اور اگر ہیں بھی تو شہادت حسینؑ نے ظالموں کے حوصلوں کو اتنا پست کر دیا ہے کہ اب حق پرستوں پر خنجر چلانے کی ان میں ہمت نہیں ہے جس کی وجہ سے جذبۂ شہادت رکھنے والے اہل وفا تو ہیں مگر ان پر خنجر چلانے والے نہیں ہیں اور اگر اہل باطل خنجر بدست نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان اہل حق موجود نہیں ہیں۔ اس شعر میں یہ مفہوم بھی پوشیدہ ہے کہ ظلم کی بالادستی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی اس طرح بظاہر اس سادہ مفہوم کے حامل شعر میں کئی طرح کے مفاہیم موجود ہیں۔

شہر یار کے محولہ اشعار کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کو ہمارے عہد کے مسائل کی ترجمانی کیلئے مؤثر ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کیا ہے اور بقدر امکان اس کے معنوی امکانات کو روشن کیا ہے نیز انہوں نے واقعۂ کربلا کی کثیر الجہات وکثیر الابعاد علامتوں کو اپنی نظموں اور غزلوں میں ان کی معنوی قوت کے ساتھ بروئے کار لاکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہیں نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

کتابیات:

۱۔ شہر یار: ساتواں در۔ شب خون کتاب گھر‘ الہ آباد۔ ۱۹۶۹
۲۔ شہر یار: ہجر کے موسم۔ ترقی اردو (ہند) دہلی۔ ۱۹۷۸
۳۔ شہر یار: خواب کا در بند ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۸۵